

نوائین کے لیے ماہنامہ سحر افغانی ایڈ

# پچل

PDFBOOKSFREE.PK

Scan

aanchal.com.pk  
info@aanchal.com.pk

رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی  
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر  
رکن چیف میڈیا آف کامرس

# آبِ حیات

جلد نمبر 33  
شمارہ نمبر 04  
جولائی 2011

پاکستان (فی پرچہ) ..... 45 روپے

پاکستان (سالانہ) ..... 600 روپے

**انتباہ:** آنچل میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نثر ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کیلئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح استعمال سے پہلے ناشر کی تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔  
قلم استبدادات تک۔ نئی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ادارہ کسی بھی طرح ذمہ دار نہ ہوگا۔

**NAEYEEAAE**  
PUBLICATION

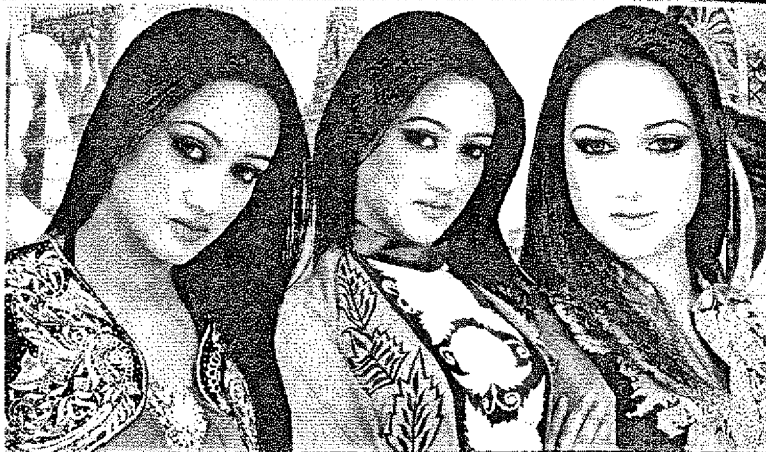
بانی: **ذیب الدین**  
مدیر: **مستحسنت آزاد**  
مدیر اسٹیبلشمنٹ: **مستحق احمد شعی**  
مدیر خیراتی: **طاہر احمد شعی**



اشتہارات اور دیگر معلومات

0300-8264242



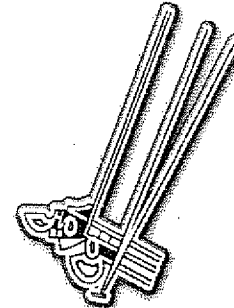


سرواق جویریہ... آراش: ماہ روز بیونی پارلر... عکاسی: محمد ناصر

### مستقل سلسلے

- 233 جوانی مسائل کا حل حافظ شبیر احمد 214 یادگار لمحے جویریہ طاہر  
237 آپ کی شخصیت اے ایس صدیقی 217 آئینہ شہلا عامر  
244 آپ کی صحت ہومیو پتھیا شہناز 219 دوست کا بیخاگئے ہما احمد  
250 دُش مقابلہ طلعت آفتاب 223 آپ کی پسند زہرا حبیب  
252 بیونی گائیڈ روین احمد 226 ہم سے پوچھئے شامک کاشف  
255 غریب نظمیں ایمان وقار 228 کام کی باتیں حنا احمد  
257 بیاض دل میمونہ تاج 231 تندرستی نعمت لباہ احمد

خط و کتابت: کاتبہ تابانہ شکیل پوسٹ بکس نمبر 75 لاہور 74400 فون نمبر 021-356203771/2  
فیس 021-356203773 ایکڑ مطبوعات نے افق پبلیکیشنز سے میل info@aanchal.com.ph



### مسل لائل

32 تم سے ملنے کے بعد تہینہ وسیم

### نائل

96 جھگڑے دیپ سارے ایم جے صدا

### نائل

156 گہرے ہونے تک عائشہ خان

### نائل

148 زہرت جیس خیاہ

172 عشاق اور سرور

200 محبت ابر کی صورت غزالہ عزیز

### استدائیب

10 سرگوشیاں میرا علی  
11 حمد و نعت عمیس احمد  
12 درجہ اول ادارہ

### راشش کردہ

16 شیطان کی حقیقت قرآن کی روشنی میں مشتاق احمد قریشی

### ہمارا آپس

20 سایہ وحید / صدف سلیمان ملیح احمد

### سرف

24 آسچل کے ہمراہ ادارہ

### سلسلہ نائل

72 بھگی پلکوں پر افر صغیر احمد

120 اور کچھ خواب عشاق اور سرور

180 پتھروں کی پلکوں کی نالی کوئی نالی

پبلشر مشتاق احمد پرنٹرز جمیل سن مطبوعہ ابن سن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی  
دفتر کتابت 7 سیریز جمہوریت عبد اللہ ہارون روڈ کراچی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان سلامت رہیں اور مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جان و مال کے بارے میں اس میں ہوں اور نجا بدوہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرے اور مہاجر وہ ہے جو نافرمانی کی راہ ترک کر دے۔“ (مشکوٰۃ)

## سرگوشیاں

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ  
جولائی ۲۰۱۱ء کا پچھلے مہینے مطالعہ ہے۔

کافی دیر سے کوشش کر رہا ہوں کہ میں آپ سے باتیں کرنے کے لیے قلم اٹھاؤں لیکن دل کی دھڑکن کسی طرح قابو نہیں آ رہی تھی۔ ابھی کچھ ہی دیر قبل اخبار کچھ کر ایک طرف رکھا ہے۔ طبیعت اب اخبار کو دیکھنے کی حد تک محدود ہو گئی ہے۔ پڑھنے کی ذہنیت مشکل ہی نظر آ رہی ہے۔ یوں تو پورے وطن عزیز میں ہی آگ و خون کی ہولی مٹی جا رہی ہے لیکن خصوصاً کراچی جو اپنی آبادی کے استزاج کے باعث مٹی پاکستان کی حیثیت اختیار کر چکا ہے ہر روز آٹھ دس اور بھی مٹی تو پڑھیں انفریکشن، پھل، بناوٹیاں، کراچی برقیہ کرنے والے دہشت گردوں کا معمول بن گیا ہے کہ کون کس کو اور کیوں مار رہا ہے اس کی کسی بھی سمرنے والے کو فطری خبر نہیں ہوتی وہ غریب تو صرف اس لیے مارا جا رہا ہے کہ اس کی موت اُسے پہنچ کر ناکل کے نشانے پر لے آتی ہے۔ شاید خود قاتل دہشت گرد کو بھی یہ پتا نہ ہوتا ہو کہ کس کو کیوں مار کر رہا ہے۔ بس اس کے نشانے پر چوکی آ جائے اُسے تو اپنے جنوں کو سر کرنا ہے۔ کچھ دانش ور دوں کا کہنا ہے کہ یہ کراچی پراقتدار کے حصول کی جنگ ہے جس جماعت کو پہلے ہی عوامی خواہش کے مطابق کراچی میں اکثریت حاصل ہے اسے بدل ڈالنے اور انہیں پیچھے ہٹا کر پار سے لگانے کی صاحب اقتدار اور ان کے حواری کوشش کر رہے ہیں۔ جبکہ شاید ایسا ممکن نہ ہو عوام کی حمایت اور دل جیتنا شرط ہے۔ سہاگن سے وہی جس کو پیا چاہیے۔ عوام نے جن افراد جس جماعت پر اعتماد کا اظہار کیا جسے یہ ملک سونپا دیا ہے سہاگن ہے۔ اللہ پاکستان کی اور اہل پاکستان کی اور خصوصاً ہم کراچی والوں کی حفاظت فرمائے دہشت گرد کی اور فوجی بری سے نجات عطا فرمائے کراچی والوں کو اپنی خصوصی بنا فقیہ فرمائے آمین۔

بہت کوشش کی کہ کراچی کے موجودہ حالات سے ہٹ کر بہنوں سے اپنی آپ کے اس ماہنامہ کی کچھ باتیں کر سکیں ان شاء اللہ پھر کبھی کسی آپ سے اس ماہ کے پچھلے کا تعارف کرائیں۔

تاریخیں کرام! تبرکات شامہ عید گزرتی ہو گا اس کے لیے اپنی اپنی نگارشات 15 جولائی تک ارسال کر دیں۔

## اس ماہ کے ستارے

ہم سب سے اعلیٰ کے بعد  
ہم سب سے گندے دیپ سارے  
ہم سب سے کچی کہاں بیمار  
ہم سب سے چاندنی ہے  
ہم سب سے محبت امر کی صورت  
اگلے ماہ تک کے لیے اللہ حافظ۔

نہجہ و سیم پہلی بار بہت خوب صورت مکمل ناول لے کر حاضر ہیں۔  
ایم جے صدیقی نے دیپ کے سانسے سنار دی ہیں۔  
نرہست جنیں ضیاء اپنے مخصوص انداز کے ساتھ حاضر ہیں۔  
سہاس گل محبت کی چاندنی بکھر رہی ہیں۔  
غزالہ عزیز کا خوب صورت انداز لکھنے کے لیے افسانہ۔

دعا گو مشتاق احمد قریشی

# حد

تیرے ہی جلوں کا آساں پہ ظہور ہے  
تیری ہی عبادتوں میں دنیا منحور ہے  
شہدِ رگ سے میری تو کون سا دور ہے  
پھر بھی ہوں تجھ سے غافل یہ میرا تصور ہے  
یہ جان کر بھی کہ دل میں تیرا ہی نور ہے  
پھر بھی یہ کیوں گلہ ہے کہ روشنی دور ہے  
میں نافرماں بھی ہوں تیری رحمتوں کا طالب  
کیسی ہے میری عاجزی یہ کیسا غرور ہے  
اے پروردگار تو بہت رحیم و غفور ہے  
عمیس جو ہے تیرا بندہ بڑا بے حضور ہے

(عمیس احمد..... جھنگ صدر)

# نور

اے نور سراپا اے نورِ دوام  
سب سے عالی ہے تیرا مقام  
تجھ پہ خدا کا درود و سلام  
اے پیرانِ بیہ کیا تیری نظیر  
تو ہے سارے انبیاء کا امام  
تجھ پہ خدا کا درود و سلام  
ہے تیری تصویرِ قرآن کی تفسیر  
جاری ہے تیرا فیض عام  
تجھ پہ خدا کا درود و سلام  
ہے گھر گھر تشہیرِ خلق ہے دامن گیر  
ہر مومن ہے تیرا غلام  
تجھ پہ خدا کا درود و سلام  
بن گئی تیری خاکِ قدم اکسیر  
ہے اس میں کس کو کلام  
تجھ پہ خدا کا درود و سلام



عائشہ خان..... لاہور

عائشہ سلامت رہے۔ آپ نے صحیح اندازہ لگایا ہے کہ آج کل ہماری قوم پر کچھ زیادہ ہی مایوسی سوار ہوئی جا رہی ہے جبکہ مایوسی کفر ہے پتا نہیں کیوں ہم لوگ اتنی جلدی مایوس ہو کر اپنے رب کو بھول جاتے ہیں اور حد سے گزرا جاتے ہیں۔ جبکہ ایسے موقع پر تو ہم کو اپنے رب سے توبہ و استغفار زیادہ سے زیادہ کر کے اسے راضی کرنے کی فکر کرنی چاہیے جبکہ ہم نے اپنی یہ عادت بنائی ہے کہ اپنے سے اوپر والے کو دیکھ کر مایوس ہونا۔ رب کریم کا حکم ہے کہ اپنے سے نیچے والوں کو دیکھ کر شکر گزار بنوں جو ہم بھول گئے ہیں اور جو رب نے ہم کو اپنی بے تحاشہ نعمتیں عطا کی ہوئی ہیں ان کو بھول کر اس سے شکوہ کنناں ہوتے رہتے ہیں۔ ہم کو ہر حال میں شکر ادا کرنے والا ہونا چاہیے۔ بس دعا کی جاسکتی ہیں کیونکہ آج کل جو کچھ ہمارے پیارے ملک میں ہو رہا ہے اس پر گہری نظر ڈالی جائے تو اندازہ بھی ہوتا ہے کہ یہ سب ہماری بد اعمالیوں کا نتیجہ ہے اور کچھ نہیں اللہ سبحانہ عالی سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو معاف فرما کر درگزر والا معاملہ فرمائے اور ہم کو ان حالات سے نجات عطا فرمائے آمین۔ دعاؤں کے لئے اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔

ناسیکہ اشفاق..... کوٹ غلام محمد۔

ناسیکہ! جیتی رہو۔ ارے..... اتنا

غصہ اور جھنجھلاہٹ اچھی نہیں ہوتی۔ ہماری مکمل کوشش ہوئی ہے کہ آپ کی تمام پیاری پیاری قارئین کی شمولیت آپ کی سلسلوں میں ہو۔ یہ سلسلے آپ سب ہی کے لیے تو ہیں۔ آپ یقین کریں کہ آپ کی نگارشات ہمیں موصول ہی نہیں ہوتی ہیں۔ لہذا دوبارہ بھیج دیجئے، مگر باری کا انتظار آپ کو کرنا پڑے گا۔ تمام سلسلوں میں شرکت کے لیے ایک کثیر ڈاک موصول ہوئی ہے۔ جس کی نمبر شمار کے حساب سے ہی اشاعت ممکن ہے اب تو خوش ہیں نا کہ آپ کے خط کا جواب ہم نے دے دیا۔ آپ نے جو دعائیں دی ہیں اس کے لیے رب کریم آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔

شگفتہ کوثر..... خیر پور نایابوالی۔

شگفتہ خوش رہو۔ لیجئے بھی ہم نے آپ کے شہر کا نام آپ کی منشاء کے مطابق صحیح کر دیا ہے امید ہے کہ اب آپ کا گلہ اور آپ کی دوستوں بہنوں کا شک دور ہو گیا ہوگا۔ آپ کا ناول مل گیا ہے ابھی پڑھا نہیں۔ نئی مصنفات پہلے افسانوں پر طبع آزمائی کریں تو زیادہ بہتر رہتا ہے۔ طویل تحاریر رد کرتے ہوئے خود ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ اس میں لکھاری کی زیادہ محنت صرف ہوتی ہے۔ مگر بار رکھیے۔

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں تو کوشش جاری رکھنی چاہیے اور مایوس ہرگز ہرگز نہ ہوں۔ انسان کو اپنی محنت کا صلہ مل کر رہتا ہے۔ دعاؤں کے لیے جزاک اللہ۔

عائشہ سلیم..... فیصل آباد

عائشہ دعائیں۔ افسانہ نگاری ایک فن ہے۔ بھرپور مطالعہ و مشاہدہ کے علاوہ عرق ریزی و محنت

اس فن کو نکھارتی اور جلا دیتی ہے۔ آپ کے خط سے آپ کے شوق کا اندازہ ہوتا ہے لیکن آپ کو اس فن کی مہارت کے لیے بہت زیادہ مطالعہ کی ضرورت ہے۔ افسانہ نگاری کے لیے بہت زیادہ نہیں تو مناسب تعلیم تو درکار ہوتی ہے۔ آپ کی انتہائی محبت پر خط کا جواب دیا جا رہا ہے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ اچھی کتابیں پڑھیں اور بہترین انتخاب کے ساتھ آپ کی سلسلوں میں شرکت کریں۔ لیکن جلد بازی سے کام نہ لیجئے گا۔ ہر سلسلے کے لیے باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ مریم منور گل..... سمندری۔

پیاری مریم! ہمیشہ ہنسی مسکراتی رہو۔ آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ ہم آپ کا خط بٹا دے رہے ہیں؟ تو کمری میں ڈال دیں گے؟ آپ سب بہنیں ہمیں دل سے عزیز ہیں۔ خطوط کے صفحات حمد و ہوتے ہیں۔ اس لیے جواب طلب خطوط خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن ہم موصول ہونے والا ہر خط انتہائی توجہ سے ناصرف پڑھتے ہیں بلکہ آپ سب کے خلوص کے دل سے قدردان بھی ہیں۔ آپ کی سب کے توسط سے ہمارا اور آپ کا رشتہ اٹوٹ سے پھر بھی آپ دل سے جو بھی رشتہ بنانا چاہے بنا سکتی ہیں ہم کو وہ قبول ہوگا اور ایک اہم بات کہ آپ کے اسلوب میں لفظوں کا چناؤ ربط اور تسلسل لائق تحسین ہے۔ یقیناً اگر آپ کوشش کریں تو بہترین تحریر تخلیق کر سکتی ہیں۔ نجم انجم..... کراچی۔

عزیزی۔ شاد آباد رہا۔ آپ کا نام آپ کی سب صفحات کے لیے نیا نہیں ہے۔ آپ کی تواتر کے ساتھ آمد آپ کی محبت و خلوص کی غماز ہے۔ آپ کے بیٹے کی بیماری کے بارے میں

جان کر تشویش ہوئی۔ اللہ تعالیٰ صاحبزادے کو صحت کاملہ عطا فرمائے آمین۔ آپ کی گزارش پر تمام قارئین بہنوں سے بھی خاص الخاص دعا کی درخواست ان سطور کے ذریعے کی جا رہی ہے۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

تحسین انجم انصاری..... اسلام آباد۔ تحسین سلامت رہے۔ آپ کا نام آپ کی سب صفحات کے لیے نیا نہیں ہے اور آپ کی تحریر کی تعریف سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ بلاشبہ آپ اچھا لکھنے والوں میں سے ہیں۔ آپ کی سلسلوں کی پسندیدگی کا شکریہ۔ تجاویز نوٹ کر لی گئی ہیں۔ آپ کا افسانہ مل گیا ہے۔ باری آنے پر شائع کر دیا جائے گا۔ دعاؤں کے لیے اللہ سبحانہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔

اناشاہ زاد..... گجرات۔ انا سدا خوش رہو۔ شادی کی بے حد مبارک باد۔ رب کریم آپ کو کامیابی و کامرانی کے ساتھ نئی زندگی کی شروعات کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ آپ کی گزارش پر یہ اطلاع تمام بہنوں تک پہنچائی جا رہی ہے کہ اب انا احب (فیصل آباد) اناشاہ زاد (گجرات) ہو گئی ہیں۔ دعاؤں کے لیے جزاک اللہ۔ عشرت گوندل..... منڈی بہاؤ الدین۔

عزیزی سلامت رہو۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ ماشا اللہ بی اے کا امتحان دے چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی عطا فرمائے آمین۔ آپ نے خود بتایا کہ ناول ادھورا ہے۔ تو آپ ہی بتائیں ادھورا ناول شائع کرنا کیسے ممکن ہے۔ آپ ضرور لکھیں لیکن پہلے افسانوں پر طبع

آزمائی کریں۔ اچھی تحریروں کے ہم منتظر رہتے ہیں۔ اور ایک تحریر رد ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ آئندہ نہ لکھیں یا پھر کوئی تحریر شائع نہیں ہو سکے گی۔ کوشش جاری رکھو۔ ان شاء اللہ کامیابی آپ کا نصیب بنے گی۔ دعاؤں کے لیے جزاک اللہ۔

منیرہ عبدالنبی بروہی..... کراچی۔

منیرہ شاد آباد رہو۔ جان کر خوش ہوئی کہ آپ آنچل کی پرانی مگر خاموش قاری ہیں۔ لیکن تعلیم پر توجہ رکھنی بھی ضروری ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے آپ کی تحریر میں لاتعداد املا کی غلطیاں ہیں تاہم تحریر میں پختگی بہت ہے۔ ان شاء اللہ باری آنے پر شائع ہو جائے گی۔ جب آپ کی کہانی شائع ہو جائے تو اس کو بغور پڑھئے گا تا کہ آپ کو اندازہ ہو سکے آپ کی غلطیوں کا۔ امید ہے کہ غلطیوں کی درستگی سے آپ کو بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا اور آپ ان غلطیوں نہ دہرائیں گی۔ فکری تعاون برقرار رکھنا۔

افراء تاج..... گاؤں بکوالہ۔ جہلم۔

افراء۔ خوش رہو۔ آپ کی کہانی مل گئی ہے۔ ابھی پڑھی نہیں گئی۔ پڑھنے کے بعد اس کے بارے میں رائے دے سکیں گے۔ گزشتہ افسانہ کے لیے معذرت۔ آپ کے قلم میں روانی اور بہتری ہے امید ہے کہ آگے چل کر بہت کامیابیاں حاصل کریں گی۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

ڈاکٹر تنویر انور خان..... کراچی۔

عزیزی خوش رہئے۔ آپ جیسے دیرینہ و مشاق مصنفین کا فکری تعاون ہمارے سفر کو بہل بناتا ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کا مزاج تو اتار سے لکھنے کی جانب مائل ہے۔ ناول مل گیا ہے۔ ابھی پڑھا نہیں گیا۔ ان شاء اللہ پرچے سے فارغ ہو کر

پڑھیں گے۔ دعاؤں کے لیے رب کریم آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

پلو شہ عروج..... مقام نامعلوم۔

پلو شہ جیتی رہو۔ آنچل میں خط لکھنے کے لیے گھبراہٹ کیسی؟ آنچل آپ کا اپنا ہے۔ ہمارے دل کے دروازے تمام قارئین کے لیے کھلے ہیں۔ خواہ وہ پرانے ہوں کہ نئے۔ آپ کو لکھنے کے لیے ابھی بہت محنت کی ضرورت ہے۔ مطالعہ وسیع رکھیں اور پہلے افسانے پر طبع آزمائی کریں۔ افسانہ کے لیے معذرت امید ہے کہ اچھی تحریر کے ساتھ جلد حاضری دیں گی۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

نوزیہ سعید سردار..... ملتان۔

نوزیہ دعا۔ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ آپ دینی رسائل میں مصروف رہی ہیں۔ آپ کا اسلوب بہتر ہے۔ مگر کچھ محنت کی ضرورت بھی ہے۔ مطالعہ وسیع رکھیں۔ ماہ اگست کے لیے آپ کی کہانی منتخب کر لی گئی ہے۔ مگر کہانی کی درستگی پر غور کرنے سے آپ کو بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔

شہناز راجپوت..... گوجرانوالہ۔

شہناز سلامت رہو۔ آپ کا ناول مل بھی گیا اور منتخب بھی ہو گیا ہے۔ ان شاء اللہ باری آنے پر شامل اشاعت کر لیا جائے گا۔ آپ کا انداز تحریر رواں اور بہترین ہے مگر تحریر کو نکھارنے کی ضرورت ہے۔ بہتر لکھنے کے لیے شرائط کی بھرپور پاسداری کیا کریں۔ یہ ضروری ہوتا ہے۔ امید ہے فکری تعاون برقرار رہے گا۔

انیسہ مجید..... لاہور۔

انیسہ جیتی رہو۔ افسانہ مل گیا۔ انداز تحریر بہتر اور رواں ہے لکھنے میں پختگی بھی ہے مگر افسانہ

اسکرپٹ کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ آپ کو آنچل کے بھرپور مطالعہ سے بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔ امید ہے جلد ہی اپنی نئی اور اچھی تحریر کے ساتھ حاضری دوں گی۔ ہم منتظر ہیں گے۔

شازیہ ذکی عثمانی..... کراچی۔

شازیہ خوش رہو۔ جان کر خوشی ہوئی کہ ماشاء اللہ آپ ادبی گھرانے سے وابستہ ہیں اور والد محترم کا شمار معروف شعراء میں ہوتا ہے۔ افسانہ مل گیا ہے۔ ابھی پڑھا نہیں گیا۔ پڑھنے کے بعد رائے دے دی جائے گی۔

مہوش ملک..... گنگا پور۔

مہوش! جیتی رہو خوش رہو۔ تمہیں کے کسی بھی سلسلے میں شرکت کے لیے اجازت کی ضرورت ہے؟ بس قواعد و ضوابط کی پابندی کیجئے گا۔ نئی کہانی ضرور بھیجیں۔ مناسب ہوئی تو باری آنے پر شائع کر دی جائے گی۔ اللہ آپ کو امتحان میں کامیابی نصیب فرمائے آمین۔

ادراپ کچھ خطوط کے مشترک جوابات۔

سلمیٰ فہیم گل لاہور۔ آپ کی ”ایک اور عنایت“ ہم نے قبول کر لی ہے۔ عنقریب شامل اشاعت کر دی جائے گی۔ ثوبیہ افضل سیالکوٹ۔ آپ اپنے افسانے ”نام و نشان“ کے لیے آفس کے نمبر پر فون کر لیں۔ محمد مہربان، جہلم۔ محترم! ”ہمارا آنچل“ کے سلسلے میں مرد حضرات کے تعارف شامل نہیں کیے جاتے معذرت۔ مقدس ولد دار گوجرانوالہ اور عقیفہ افضل عفی ڈسکہ۔ آپ دونوں نے افسانے کی فوٹو کا پی بھیجی ہے۔ جو قابل قبول نہیں ہوتی معذرت۔ سونیا اللہ رکھا، کوٹ غلام محمد۔ آپ بال پین کا استعمال کریں اور ذرا صاف و خوش خط لکھیں تب ہی آپ کی نگارشات

مستقل سلسلوں کا حصہ بن سکتی ہیں۔ یہ سب تو ضائع ہو گئیں۔ نیر رضوی، کراچی۔ آپ کی شاعری باری آنے پر شائع ہو جائے گی۔ ارم عروج، خوشاب۔ ہم آپ کی گزارش پر ضرور غور کرتے اگر کہانی مکمل ہوئی۔ لہذا معذرت قبول فرمائیں۔

تہینہ وسیم ایم جے صدا مقام نامعلوم برائے مہربانی آپ دونوں دفتر کے نمبرز پر فوری رابطہ کر لیں۔

نا قابل اشاعت۔

دل ایک اتھرا، تم کیسے محبت کرتی ہو آخر تک قسمت کے کھیل چراغ بجھ گئے تیرا سایہ جہاں ہو! پل جسے ہم نے چاہا پیارے رشتے تیرا ساتھ جو مل گیا محبت ایک سچا جذبہ پیار کی رم جہم برستے دو افسانے یہ وطن ہمارا ہے دھنک کے رنگ واہ ری قسمت نازک تلی پاگل۔



مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف خوش خط لکھیں۔ ہاشیہ لگائیں صفحہ کی ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں اور صفحہ نمبر ضرور لکھیں اور اس کی فوٹو کا پی کرا کر اپنے پاس رکھیں۔

☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔

☆ قسط وار ناول لکھنے کے لیے ادارہ سے اجازت حاصل کرنا لازمی ہے۔

☆ اپنی لکھاری ہمیں کوشش کریں پہلے افسانہ لکھیں پھر ناول یا ناولٹ پٹج آزمائی کریں۔

☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اپنا مکمل نام پتا خوش خط تحریر کریں۔

## شیطان کی حقیقت قرآن کی روشنی میں

مولف: مشتاق احمد قریشی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
ابلیس یا شیطان

ابلیس، شیطان ہی کا نام ہے یعنی اس کی شخصیت کا پہلا رخ ابلیس جس کے لغوی معنی مایوسی، ناامیدی کے باعث غمگین ہو کر ششدر و متحیر ہو جانے کے ہیں چونکہ شیطان رحمت حق سے ناامید ہے اس لئے اس کا نام ابلیس ہوا شیطان کی وہ خاصیت یا خصوصیت جس کے سبب انسان میں غصہ، سرکشی، بغاوت، انحراف و اشتعال کی کیفیت پیدا ہوا ایسی وسوسہ اندازی کو شیطان یا شیطانیت کہا گیا ہے۔ جب قانون الہی یا نظام حیات کے قوانین شکنی کے نتائج سامنے آتے ہیں تو انسان میں افسردگی اور مایوسی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں یہ کارنامہ بھی چونکہ شیطان کی وسوسہ اندازی کا ہی ہوتا ہے اس لئے اس کیفیت کو ابلیستیت ہی کہا گیا ہے۔

اصطلاحاً ابلیس اس جن کا نام ہے جس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کر کے آدم اور بنی آدم کے لئے مطیع و مسخر ہونے سے انکار کر دیا اور اللہ سے قیامت تک کے لئے مہلت مانگ لی اللہ تعالیٰ نے اسے نسل انسانی کو بہکانے اور گمراہوں کی طرف راغب کرنے کا موقع دیا اسی کو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے نام سے پکارا ابلیس اور شیطان کسی مجرد (یعنی کسی غیر مادی یا غیر محسوس) قوت کا نام نہیں ہے بلکہ وہ بھی دوسرے جنوں کی طرح ایک صاحب شخصیت ہستی ہے نیز کسی کو یہ غلط فہمی بھی نہیں ہونا چاہئے کہ وہ فرشتوں میں سے تھا۔ اس کی تشریح قرآن نے کی ہے جس کی تفصیل آئندہ باب میں آپ پڑھیں گے کہ وہ جنوں میں سے ہے۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ ابلیس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اللہ نے اس کو ہر بہتری سے مایوس کر دیا ہے، ابن عمرؓ نے کہا کہ ابلیس کا ایک نام قرۃ بھی بیان کیا گیا ہے جبکہ الخطابی کے قول کے مطابق ابلیس کی کنیت ابو بکر دوس ہے اور ”ابو قرۃ“ بھی اور ”ابو مرۃ“ اور ایک اور قول کے مطابق ”ابو مرۃ“ اور ایک اور قول کے مطابق ”ابو لیلیٰ“ بھی بیان کیا گیا ہے۔ (الاتقان جلال الدین سیوطی)

ابلیس کا مادہ بلس اور ابلاس ہے جو کنی معنوں میں استعمال ہوتا ہے حیرت کی وجہ سے دنگ رہ جانا۔ خوف و دہشت کے مارے دم بخود ہو جانا رنج و غم کے مارے دل شکستہ ہونا ہر طرف سے ناامید ہو کر ہمت ہارنا اسی کا ایک پہلو مایوسی و ناامدادی ہے جس کی وجہ سے انسان میں اشتعال برافروختگی پیدا ہوتی ہے اسی وجہ سے شیطان کو ابلیس بھی کہا گیا ہے۔ درحقیقت یاس و ناامدادی کی بنا پر اس کا زخمی تکبر اس قدر مشتعل برا بھیجنے ہوا ہے کہ اب وہ جان کی بازی لگا کر ہر جرم کا ارتکاب کر گزرنے پر تیار ہوا ہے۔ آج اکثر

لوگ اپنی کم عقلی، کم فہمی کی وجہ سے اپنی بات پراڑ جاتے ہیں چاہے وہ کتنی ہی غلط ہو اور بھٹکتے ہیں کہ جو وہ کر رہے ہیں وہ ہی درست ہے۔

ابلیس یا شیطان کو اللہ تعالیٰ نے صرف اس حد تک قدرت دی ہے کہ وہ انسان کو بہکائے اور سبکے والوں کو جو خود اس کی پیروی کرنا چاہیں اپنے پیچھے لگا لے یہ قدرت یا طاقت اسے قطعی نہیں دی گئی کہ کسی انسان کا ارادہ تو اللہ کی فرمانبرداری کرنے کا ہو صراطِ مستقیم پر چلنے کا ہو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع و پیروی کرنے کا ہو اور شیطان زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے نافرمانی کی راہ پر گھنچ لے جائے۔

ابلیس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے وسوسا کے حربے سے انسان کو بہکانے اور اغوا کرنے کی اجازت اس لئے دی کہ نیک، متقی لوگوں، آخرت پر یقین رکھنے والوں اور آخرت پر شک کرنے والوں اور اسے نہ ماننے والوں کے درمیان فرق کھل کر سامنے آ جائے۔

اسے یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے جو اس حقیقت ارشاد باری کو واضح کرتا ہے کہ عقیدہ آخرت کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی نہیں جو انسان کو راہِ راست پر قائم رکھ سکے اور اس کی ضامن ہو اگر کوئی شخص یہ نہ مانتا ہو کہ اسے مر کر دوبارہ اٹھنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے تمام اچھے برے اعمال کا حساب دینا ہے ان کی جواب دہی کرنی ہے تو وہ یقیناً گمراہ و بدراہ ہو کر ہی رہے گا کیونکہ اس طرح اس کے اندر نہ احساس ذمہ داری پیدا ہوگی اور نہ خوف الہی۔

جو لوگ آخرت پر یقین رکھتے ہیں وہ یقیناً اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور ہر برائی، برا کام جس کے کرنے سے روکا گیا ہے اسے نہیں کرتے اس سے رکے رہتے ہیں اور اللہ کی اطاعت و بندگی ویسے ہی کرتے ہیں جیسا کہ حکم ہے جبکہ شیطان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ انسان کو اس کی آخرت سے غافل کر دے اور دنیا کے عارضی مفادات پر آخرت کی زندگی کے دائمی مفادات کو قربان کر دے دنیا میں جو شخص بھی شیطان کے ورغلائے میں آ کر گمراہ ہوا ہے وہ اسی نقطہ، انکار آخرت یا شک فی الآخرة کی وجہ سے ہی ہوا ہے اور جس نے راست روی اختیار کی اس کے صحیح طرز عمل کی بنیاد ہی ایمان بالآخرة ہے۔

قرآنی احکام و آیات کے برخلاف جدید محققین جو قرآن اور آیات قرآنی کی تشریح و تفصیل جدید اور مغربی دانشوروں کی دانش مندی سے مرعوب ہو کر اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتے ہوئے قطعی نہیں ہچکچاتے بلکہ ان جدید نظریات کی بنیاد پر آیات قرآنی کی نفی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

قرآن کریم میں جہاں تخلیق آدم علیہ السلام اور موجود ملائکہ کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے وہیں ابلیس کی سرکشی و تکبر کو بھی کئی جگہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود دور جدید کے جدت پسند محققین کی تحقیق جدید کے مطابق ابلیس یا شیطان انسان سے الگ اس کے خارج میں موجود کوئی الگ ہستی نہیں ہے بلکہ یہ خود انسان کے اندر کی ایک خصلت کا نام ہے ان کے خیال کے مطابق انسان میں تین بنیادی عناصر ہوتے ہیں۔ (۱) جذبات۔ (۲) عقل۔ (۳) انسانی ذات کی خودی۔

دور جدید کے مفکرین و محققین کے مطابق انسان محض اُن طبعی اور دماغی قوتوں کا ہی نام نہیں ہے بلکہ اس کے اندر موجود روح جسے روح الہی کہا گیا ہے بھی ہے جسے انسان کی Egoti یا گو یعنی خودی کہا



گیا ہے جب انسان ”میں“ کہتا ہے تو اس کا مفہوم اس کا طبی بیکر یعنی جسم نہیں ہوتا اس کے ماوراء اس کی خودی اور اس خودی کا استحکام و ارتقاء ہوتا ہے جو شرف انسانیت خودی کے استحکام کے عروج کا تقاضا ہے اس کے مد مقابل جو بھی قوت جس سے اس کا تضاد اور کش مکش ہوتی ہے اسی قوت کا نام ابلیس ہے۔ اس لئے ہی ان کے خیال میں ابلیس انسان سے الگ خارج میں کوئی ہستی نہیں ہے جبکہ انسان کی خصلت ذات یا خودی عقل و جذبات کا نام ہے جس کی تشریح اوپر کی سطور میں آچکی ہے۔

دراصل دور جدید کے یہ تمام مفکرین و مفسرین جو جدید سائنسی اور مغربی افکار سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور قرآنی احکام و آیات کے خلاف اپنی من مانی تشریحات کر کے خود ابلیس کے معاون و مددگار کا کردار ادا کرتے ہیں۔ قرآن حکیم میں خود رب کائنات سورۃ القیامۃ میں نفس کی قسم کھاتا ہے ”ولا اقسام بالنفس اللوامة“ اور نہیں میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی (القیامۃ ۲)۔ یہاں اگر ہم اس بات کو سمجھ لیں کہ انسانی نفس کیا ہے؟ اور یہ نفس لوامہ کیا ہے؟ جس کی قسم اللہ تبارک و تعالیٰ نے کھائی ہے عیوب و توبت سمجھنا آسان ہو جائے گی۔

دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جو اپنے اندر ضمیر نام کی چیز نہ رکھتا ہو۔ اس ضمیر میں اللہ تعالیٰ نے برائی اور بھلائی کی تمیز کرنے کا احساس رکھا ہے۔ انسان چاہے کتنا ہی برا اور گمراہا ہو کیوں نہ ہو اس کا ضمیر اسے برائی کرنے اور بھلائی نہ کرنے پر ضرور ٹوکتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اس نے اپنے لئے بھلائی اور برائی کرنے کا جو بھی معیار مقرر کر رکھا ہو چاہے وہ غلط ہو یا صحیح۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ انسان نرا حیوان نہیں ہے۔ اللہ نے اس میں اخلاقی وجود رکھا ہے اس میں برائی اور بھلائی کی فطری تمیز پائی جاتی ہے وہ خود کو اپنے اچھے برے فعل کا ذمہ دار سمجھتا ہے اور جس برائی کا ارتکاب اس نے دوسرے کے ساتھ کیا ہو اس پر اس نے ضمیر کی ملامت کو اگر دبا بھی دیا ہو مگر جب وہی برائی اگر کوئی دوسرا اس کے اپنے ساتھ کرتا ہے تو اس کا دل اندر سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا اسے بدلہ لینا چاہئے اور زیادتی کرنے والے کو سزا دینی چاہئے۔ یہی اس کا احساس نفس ہے۔ اسی کو انسان کا نفس شیطان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ انسان کے دل میں دوسرا انداز ہی باہر سے صرف شیطاں جن و انس ہی نہیں کرتے بلکہ اندر سے خود انسان کا اپنا نفس بھی کرتا ہے۔ اس کے اپنے غلط نظریات اور قوت ارادی اس کی قوت فیصلہ کو گمراہ کرتی ہے اور اس کی ناجائز اغراض و خواہشات اور اس کے اپنے اندر کا شیطان بھی اسے بہکاتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نفس سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ نفس ہے کیا؟ اور قرآن حکیم میں رب کائنات نے کیا ارشاد فرمایا ہے۔

نفس:۔ نفس کی تشریح اہل لغات کے نزدیک سانس، گھڑی، ساعت اسم مفرود و معرّفہ منسوب جان، مراد شخص، نفس کے معنی جان ہے، لیکن اس سے مراد کبھی تنفس ہوتا ہے۔ نفس کا عمومی استعمال شخص کے لیے ہوتا ہے، قرآن حکیم میں نفس سے جنس اور نوع مراد ہے، اردو لغت کے اعتبار سے، مذکر، جان، روح آیتما، ذات، وجود، ہستی، اصلیت، اصل ہے، ان کی جمع انفاس اور نفوس ہے اور لغوی معنی کسی چیز کے وجود اس کی حقیقت اور ذات کے ہیں جبکہ مختلف معنوں میں روح، مروت اور ضمیر کے ہیں۔ کچھ کے

نزدیک یہ مادی ہے اور کچھ کے نزدیک یہ روحانی ہے۔ نفس اپنے دعویٰ میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی ضد ہوتا ہے کیونکہ اس میں اپنے وجود کا ذکر کرتا ہے اور یہ اپنے مطالبہ میں اللہ تعالیٰ کا ہمسر کہتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ صرف اس کی حمد و ثناء بیان کی جائے اس لیے نفس کو شیطان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نفس میں انا خود پرستی ہوتی ہے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی تعریف و توصیف کی جائے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں نفس کشی کا حکم دیا ہے۔ اصطلاح میں نفس کو مارنا نفس کشی کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف اصطلاحوں میں اسے سانپ کہا گیا جو انسان کے وجود کو ذستار ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح کے لئے دعا فرمائی ہے۔ ”اے حقیقی زندہ اے حقیقی سنبالنے والے۔ میری ہر حالت کو درست کر دیجئے اور مجھے پلک بھینکنے کے وقفے تک بھی میرے نفس کے حوالے نہ کیجئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کا بھلا چاہتا ہے تو اسے عیوب نفس دکھلا دیتا ہے۔ ایک اور مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پاک ہے ”مجاہدہ ہے جس نے اللہ کے لئے اپنے نفس سے جہاد کیا۔“

قرآن حکیم میں نفس کی تین اقسام بیان کی گئی ہیں۔ (۱) نفس لوامہ۔ (۲) نفس امارہ۔ (۳) نفس مطمئنہ۔ یہی تین اقسام کے نفوس زیادہ مشہور ہیں۔ جس طرح انسانوں کو مختلف بنایا ہے ایسے ہی ان کے نفس بھی مختلف ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم میں نفس کی انہی تین اقسام کا خصوصاً ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃ الفتن میں بھی اللہ رب العزت نے نفس انسانی کی قسم کھائی ہے اور خود اپنی ذات عظیم کی اور اسے ہی پاکیزگی اور فلاح پانے کا ذریعہ بھی قرار دیا ہے۔

ترجمہ:۔ قسم سے نفس انسانی کی اور اس ذات کی جس نے اسے ہموار کیا (بنایا) پھر اس کو سمجھ دی بدی کی اور اس سے بچ نکلنے کی جس نے ترکیہ کیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے دبا دیا وہ نامراد و ناکام ہوا۔ (الفتن ۷ تا ۱۰)

سورۃ الفتن کی ابتدائی آیات مبارکہ میں سات چیزوں کی قسم الگ الگ کھائی ہے۔ سورج کی قسم چاند کی قسم دن کی قسم رات کی قسم آسمان کی قسم زمین کی قسم اور سب سے آخر میں انسانی نفس کی قسم کھائی ہے۔ ان سب کا تعلق انسان اور انسانی زندگی سے بہت اہم اور زیادہ ہے۔ یہ تمام چیزیں انسان کی زندگی سے ایسے ہی جڑی ہوئی ہیں جیسے اس کا نفس اس سے جڑا ہے۔

نفس لوامہ۔ یہ انسان کو اس وقت لعنت ملامت کرتا ہے جب اس سے کوئی گناہ کبیرہ یا صغیرہ سرزد ہو جاتا ہے۔ اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں سورۃ الفتنہ کی دوسری آیت میں کیا ہے۔ اسی کو ضمیر بھی کہا جاتا ہے۔

(جاری ہے)



# ساریہ حید

ملیر احمد

سوٹ سے قارئین آنچل! آپ سب کو میرا بھرپور سلام۔ کہتے کیسے مزاج ہیں آپ لوگوں کے؟ یقیناً اتھے ہوں گے پہلی بار کسی رسالے میں لکھنے کی ہمت اور جسارت کر رہی ہوں۔ امید ہے آپ لوگ جگہ دیں گے۔ میرا نام ساریہ حید بخاری ہے۔ سبھی گھر والے خوشی سے، غصے سے اور پیار سے ساریہ ہی کہہ کر بلاتے ہیں۔ میرا کوئی بک نیم نہیں ہے۔ ہاں البتہ کبھی کبھار بھیا لاڈ سے گڑیا کہہ کر بلاتے ہیں جو کہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ پاکستان کے خوب صورت شہر جرات سے تعلق رکھتی ہوں۔ ہم تین بہن بھائی ہیں۔ دو بھائی اور ایک بہن۔ بھائی دونوں ہی مجھ سے بڑے ہیں۔ سب سے بڑے بھیا قاسم جو کہ لی۔ ایس۔ سی فوٹو ایئر کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ انہیں غصہ بہت زیادہ آتا ہے۔ ویسے بہت ذہین اور محنتی ہیں۔ سنجیدگی ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ ان سے چھوٹے عاظم بھائی ہیں۔ جو اپنی دنیا میں مست رہتے ہیں۔ ان کا مزاج بڑے بھیا کے بالکل برعکس ہے۔ وہ بہت نرم مزاج اور بے تکلف ہیں۔ ان سے میری کافی دوستی ہے۔ اگر کچھ منگوانا ہو یا فرمائش کرنی ہو تو بلا جھجک کہہ دیتی ہوں۔ بھیا فوراً پوری کر دیتے ہیں۔ ہمارے درمیان صرف ایک سال کا فاصلہ ہے۔ وہ آئی کام پارٹ ٹو کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ آخر میں، میں یعنی ساریہ حید ایف ایس سی فرسٹ ایئر کی طالبہ ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میں بہت زیادہ پڑھوں اور تعلیم میں اپنا ایک نام ایک مقام بنائوں جو کہ دوسروں کے لیے قابل رشک ہو۔ اس لیے دل لگا کر پڑھتی ہوں اور ہمیشہ پہلی یا دوسری پوزیشن حاصل کرتی ہوں۔

صورتی بہت متاثر کرتی ہے۔ مگر اس کائنات میں بسنے والے لوگوں کے حالات زندگی دیکھ کر بہت دکھ اور رنج ہوتا ہے۔ میرا بس نہیں چلتا کہ سارے لوگوں کے دکھ سمیٹ کر اپنے دامن میں بھر لوں اور اپنے جھے کی تمام خوشیاں ان لوگوں کے نام کر دوں۔ میں چوں کہ حساس طبیعت کی مالک ہوں اس لیے جہاں کہیں بھی ظلم و ستم ہوتا دیکھتی ہوں۔ رونا شروع کر دیتی ہوں۔ اب آتے ہیں اپنی خوبیوں اور خامیوں کی جانب۔ خوبیاں یہ ہیں کہ میں پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ وقت کی بہت پابند ہوں۔ کسی کی دل آزاری نہیں کرتی۔ کسی بھی معاملے میں ضد کبھی نہیں کی۔ خوش اخلاق اور خوش مزاج ہوں۔ خامیوں میں، بہت زیادہ اتار پرست ہوں اور اکثر اس انا کے ہاتھوں کافی نقصان اٹھاتی رہتی ہوں۔ اپنا دکھ کسی سے شیر نہیں کرتی حالانکہ دکھ کہنے سے ہلکا ہو جاتا ہے پھر بھی اپنے مسائل اپنے دکھ کسی سے نہیں کہتی۔ گھر کے کاموں میں بالکل بھی دلچسپی نہیں رکھتی۔ ہر ایک پر بہت جلد اعتبار کرتی ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہر کوئی قابل اعتبار نہیں ہوتا۔ اخلاص بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے۔ یہ تو جس خامیاں۔ اب کچھ پسند و ناپسند کے بارے میں۔ میری پسند میں بہت کچھ شامل ہے۔ سب سے پہلے لباس میں شلوار قمیض پسند ہے۔ جینز وغیرہ پہننے کا شوق بھی رکھتی ہوں مگر چوں کہ سید گھرانے سے تعلق ہے اس لیے اپنی خواہش کی تکمیل ناممکن کی بات لگتی ہے۔ ہماری فیملی بہت مذہبی اور سخت ہے (خصوصاً بڑے بھائی) کھانے میں دال چاول، کرکھی پکڑے اور بھنڈی پسند ہے۔ گلابی، سیاہ اور سفید رنگ پسند ہیں۔ لباس تقریباً ہر رنگ میں بنوا لیتی ہوں۔ مجھے تنہائی سے بہت خوف آتا ہے وہیں پر نشست جمانا پسند کرتی ہوں جہاں پر بہت سارے لوگ موجود ہوں۔ مجھے سردیوں کا موسم بہت متاثر کرتا ہے۔ برقی بارشیں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں اور دھندل کو بھاتی ہے۔ پرفیوٹر وغیرہ زیادہ پسند نہیں ہے۔ کوئی سی بھی خوشبو لگا لیتی ہوں۔ مجھے گھونے پھرنے اور سیر و تفریح کرنے کا بہت شوق ہے۔ (دوستوں کے ساتھ) مگر یہ خواہش حسرت کے سوا کچھ نہیں۔ میری دو سہیلیاں ہیں۔

دونوں بہت اچھی ہیں۔ آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ ساریہ اپنی ذات کے اوپر یہی بات کیے جارہی ہے۔ آپکل کے متعلق کچھ نہیں کہا تو جناب آنچل میری جان ہے۔ آپکل کو پڑھتے ہوئے مجھے نو ماہ کا عرصہ ہو گیا ہے اور اس مختصر عرصہ میں، میں نے آپکل کو اپنے بے حد قریب پایا۔ جب میری دوست نے کہا کہ جب تک رزلٹ نہیں آ جاتا، تم آپکل ڈائجسٹ پڑھو۔ اس میں بہت اچھی اچھی کہانیاں ہیں۔ میں نے آپکل پڑھا اور واقعی اس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میری دوست کے پاس دو سال پرانے آپکل موجود تھے۔ میں نے وہ سارے کے سارے پڑھ ڈالے۔ ہمارے گھر میں امی کے سوا کسی کو بھی معلوم نہیں کہ میں آپکل رسالہ پڑھتی ہوں۔ ”ہمارا آنچل“ میں بہت ساری لڑکیوں کے تعارف پڑھے جیسا کہ مازہ ملک، طاہر ملک، مدیحہ شاہ، ملیزہ اودھی، منک انصاری، نازی، کنول نازی، اناب، ایس۔ بی۔ بی۔ بی۔ بی۔ بی۔ اور خصوصاً شائلہ اکرم جس کے تعارف نے مجھے بہت متاثر کیا۔ شائلہ جی کیا آپ مجھ سے دوستی کرنا پسند کریں گی۔ مجھے آپ کے تعارف نے اتنا متاثر کیا کہ میرا جی دل چاہا کہ اپنا تعارف بھیجوں۔ میں ہر روز آپ کا تعارف پڑھتی ہوں اور بار بار پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ آپ جو کچھ بھی لکھتی ہیں بہت اچھا لکھتی ہیں خصوصاً ”ہم سے پوچھئے“ میں آپ کے سوال بہت مزے کے ہوتے ہیں۔ بے تکلفی لیے۔ پلیز مجھ سے دوستی ضرور کیجیے گا۔ اللہ آپ کو صحت دے۔ (آمین) میں آپکل کی رائٹرز کو زیادہ تو نہیں جانتی پھر بھی یہ کہنا چاہوں گی کہ وہ رائٹرز جن کی کہانیاں مجھے بہت زیادہ پسند آتی ہیں اور میرے دل کو چھو گئیں ان میں سعدیہ ایل کاشف، سمیرا شریف طور اور اقراء صفیر احمد شامل ہیں۔ میرے پسندیدہ ناٹرز میں یہ جانتیں یہ شہدیں، شہر چارہ گراں، محبت جھک نہیں سکتی، تیری جستجو میں کھڑ گئے، جب وہ پتھر موم ہوا اور اسے محبت تیری خاطر شامل ہیں۔ پسندیدہ نمالک میں پاکستان، دینی اور سعودی عرب شامل ہیں۔ میرے دل کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ میں حج کروں اور روضہ رسول ﷺ کی زیارت کروں۔ اللہ کرے سب کی یہ جائز اور نیک تمنا پوری ہو۔ (آمین) میری زندگی

کالج سے گھر اور گھر سے کالج تک محدود ہے۔ کہیں آنا جانا نہیں ہوتا۔ سارا دن پور ہوتی ہوں۔ اس سے پہلے کہ آپ مجھ سے پور ہوئے لگیں۔ میں جلدی جلدی اپنا تعارف ختم کر دوں۔ ہاں لیکن اپنا پیغام دینا چاہتی ہوں۔ وہ یہ کہ پلیز زندگی کی دل سے قدر کریں۔ یہ خدا کا ہم پر دین مانگا احسان ہے اور ایک بہت بڑا تحفہ ہے۔ زندگی سے خوشیاں کشید کریں کہ یہ ہمیں صرف ایک بار ملتی ہے۔ مجھ سے ملاقات کر کے آپ لوگوں کو کیہ سالگا۔ رائے ضرور دیجئے گا۔ اللہ حافظ۔

## صدف سلیمان

السلام علیکم! میرا نام صدف سلیمان ہے۔ ہماری کاست جتن ہے اور میں ضلع جنگ کے شہر شوکت میں رہائش پزیر ہوں۔ عمر میری 19 سال ہے۔ تعلیم جتنی قسمت میں تھی اتنی حاصل کی ہے۔ ہم آٹھ بہن بھائی ہیں جن میں میرا نمبر پانچواں ہے۔ ایک بہن اور دو بھائی مجھ سے چھوٹے ہیں۔ ہم پانچوں بہنیں آپکل شوق سے پڑھتی ہیں۔ دو بہنیں شادی شدہ ہیں۔ بڑی باہمی کی شادی کو چھ سال ہو گئے ہیں۔ ابھی تک ان کی کوئی اولاد نہیں۔ پلیز دعا کیجیے کہ اللہ انہیں اولاد دے۔ چھوٹی باہمی کی ایک بیٹی ہے مریم۔ جس میں ہماری جان ہے۔ رنگوں میں اور رنج رنگ میرا پسندیدہ تا لیکن سیاہ رنگ اب میرا پسندیدہ ہے۔ کھانے میں پھول گوشت بہت زیادہ پسند ہے۔ گھر میں اور کسی کو نہیں پسند اس لیے لڑکر یہ بڑی پکائی ہوں۔ اس کے علاوہ چاول بھی بہت پسند ہیں۔ میٹھے میں گاجر کا حلوہ کسٹرز بغیر کسی میوے کے پسند ہیں۔ پھل سارے ہی کھا لیتی ہوں۔ آم کچے اور پکے اچھے لگتے ہیں۔ مشروب میں بگ اپیل پسند ہے اور چائے تو زندگی ہے۔ تھو دینا اور لینا بہت پسند ہے۔ ڈائری باقاعدگی سے لکھتی ہوں۔ میک اپ میں آئی لائٹر اور جیلری میں سادہ کالج کی چوڑیاں پسند ہیں۔ اداس شاعری کی دیوانی ہوں۔ پسندیدہ شاعر احمد فراز، حسن اور وحی شاہ ہیں۔ اس کے علاوہ نازیہ جی اور پروین شاکر پسند ہیں۔

## میرزا کریم

مدم اور دیکھی گانے اچھے لگتے ہیں۔ اداکاروں میں آفتاب اور ایضا ہائیل، وحید مراد پسند ہیں۔ کپڑوں میں شلوار قمیص پسند ہیں لیکن دوسروں کے ڈریس ہر قسم کے ڈیزائن کر لیتی ہوں۔ جو ڈیزائن ایک بار دیکھ لیتی ہوں وہ بغیر پوچھے بنالیتی ہوں کیوں کہ ڈریس ڈیزائن کرنا کورس کیا ہے۔ پسندیدہ راکٹر میرہ احمد، میرا شریف اور نازہ جی ہیں۔ پسندیدہ ہستی حضور ﷺ کے بعد میری ماں ہیں جو دنیا کی عظیم ماں ہے۔ ہر بات اپنا ماں سے کہہ لیتی ہوں۔ مجھے دوستی کرنے کا بہت شوق ہیں خوب صورت اور خوب سیرت لڑکیوں سے۔ عزیزین، پروین، سبین، شبنم اور حیرا، شبنم میری اچھی دوست ہیں لیکن وہ بہت کم ملتی ہیں۔ اس لیے اب بہترین دوست اللہ کی ذات ہے جس سے ہر بات شیراز لیتی ہوں ہر ایک بات اپنی فرینڈز کے لیے، I miss you so much! سردراتیں، پورا چاند اور تنہائی پسند ہیں۔ اب خوبیاں اور خامیاں بتا دوں؟ خوبیاں تو جاننے والے زیادہ اچھی طرح بتا سکتے ہیں۔ پہلی خوبی تو یہ ہے کہ نماز شروع سے پانچ وقت پڑھتی ہوں۔ جان بوجھ کر کسی قصا نہیں کرتی۔ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ نہ ہی کسی کا دکھ برداشت کر سکتی ہوں حتیٰ کہ کسی اسٹوری یا فلم میں ٹریجڈی سین ہو تو جگہ جگہ میں روتی ہوں۔ جس سے محبت کرنی ہوں اسے بھی دھوکا نہیں دیتی ہمیشہ کوشش کرتی ہوں کہ کسی کو مجھ سے شکایت نہ ہو۔ ہر کسی پر اعتبار جلدی کر لیتی ہوں جس کا بہت بڑا خیمہ بھگت رہی ہوں لیکن آج تک کبھی شکوہ نہیں کیا۔ خانی یہ ہے کہ غصہ بہت جلدی آتا ہے اور غصے میں بہت کچھ بول جاتی ہوں تو بعد میں بہت افسوس ہوتا ہے۔ ایک خانی یہ ہے کہ انسانوں کو پرکھنے کی جس جگہ میں بالکل نہیں ہے جو بیٹھا بول دے وہ اچھا لگتا ہے۔ خواہ وہ اندر سے کتنا ہی کڑوا ہو۔ محبت کے نام پر دھوکہ دینے والے لوگ بالکل پسند نہیں ہیں۔ سوری فرینڈز! اگر کوئی بات بری لگے تو پلیز معاف کر دیجیے گا۔ آخر میں ایک اچھی بات کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔

جو تکلیف دے اسے چھوڑ دو۔ اور جسے چھوڑ دے اسے تکلیف نہ دو۔ فی امان اللہ۔

اھر دیکھیں قارئین! آج آپ کی محفل میں کون آیا ہے؟ ارے اھر نہیں اھر۔ ارے اھر بھی نہیں بلکہ میں سامنے ہوں۔ جی جناب! بالکل اھر ہی۔ پیارے پیارے آنچل فیملی ممبرز! السلام علیکم۔ کیسے ہیں آپ لوگ؟ پہلے آپ لوگ بتائیں کہ آپ کیسے ہیں پھر میں بتاؤں گی کہ میں کیسی ہوں۔ بہت مزے میں ہیں نہ آپ لوگ۔ میں بھی آپ لوگوں کی دعاؤں سے بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ لوگوں کو کیا پتا کہ میں کون ہوں۔ ایویں خوش ہو رہے ہیں۔ اچھا چلاؤ اب میں اپنا تعارف کروا دیتی ہوں۔

نام ہے میرا میرا زکریا۔ ویسے کہنے والے سیرن بھی کہتے ہیں۔ سوچا لکھتے تو اور بھی بہت ہیں ہم کیوں نہیں۔ آنچل سے وابستہ ہوئے زیادہ عرصہ تو نہیں گزر مگر یہ مطالعہ میں ضرور رہتا ہے اور اب ہم نے باقاعدہ شمولیت بھی اختیار کر لی ہے۔ اب جب آنچل میں شمولیت اختیار کر ہی لی ہے تو آپ کو اپنی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں بھی بتا دیں۔ جیسے خوبیاں بہت ہیں ویسے خامیاں بھی بہت ہیں۔ ویسے خامیاں کم ہیں سمجھا کریں (آہم) تعلیمی قابلیت صرف میٹرک ہے۔ اسکول لائف کو بہت انجوائے کیا۔ اسکول کی غیر تصافی سرگرمیوں میں بہت آگے آگے ہوتے تھے۔ خاص کر میں اور میری کزن نبیلہ مجید۔ میں باتونی بہت ہوں۔ بولتی رہوں تو گزرا ہوتا ہے۔ میری شخصیت کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں بے حد حساس ہوں۔ میری باتوں سے تو نہیں لگ رہا ہوگا کہ میں حساس ہوں۔ ناراضگی کسی سے ہو تو غصہ کسی اور بات پر نکال دیتی ہوں پھر تسلی ہوتی ہے۔ کتنی بری بات ہے نا۔ میں پھر بھی یہ عادت نہیں چھوڑتی۔ ویسے تو میں چلتے پھرتے مذاق کرنی رتی ہوں۔ کیا کروں بنے اور ہنسائے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ نہ بھی

ہنساؤں تو کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور نکال جاتی ہے نہ سے کہ اگلا بندہ ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ہے نا کمال کی بات، اگر نہیں لگتی تو آپ لوگ ایسے ہنسا کر دکھاؤ۔ دیکھا کوشش نا کام ہوئی! خبر برانہ مائیں اور کوشش جاری رکھیں۔ مجھے کھانا پکانے کا بے حد شوق ہے۔ میں بہت کچھ پکا لیتی ہوں اور بہت کچھ کھینے کی کوشش میں رہتی ہوں۔ کھانوں میں مجھے پلاؤ بہت پسند ہے اور خاص کر جب میں خود پکاؤں۔ اب کہہ دیں اپنے منہ میں مٹھو۔ آنا آپ لوگ ہماری طرف پھر پکا کر دکھاؤں گی۔ سبزیوں میں مجھے صرف کرلے اور بھنڈی پسند ہے۔ میں دوسروں پر بہت جلد اعتبار کر لیتی ہوں۔ اکثر عورتوں کی رنگ برنگی باتوں سے تو میں نے دھوکا بھی بہت کھایا ہے پھر بھی انسان نہیں بنتی۔ آئس کریم مجھے بہت پسند ہے خاص کر اگر چمن دانوں کی ہو تو بات ہی کیا ہے۔ اگر مجھ سے سو کم کا پوچھیں تو مجھے گرمیوں کا موسم بہت پسند ہے۔ سردیوں میں بس سارا دن کمروں میں ہی بند رہوں۔ مجھے سیاہ اور نیلا رنگ بہت پسند ہے۔ جیولری میں مجھے رنگ اور بریلیٹ بہت پسند ہے اور وہ بھی بس سادہ سے ڈیزائن کے ہوں۔ انگوٹھی مجھے صرف سیاہ رنگ والی پسند ہے جس میں چھوٹا سا نگ ہو۔ ویسے تو آج کل میں نے سیاہ رنگ والی پہنی بھی ہوئی ہے۔ یہ دیکھیں ہوگی تسلی۔ یہ تو مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ دیکھے بغیر کہاں تسلی ہوگی۔ عادت سے جو مجبور ہوئے۔ میری دوستوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہر چھوٹے بڑے سے دوستی کر لیتی ہوں۔ بہت زیادہ باتونی جو ہوں۔ خاص کر میری بہن حیرا سے بہت دوستی ہے۔ میں اس دوستی کا بہت ناچاز فائدہ اٹھاتی ہوں۔ دراصل میں چائے بہت زیادہ پیتی ہوں چٹنی دفعہ مل جائے اتنی دفعہ۔ تو جب میں حیرا کو دو چار باتیں سناتی ہوں تو پھر اس کو کہتی ہوں کہ چلو اب مجھے چائے بنا کر پلاؤ تو بے چاری کو مجبوراً بنانی پڑتی ہے۔ ویسے تو ہم تین بہنیں ہیں۔ بڑی بہن جس کا نام ارم شہزادی ہے۔ وہ بہت کم بولتی ہے لیکن ڈائجسٹ بہت زیادہ پڑھتی ہے۔ اس کے ماشاء اللہ دو بیٹے ہیں۔ چھوٹا

والا عیسو تو بہت ہی پیارا ہے۔ بائیس بہت پیاری کرتا ہے۔ ایک بات بتاؤں آپ لوگوں کو، ویسے بتانی تو پہلے چاہیے تھی لیکن میری مرضی میں جب بتاؤں۔ میں شادی شدہ ہوں۔ میری شادی کو چار سال ہو گئے ہیں۔ میرا ایک بیٹا ہے جو کہ بہت ہی پیارا ہے۔ اس کا نام محمد یحییٰ ہے اور میرے میاں کا نام زکریا ہے۔ ہے نا پیارا۔ میرا بیٹا تین سال کا ہے لیکن بولتا بہت زیادہ ہے۔ بہت آگے کی بات کرتا ہے۔ ابھی بھی وہ میرے پاس بیٹھا ہے اور کہہ رہا ہے کہ ماما مجھے بھی پینل دو میں بھی لکھوں گا۔ بندہ پوچھتے ہیں جب ماں لکھ رہی ہے تو بیٹے کو لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ میرے میاں امیر انیڈری ڈیزائنر ہیں اس لحاظ سے میری تو بڑی موح ہے۔ جتنا آپ لوگ سوچ رہے ہیں۔ اب اتنی بھی نہیں۔ وہ مجھے اپنی فیملی سے الگ انیڈری کیے ہوئے سوٹ لا کر دیتے ہیں۔ پھر ہوئی ناموح۔ ہماری جوائنٹ فیملی ہے۔ بہت مزا آتا ہے خاص کر جب کوئی تہوار ہو۔ ایک اور بات میرے میاں بہت خوب صورت ہیں اور ان کی آواز بھی بہت سربلی ہے۔ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ وہ اکثر گنگنا تے ہیں تو پھر میری ساری توجہ ان کی آواز پر ہوتی ہے۔ ویسے میں کبھی بھی بہت غرور کرنے لگ جاتی ہوں کہ میرے شو بہت اچھے ہیں۔ مجھے مہندی لگوانے کا بہت شوق ہے۔ اچھا کیا خیال ہے اب آپ لوگوں کی جان چھوڑ نہ دی جائے۔ اب آپ لوگوں نے بھی سکھ کا سانس لیا ہوگا۔ ویسے سکھ کا سانس لینا حق بننا بھی ہے۔ چلیں ٹھیک ہے۔ اپنا خیال رکھیے گا اور مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔ اللہ حافظ۔





آنچل لے کر پڑھنے لگی۔ تو اچانک میری امی نے دیکھ لیا اور پھر مجھے بہت ڈانٹ پڑی۔ اس واقعے کے بعد میں جب بھی آنچی کے گھر جاتی ہوں وہ آنچل چھپا دیتی ہیں۔

۴۔ اقرء اصغیر احمد میری پسندیدہ رائٹر ہیں اور میں ان کو اپنا دوست مانتی ہوں۔ آنچل کے ذریعے اقرء آپ کو پیغام دینا چاہتی ہوں کہ میں آپ کی بہت بڑی (عمر میں بہت چھوٹی) پرستار ہوں۔ آپ مجھے بہت پسند ہیں۔ آپ میری شہزادی ہیں۔

۵۔ میں عفت سحر طاہر سے کہوں گی کہ جلدی سے اپنے نئے ناول کے ساتھ آنچل کی رونقیں مزید بڑھانے آجائیں۔ اللہ آپ کو ڈھیروں خوشیاں عطا فرمائے۔ آمین۔

شاکرہ بشیر..... قلعہ گلار والا نارووال

۱۔ آنچل سے وابستگی میری پیاری دوست راحیلہ کی وجہ سے ہوئی اور ایسی ہوئی کہ اب آنچل چھوڑنے کو دل ہی نہیں چاہتا ہے۔

۲۔ آنچل کی سب سے اچھی خوبی یہ ہے کہ یہ ہر ماہ 26 تاریخ کو مل جاتا ہے۔ حالانکہ پورے ایک ماہ بعد ملتا ہے پھر بھی یوں لگتا ہے کہ جیسے جلدی مل گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ 26 تک انتظار کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں سیرا شریف طور اور عشنا کوثر کھتی ہیں کیونکہ دیگر پرجوں میں نہیں کھتی ہیں۔

۳۔ خوش گوار یادیں تو بہت سی ہیں کیونکہ جب نیا نیا پڑھنا شروع کیا تھا تو ہم کالج میں ہوتے تھے تو کلاس کے دوران میں ٹیچر سے چھپا کر پڑھنا بہت مشکل ہوتا تھا لیکن ہم پھر بھی جیسے تیسے کر کے تھوڑا بہت پڑھتے ضرور تھے اور ایک بہت ہی خوش گوار واقعہ یہ ہے کہ ہماری شکایت کسی ہم جماعت نے لگا

آنچل کے ہمراہ کے گزشتہ ماہ کے سوالات:-  
سوال:- آنچل سے وابستگی کب اور کیسے ہوئی؟  
سوال:- آنچل کی کس خوبی یا سلسلے نے آپ کو متاثر کیا؟

سوال:- آنچل سے وابستہ کوئی خوش گوار یاد یا واقعہ؟  
سوال:- کوئی ایسی دوست جو آنچل کے توسط سے ملی ہو اور آپ آنچل کے توسط سے ہی اسے پکارنا چاہتی ہوں؟

سوال:- اپنی پسندیدہ رائٹر کے لیے کوئی اچھی سی بات جو آپ آنچل کے توسط سے کہنا چاہتی ہوں؟



شع شکیل کراچی

۱۔ آنچل سے میرا رشتہ گزشتہ 4 سال سے ہے۔ جب میں 15 سال کی تھی تو عفت سحر طاہر کا ناول ”محبت دل پہ دستک“ نے مجھے آنچل سے متعارف کروایا۔

۲۔ آنچل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں صرف معیاری کہانیاں ہی ہوتی ہیں۔ سب ہی سلسلے مجھے بے حد پسند ہیں۔

۳۔ اس سوال کا جواب لکھتے ہوئے بیشتر واقعات میرے ذہن میں آئے۔ جب میں ساتویں کلاس میں تھی تو مجھے ڈائجسٹ پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں آنچی سے لے کر اور گھر سے چھپ کر آنچل پڑھتی تھی۔ ایک دفعہ میں آنچی کے گھر گئی اور جاتے ہی

دی تھی کہ یہ چاروں یعنی میں راحیلہ صبا اور فرح کلاس کے دوران رسالہ پڑھتی ہیں اور میں نے آکر ہمارے بیگ کی تلاشی لی لیکن اچھا یہ ہوا کہ آنچل ہم نے پہلے ہی چھپا دیا تھا۔

۴۔ میری سب سے اچھی اور پیاری دوست راحیلہ عنایت اس کو میں یہ پیغام دینا چاہوں گی کہ میں اس سے بہت زیادہ پیار کرتی ہوں اور بہت زیادہ یاد کرتی ہوں۔ اس لیے اتنے اتنے دن تک غائب نہ رہا کریں۔ میرا دل اداس ہو جاتا ہے۔

۵۔ میری پسندیدہ رائٹر زبیر اور عشنا آپی ہیں۔ یہ آنچل کی شان ہیں۔ سیرا آپی سے کہنا چاہوں گی کہ آپ پلیز قلم سے رشتہ ٹوڑے گا اور عشنا آپی! آپ بہت خوب صورت لکھتی ہیں۔ آپ کے الفاظ واقعی میں کسی الگ دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں پیار ہے۔ نہ کوئی جھگڑا نہ کوئی غم نہ مہنگائی نہ لوڈ شیڈنگ اور میں شہناز راجپوت کی بات سے اتفاق کرتی ہوں کہ سوڈن میں مرے ہوں گے۔ جب آپ نے اس دنیا کو رونق بخشی ہوگی۔ آخر میں یہ دعا ہے اللہ آنچل کو ترقی دے اور میری بہت اچھی پیاری خوب صورت دوست فرح ناہید کا شکریہ جو میرے الفاظ آپ تک پہنچانے کی میل کے ذریعے بھی ہمارے گاؤں میں نہایت نہیں ہے۔ خوش رہیں۔ اللہ حافظ۔

تانیہ تنزیل..... حافظ آباد

۱۔ میری آنچل سے وابستگی اچانک مئی 2007ء میں ہوئی جب میں بازار سے گزر رہی تھی کہ اچانک میری نظر بک شاپ پر رکے ہوئے آنچل پر پڑی اور میں نے فوراً ہی اس کو خرید کر گھر لے آئی اور پانچ سال سے یہ وابستگی اسی طرح قائم ہے۔

۲۔ میں جس تحریر سے بہت متاثر ہوئی ہوں وہ سلسلے دار ناول ”دشت آرزو“ ہے۔ مصنف نے اس

کہانی میں حقیقت کے رنگ بھر دیے ہیں۔  
۳۔ ایک دفعہ میں جب آنچل کو اپنی نصابی کتاب کے اندر رکھ کر پڑھ رہی تھی کہ اچانک میری امی نے آکر کہا کہ میں آنچی بے وقوف نہیں ہوں کہ مجھے یہ بھی پتا نہ چلے کہ میری اولاد کیا پڑھ رہی ہے مگر پھر بھی امی نے نہیں روکا اور تب سے اسے اپنی امی کے سامنے ہی بیٹھ کر پڑھتی ہوں۔

۴۔ ایسی کوئی دوست نہیں جو آنچل کے توسط ملی ہو لیکن ہاں۔ میں سیرا شریف سعدیہ ال کاشف اور نازیہ کنول نازی سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔

۵۔ جی ہاں! میں سیرا شریف طور کو میسٹ آف لک کہنا چاہتی ہوں تاکہ وہ آئندہ بھی بہترین کہانیاں لکھیں۔

ساجدہ زید..... ویر والا چیمہ

۱۔ تقریباً ڈیڑھ سال پہلے آنچل سے وابستگی ہوئی اور کیسے ہوئی.....؟ طالبہ سے کلاس میں آنچل چھینا (جی ہاں مابدولت گورنمنٹ ملازم یعنی کہ ٹیچر ہیں) اس کو خوب ڈانٹا اور خود گھر آکر پڑھنا شروع کیا۔ پورا آنچل پڑھا اور پھر تو یہ تھا کہ اگلے ماہ سے باقاعدگی سے خریدنا شروع کر دیا اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

۲۔ خونی تو اس کی سب سے بڑی یہ ہے کہ 27 تاریخ سے بھی پہلے مارکیٹ سے مل جاتا ہے۔ جب کہ باقی ڈائجسٹ کے لیے کتنے ہی چکر لگانے پڑتے ہیں۔ سلسلہ جس نے زیادہ متاثر کیا وہ ہے۔ ”بیاض دل“ اور ”آپ کی پسند“ شعر و شاعری سے چونکہ زیادہ لگاؤ ہے اسی لیے یہ دونوں سلسلے آنچل میں میری پسندیدگی کا سبب بنتے ہیں۔

۳۔ مجھے تو تقریباً ڈیڑھ سال ہوا ہے اس سے وابستہ ہوئے اور تقریباً ہر ماہ یہی ہوتا ہے کہ چھینا

جھٹی ہوتی ہے پڑھنے کے لیے چونکہ یہ رسالہ سب سے پہلے آ جاتا ہے تو ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ سب سے پہلے پڑھے۔ ابھی مارچ کی بات ہے 27 یا 28 تاریخ تھی۔ مارکیٹ کا چکر لگایا۔ آنجل خرید اور بڑی خوش خوش واپسی ہوئی کہ چاکر سارا پڑھ کے پھر دوسرے لوگوں کو بتانا ہے کہ آنجل آ گیا ہے۔ جب گھر آ کر سامان کھولا تو آنجل غائب۔ سارے شعلے دیکھ ڈالے لیکن ناجی! کہیں نہ ملا۔ تحقیق پر پتا چلا کہ آنجل صاحب نے چاند گاڑی سے اترنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ چاند گاڑی والا بھی اجنبی تھا پھر تو سوائے صبر کے کوئی چارہ نہ تھا اور پھر چار پانچ دن کے انتظار کے بعد دوبارہ خرید کر اپنی باری آنے پر ہی پڑھا۔

۴۔ ایسی تو کوئی دوست ابھی نہیں ملی کیونکہ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ مجھے ٹھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے اس کی مستقل قاری بنے ہوئے۔ ہاں البتہ کوئی دوست کرنا چاہتی ہو تو خوش آمدید اول و جان سے حاضر ہوں۔

۵۔ میں کہانیاں زیادہ نہیں پڑھتی اور دوسرے یہ کہ کبھی کسی خاص رائٹ کو پیش نظر رکھ کر نہیں پڑھا۔ سب رائٹرز ہی اچھا لگتی ہیں اسی لیے تو ان کی کہانیاں آنجل میں جگہ حاصل کرتی ہیں۔ تمام رائٹرز کے لیے دعا ہے کہ خدا ان کے ہاتھ اور قلم میں اور زیادہ طاقت و برکت دے اور وہ اسی طرح معیاری ادب تخلیق کرتی رہیں۔ بے شک یہ تمام رائٹرز ہمارے معاشرے کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔

امن..... گجرات

۱۔ آنجل سے وابستگی میری اس وقت ہوئی جب ”اور کچھ خواب“ شروع ہوا تھا اور اب تک قائم ہے۔

۲۔ دوستوں کے نام خط مجھے بہت پسند ہے کیونکہ اس میں دوستیں اپنی یادیں سب سے شیر

کرتی ہیں۔

۳۔ جب پہلی بار میں نے آنجل منگوا تھا تو وہ میری آپنی کا سرال تھا انہوں نے کہا تم اتنے رسالے پڑھنے کے بجائے اچھی کتابیں پڑھ لیکن میں نے منکر کر ان کا سوال ٹال دیا لیکن اب وہ میرا بھی سرال بن گیا ہے اور وہ میری لائبریری آنجل سے بھری دیکھ کر ہنستے ہیں۔

۴۔ ایک نہیں بلکہ مجھے تو ڈھیر ساری دوستیں اس کے ذریعے ملی ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ وہ سب مجھے بھی اپنی دوست بنالیں۔

۵۔ میری پسندیدہ رائٹرز عشنا کوثر ہیں ان کے لیے بس یہ شعر۔

زیاں میں بھی ہے فائدہ کچھ نہ کچھ  
تمہیں مل کر رہے گا صلہ کچھ نہ کچھ  
ہر اک بات میں ہے گہرائی کچھ نہ کچھ  
کبھی تو ہمیں لگے گا پتا کچھ نہ کچھ  
کیے جاؤ کوشش ”اور کچھ خواب“ پر میری دوست۔

اللہ حافظ۔

الراجہ اکرم..... فیصل آباد

۱۔ چار سال پہلے میں ایک دن بورہوری تھی تو چھوٹے بھائی کو کہا کہ کوئی رسالہ لا دو۔ اس وقت تک میں آنجل سے واقف نہ تھی۔ بھائی گیا اور آنجل لے آیا میں نے کہا یہ کون سا رسالہ لے آئے۔ خیر آنجل پڑھنا شروع کیا۔ پھر شاید نازی کی کوئی کہانی تھی نام یاد نہیں لیکن اتنی پسند آئی کہ اس کا اگلا حصہ اگلے ماہ کے آنجل میں آتا تھا مگر اس ماہ نہ آیا پھر 3 ماہ وہ بقیہ حصہ شائع ہوا اور وہ دن اور آج کا دن ایک بھی رسالہ آنجل کا بس نہیں ہوا۔

۲۔ آنجل کے معیار نے متاثر کیا اور اجازت مل گئی کوئی پابندی نہ لگی آنجل پڑھنے پر۔

۳۔ کوئی خاص پوچھ نہیں ہاں مگر جب اکثر کوئی لڑکی یا عورت پوچھے آپ آنجل والی راجہ اکرم ہو تو مجھے خوشی ہوتی ہے اس بیچان پر۔

۴۔ ہاں ملی تو بہت سی دوست ہیں مگر سب سے بڑھ کر میری پیاری دوست انجم لال اور عائشہ ملک۔ یہ دونوں لڑکیاں بہت پیار کرتی ہیں مجھ سے۔ عائشہ تو خود کو میری رستار کہتی ہے۔ دعا ہے میری دوستو! تم سب ہمیشہ خوش رہو آمین۔

۵۔ پسندیدہ رائٹرز تو سب ہی ہیں۔ کسی ایک کا نام لوں تو دوسری سے زیادتی ہوگی۔ میں سب سے کہنا چاہتی ہوں پلیز بڑی بڑی قسط لکھا کریں۔

شگفتہ خان..... بھولال

۱۔ 1996ء میں کراچی گئے وہاں پر آنجل ملا جس میں ”بہاروں کے سنگ سنگ“ پڑھا اور بس ایسے دل میں اترا کہ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے یہ تعلق گہرے سے گہرا ہوتا جا رہا ہے۔

۲۔ آنجل کا ہر سلسلہ قابل تعریف ہے اور خوبیاں ان گنت ہیں آنجل ایک ایسا دوست ہے جو دکھ سکھ یا مصیبت میں ہر لمحہ آپ کے ساتھ ہوتا ہے اور ہر رشتہ نبھاتا ہے کبھی بہن کبھی بھائی کبھی ماں کبھی باپ اور کبھی ہمدرد اور غم گسار۔

۳۔ آنجل کی ہر خوب صورت تحریر میرے لیے ایک خوش گوار یاد ہی ہے اور مجھے آنجل پڑھنے سے نہ کوئی روکتا ہے اور نہ ہی منع کرتا ہے۔ واقعہ ایسا کوئی نہیں ہے سوائے اس کے کہ آنجل میں میرا نام میری شاعری آنے لگی۔

۴۔ بہت سی دوستیں آنجل کے توسط سے ملی ہیں۔ میں نازیہ کنول نازی امیہ سمعیہ مریم نوشین اقبال بشری باجوہ سدرہ اسلم عطریہ سکندر دعا غزالہ ہادیہ سحر نادیہ جہانگیر سائرہ شازہ اور چندا امثال اور

یہ میرے پاس ہیں اور خدا کرے ہمیشہ رہیں اور بیکاروں کی ان کو جو میرے پاس نہیں ہیں۔ مطلب باقی آنجل فرینڈز کو اپنے اس حلقہ احباب میں شامل کرنا چاہوں گی۔ اگر وہ چاہیں تو۔

۵۔ سب رائٹرز بہت اچھا لگتی ہیں بس اتنا کہنا ہے کہ کسی کو مارا مت کریں جو کردار ہمارے درمیان رہتے ہیں ان کا مرنا بہت تکلیف دیتا ہے اور زندگی میں پہلے ہی بہت دکھ ہیں اس دوست کو تو صرف خوش دینے والا بنانے دیں پلیز۔

نصوریہ حسین..... اوکاڑہ

۱۔ اس سوال کا جواب ٹھوڑا مشکل ہے کیونکہ میں نے آنجل کو شروع سے اپنے گھر آتے دیکھا ہے۔ ہاں یہ ضرور بتا سکتی ہوں کہ آنجل میں پہلی کہانی جو پڑھی تھی وہ آبیہ مرزا کی ”اے جنوں دشت ہے کہ منزل ہے“ کی دوسری قسط تھی۔

۲۔ ویسے تو آنجل کی ہزاروں خوبیاں ہیں جو بیان کی جاسکتی ہیں لیکن نمبروں یہ کہ آنجل ایک فیملی میگزین ہے۔ اسے گھر کا تقریباً ہر فرد ہی پڑھ سکتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ تفریح کا اچھا ذریعہ ہے جو ہمیں گھر بیٹھ کر حاصل ہوتی ہے اور اس کی کہانیاں سب سے اچھی ہوتی ہیں خصوصاً قسط وار ناولز۔

۳۔ جب آنجل میں پہلا خط شائع ہوا کیونکہ آنجل ہی وہ رسالہ ہے جس میں نے پہلی دفعہ پہلی بار خط لکھا تھا۔ وہ خوشی میرے ایک حیرت انگیز چیز تھی اور اب میں روائی سے کسی بھی ڈائجسٹ کے لیے خط لکھ سکتی ہوں تو اس تعریف کا مستحق آنجل ہی ہے۔

۴۔ یہ سوال واقعی میں مزے دار ہے کیونکہ میرے ساتھ ایسا ہو چکا ہے۔ جب میں نے میٹرک کے بعد کالج میں داخلہ لیا تو انجلی میری

دوست بن گئی۔ مجھے بہت خوش ہوئی پھر ہماری دوستی مضبوط ہو گئی۔ اب اگر وہ مجھے نہ ملے یا ٹیلی فون نمبر تبدیل کرے تو میں اسے آجکل کے ذریعے ہی بات کرتی ہوں۔

۵۔ میں اپنی پسندیدہ رائٹرز عفت سحر طاہر افرآ صغیر احمد آسیہ مرزا سے بھی گزارش کرنا چاہتی ہوں کہ میں آپ لوگوں سے بے انتہا محبت کرتی ہوں۔ آپ لوگ ہمیشہ میری دعاؤں میں شامل رہتی ہیں۔ پلیز اب اپنی غیر حاضری کو ختم کریں اور ایک اچھے اور نئے ناول کے ساتھ آجکل میں شریک ہوں۔ میں شدت سے منتظر ہوں۔ افرآ! آپ نے تو اپنی غیر حاضری کو ختم کر دیا میں دل سے شکر گزار ہوں اس کی اور میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ جتنی محبت میں آپ سے کرتی ہوں کوئی نہیں کر سکتا۔ پلیز میں آپ سے دوستی اور بات کرنا چاہتی ہوں اور پلیز آپ اتنی دیر تک غیر حاضرت رہا کریں۔ خدا تمام رائٹرز کو ہمیشہ خوش اور آ بارے کے آمین۔

سعدہ نعیم..... خانیوال

۱۔ آجکل سے وابستگی تقریباً آٹھ سال پہلے اپنی پھوپھو کے ساتھ ان کی کوئٹہ کے گھر گئی تھی۔ وہاں پر ان کی بیٹی سے لے کر آجکل پڑھا اور آجکل آج تک ساتھ ہے اور خدا کرے ہمیشہ رہے۔

۲۔ آجکل کی تحریر عفت سحر طاہر کا ”تیری الفت میں صنم“ میرا بھی تک کا پسندیدہ ناول ہے۔

۳۔ آجکل سے وابستہ خوش گوار یاد یہ کہ دو سال پہلے انگلینڈ سے میری پھوپھو آئی ہوئی تھیں میں صوفے پر بیٹھ کر آجکل پڑھ رہی تھی۔ ان کا بیٹا عقیب پاس بیٹھ گیا۔ میں کسی کام سے اٹھی اور آجکل کو صوفے پر رکھ دیا۔ عقیب کے وزن سے صوفے کا توازن خراب ہوا اور آجکل اس کے اندر دھنس گیا اور میں

پریشان آجکل کو زمین فگ گئی یا آسمان کھا گیا۔ تقریباً ۱۰ ماہ بعد آجکل کا سراغ لگا۔ یہ واقعہ آج بھی مزا دیتا ہے۔

۴۔ میری دوستیں ریحانہ یا سمین رومی نسیم اور ریحانہ اقبال عظمت کمال۔ ہم ہمیشہ کانٹ میں اکٹھے آجکل پڑھتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ خرید لی ہمیشہ تھی۔

۵۔ ”میرا شریف طور“ اور ”عفت سحر طاہر“ میری پسندیدہ رائٹرز ہیں۔ ان دونوں کے لیے بہت سی نیک تمنائیں۔

نجم انجم..... کراچی

۱۔ آجکل سے وابستگی ۱۹۹۵ء میں ہوئی تھی۔ غلطی سے کزن آجکل لے کر آیا تو اس سے خوب لڑائی ہوئی تھی کہ پیسے ضائع کر دیے مگر جب پڑھنا شروع کیا تو بس نہ پوچھو اس وقت سے اب تک آجکل ہی ہمارے گھر آتا ہے۔ سمجھو کہ آجکل کا مقام دل کے اندر ہے۔

۲۔ آجکل ہر لحاظ سے اچھا ہے ”در جواب آں“ کی باجی ”فرحت آراء“ مرحومہ نے ہمیں بہت متاثر کیا ہے اور ”ہم سے پوچھیے“ بہت ہی زیادہ پسند ہے۔

۳۔ آجکل کے ساتھ خوش گوار واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۹۷ء میں ہم دونوں بہنیں آجکل پڑھتے پڑھتے لڑی تھیں کہ پہلے کہانی میں پڑھوں گی۔ باجی (جو کہ اب دنیا میں نہیں ہیں) کا کہنا تھا کہ آدھے پیسے میں نے دیے ہیں لہذا میں پڑھوں گی۔ اس بات پر جھگڑا بڑھ گیا اور آخر میں آجکل بے چارہ ہم دونوں کے ہاتھوں تقسیم ہو گیا۔ یعنی آدھا میری طرف اور آدھا باجی کی طرف ہو گیا۔ اس کے بعد میں اپنا آجکل الگ لیتی تھی۔

۴۔ آجکل کے توسط سے کوشش بہت کی گئی

بہنوں کو پیغام بھی روانہ کیا مگر کسی نے اپنا دوست نہیں بنایا۔ افسوس!

۵۔ پسندیدہ رائٹرز نازیہ کنول نازی سے کہنا چاہوں گی کہ امامہ کوشنجاع کی بیوی ہی رہنے دیں تو اچھا ہوگا۔ اپنے گھر کو ٹھوکر مار کر امامہ جا رہی ہے۔ ارسلان اس کو دھوکا دے اور اس کے بعد واپس اسے شنجاع کی بیوی بن کے رہنا پڑے تاکہ ہماری نئے انداز میں سوچنے والی لڑکیوں کو سبق ملے۔

اب اللہ حافظ۔

سردارہ نسیم..... کھڑک

۱۔ آجکل سے وابستگی تب ہوئی تھی جب میں آٹھویں کلاس میں تھی۔ گھر میں عاتق آبی اور نازیہ آبی آجکل پڑھتی تھیں اور مجھے اجازت تھی کہ میں صرف سلسلے پڑھ سکتی ہوں۔ تو بس پھر پڑھتے پڑھتے میں نے کہانیاں پڑھنا بھی شروع کر دیں۔

۲۔ ”ہمارا آجکل“ اور ”دوست کا پیغام آئے“ نے بہت متاثر کیا۔ کیونکہ میں نے آجکل کے علاوہ ایسا سلسلہ کسی اور سالے میں نہیں دیکھا ہے۔

۳۔ خوش گوار واقعہ ہے نا! جب ہم میٹرک میں تھے تو میں اور میری دوستیں بڑے مزے سے بیٹھی آجکل پڑھ رہی تھیں۔ ہمیں پتا بھی نہ لگا کہ کب بیریزڈ کا وقت ہوا اور کب پیر انجم کلاس میں آئیں حالانکہ پیچھے سے ہماری ہم جماعتیں ہمیں کہہ بھی رہی تھیں کہ کس کلاس میں آجکی ہیں لیکن وہ ہم ہی کیا جن کو آجکل پڑھتے وقت کسی چیز کا ہوش رہے تو بس پھر کیا تھا مگر انجم نے سب سے پہلے ہم سے آجکل لیا اور اس کے بعد خوب ”عزت افزائی“ کی لیکن ہم لوگ بھی ایک نمبر کی ڈھیت۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی بیریزڈ کے درمیان کتاب میں آجکل رکھ کے پڑھنا نہ چھوڑا۔ آج بھی جب یہ واقعہ یاد آتا ہے تو بہت سی

یادیں تازہ ہوجاتی ہیں۔

۴۔ کسی ایک کا نام لکھنا نا انصافی ہوگی کیونکہ آجکل نے مجھے بہت سی دوستیں دی ہیں جو کہ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری ہیں۔ مئی کے آجکل میں سب دوستوں کے نام تو لکھ چکے ہوں خط میں لیکن فرح طاہر اور امید چوہدری کا نام لکھا تھا لیکن وہ چھپنے سے رہ گیا اس لیے یہاں لکھ رہی ہوں۔

۵۔ پسندیدہ رائٹرز تو بے شمار ہیں۔ نازیہ کنول نازی! میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں اور آج جب میں نے اور ارم گل مہرہ نے آپ سے کانفرنس کال میں بات کی تو مجھے بہت مزا آیا۔ کال میرے لیے بہت یادگار رہے گی، ہمیشہ! نادیہ جہانگیر! آپ تو میری جان ہیں لیکن نادیہ! شاید آپ اپنی سدرہ کو بھولتی جا رہی ہیں۔ میرا شریف طور جی! ابھی تو میچ کا جواب دے دیا کریں۔

ظن ہما..... فیصل آباد

۱۔ پہلا سوال مجھے ۲۰۰۴ء میں لے گیا۔ جب میں نویں کلاس میں تھی اور کیمسٹری کے فارمولا کو یاد کر کے دماغ ڈکھنے لگتا تھا۔ میں نے حفظ کیا ہے تو قرآن پاک سنانے نزدیکی مدرسے میں جانی تھی۔ وہاں آبی زرش کے پاس آجکل دیکھا تو یوریت سے بچنے کے لیے پڑھنے لگی۔ آجکل سے وابستگی کا سبب ”صرف ایک بار“ جو کہ اریشہ غزل کا ناول تھا اور عفت جی کا ناول ”محبت دل پستک“ بنے پھر اس کے بعد بھی یہ رشتہ ٹوٹ نہ سکا۔

۲۔ آجکل کی جس خوبی نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ ہے کہ آجکل میں نئے لکھاریوں کی بہت حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے ”آپ کی شخصیت“ اور ”دوست کا پیغام آئے“ کے سلسلے بہت پسند ہیں کیونکہ اسی کے ذریعے مجھے ہادیہ اور



کرن شاہ جیسی دوستیں ملیں اور سیدہ مریم جیسی بہن جسے لگتا ہے کہ میں کچھ لوگوں کے لیے بہت خیال رکھنے والی ہوں اور کچھ کے لیے بہت ہی بے پرواہ۔ آنجل کی ایک بہت بڑی خوبی فرحت ایپا تھیں جو اتنے پیار سے جواب دیتی تھیں کہ انسان خود کو خوش قسمت سمجھنے لگتا تھا۔

۳۔ یہ سوال مجھے اس آنجل کی یاد دلا گیا ہے۔ جس میں ”محبت دل بہ دستک“ کی آخری قسط تھی۔ ہمارے اخبار والے انکل ساڑھے آٹھ بجے آتے تھے جبکہ میں آٹھ بجے کانچ کے لیے نکل جایا کرتی تھی۔ اخبار والے نے آنجل پایا کو دیا تو وہ یوں ہی ہاتھ میں لیے فیکٹری چلے گئے۔ ان کے آفس پر انکل اقبال لے گئے۔ اس دن کافی سارا رولی تھی میں۔ پھر اگلے دن نیا آنجل منگو الیا اور جب فروری 2008ء کے آنجل میں میرا تعارف چھپا تھا تو میری ہم جماعتوں نے پورے کانچ میں یہ خبر پھیلادی تھی اور دوستوں نے ٹرینٹ کی تھی۔

۴۔ آنجل کے ذریعے مجھے بے تحاشا دوستوں کا خلوص ملا۔ غزل، عطریہ، چندرا، حجاب، سائرہ مریم، سائرہ مشتاق، اریہ شاہ، عفت قریشی، عائشہ ملک، رابعہ اکرم، فرح طاہر، سمیعہ مریم، سدرہ اسلم، نوشی ارم نور یہ سب دوست آنجل کی عنایت ہیں (کسی کا نام رہ گیا تو معذرت)۔ آنجل کے ذریعے پکارنے کی بات ہو تو میں چند امثال کو پکاروں گی۔ چندا کہاں ہو؟ میں بہت پریشان ہوں تمہارے متعلق اپنی خیریت کی اطلاع ہی دے ڈالو پلیز۔

۵۔ سیمیرا شریف طور اور عفت سحر یہ دونوں شروع سے میری پسندیدہ رائٹرز ہیں۔ اس کے علاوہ اقرا صغیر بھی بہت اچھا لکھ لکھتی ہیں۔ نازیہ کنول نے تو آنجل میں بہت زیادہ لکھا ہے۔ سیمیرا جی آپ کی تمام

تحریریں بہت زبردست رہیں۔ مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی، اتنا کچھ سمجھانے والی سادہ سے لفظوں میں فلسفہ زندگی بیان کر دینے والی سیرا کے لہجے میں اتنی تسکین کیوں ہے؟ ”یہ چاہتیں یہ شدتیں“ کے اختتام پر لکھا گیا آپ کا خط مجھے لگا جیسے رائٹرز نے بھی دو روپ رکھے ہوتے ہیں۔ تحریروں کے ذریعے دلوں کو باندھنے والی خود زندگی کی بساط پر تھکنے لگتی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ نازیہ! مجھے آپ کے کردار بہت حد تک ایک جیسے لگتے ہیں۔ کچھ مختلف کریں ان کو۔ اقرا جی امید ہے کہ آپ کا نیا ناول بھی ”شہر چارہ گراں“ اور ”بہاروں کے سنگ سنگ“ کی مانند زبردست ہوگا۔ سہاس گل! کیسی ہیں آپ؟ آپ کی تحریروں کا بھی بے چینی سے انتظار رہتا ہے اور چاندنی کی ادا سی آج بھی اداس کر دیتی ہے۔ اللہ آپ سب کو دھیروں خوشیوں اور محبتوں سے نوازے۔ آمین۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔

ثناء مارچ..... شریقور شریف

۱۔ وابستگی تو 2004ء میں اور ایسے مرگان محبت کہانی سے ہوئی۔ سچ اس نے بہت رلا لیا۔ تب سے اب تک میں آنجل ہر ماہ پڑھتی ہوں۔

۲۔ آنجل کی سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ یہ بہت جلدی مل جاتا ہے۔ اس کے سلسلے دار ناول تو سب ہی بہترین ہوتے ہیں۔ آنجل میں ”آپ کی صحت“ بہت اچھا ہے۔ ہم بہت سی بیماریوں کا علاج گھر بیٹھے کر لیتے ہیں۔ آپ کی صحت پڑھ کر میں آدھی ڈاکٹر بن گئی ہوں۔ حالانکہ میں آرس کی طالبہ ہوں اور غزلیں، نظمیں بھی بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اس سے وہ شاعر جن کی شاعری کو گھر پڑے پڑے رنگ لگ جاتا ہے ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

۳۔ میری ایک دوست مجھ سے آنجل مانگ کر لے گئی تھی لیکن اس بدتمیز نے مجھے واپس نہیں کیا۔ کیا بتاؤں اس شارے کو کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔ شریقور کی کوئی دکان نہ چھوڑی لیکن اس نے نہ ملنا تھا نہ ملا۔ پھر میرا راولپنڈی جانا ہوا۔ وہاں کے بازار کھگالے تب جا کر آنجل ملا۔ اب میں کسی کو بھی آنجل نہیں دیتی۔ میرے پاس 2004ء سے لے کر اب تک آنجل کے سارے شارے ہیں۔ یہ کوئی خوش گووار واقعہ تو نہیں ہے لیکن واقعہ تو ہے نا۔ یاد بھی سمجھ لیں۔

۴۔ دوست تو کوئی نہیں ملی لیکن آنجل ہی دوست بن گیا اور اب تک ہے۔ دوسری بار اس دوست سے بات کر رہی ہوں۔

۵۔ عشق جی، اقراء، صغیر احمد، نازیہ کنول ان کے تو کیا ہی کہنے ہیں۔ ان سے کہنا تو بہت کچھ ہے لیکن ملتے تو ہی اچھا تھا۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ

جس بھی فنکار کے شاہکار ہو تم اس نے صدیوں تمہیں سوچا ہوگا



## آنجل کے ہمراہ

- (۱) گزشتہ 64 برسوں میں آپ کیا سمجھتی ہیں ہم نے آزادی سے کیا پایا؟ کیا کھویا؟
  - (۲) آج پاکستان کو جو مسائل درپیش ہیں آپ کی نظر میں اُس کا سب سے بڑا ذمہ دار کون ہے؟
  - (۳) آپ کی رائے میں وہ کیا چیز ہے جس سے ملکی ترقی اور خوشحالی کو فروغ دیا جاسکے؟
  - (۴) پاکستان کے لیے کچھ کرنے کا موقع ملے تو کیا کرنا چاہیں گی؟
  - (۵) پیارے وطن پاکستان سے دلی جذبات کے اظہار کا موقع ملے تو کن الفاظ میں اظہار کریں گی۔
- آپ ان سوالات کے جوابات 10 جولائی تک بڈار یو ڈاک یا ای میل ارسال کر سکتی ہیں۔

ادارہ

ماحول کی تپش کا تقاضہ ہے بس یہی  
سائے کو دیکھ یوں نہ تناور شجر کو دیکھ  
ہاں یہ ضروری شرط ہے منزل کے واسطے  
راہ سفر نہ دیکھ شریک سفر کو دیکھ

”وہ دیکھو وہ اس کے پیچھے ہے۔ وہ اسے مارے گا۔ وہ بہت خوفناک ہے۔ اسے مارے۔۔۔۔۔۔ یہ لڑکی کیوں اس کی طرف جارہی ہے۔ یہ تو گئی کام سے۔۔۔۔۔۔ وہ اسے مارے گا۔ مچھو۔۔۔۔۔۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اسے بند کر دو۔“ زوناب نے تکیہ سینے پر رکھ کر اس میں منہ چھپاتے ہوئے کہا۔ عمر اور غیر زوناب کے اسی قسم کے جملے جب سے انہوں نے ہمارے فلم لگائی تھی اس وقت سے سن رہے تھے۔ زوناب کو ان کی آنٹی ہونے کا شرف حاصل تھا اس لیے بے چارے خاموشی سے سن رہے تھے۔ زوناب کو اس طرح تکیے میں منہ چھپانا دیکھ کر دونوں بھائیوں کو شرارت سوجھی اور جب سین میں بھوت لڑکی پر جھپٹنے والا تھا عین اسی وقت عمر نے بڑی بخیدگی سے کہا۔

”آئی اللہ کی بچ گئی۔ وہ دیکھیں وہ بھاگ رہی ہے۔“ زوناب نے جیسے ہی وی اسکرین کی طرف دیکھا تو خوف سے اس کی چیخ نکل گئی کیونکہ بھوت لڑکی پر جھپٹ چکا تھا اور اب اسکرین پر اس کا چہرہ بڑے قریب سے دکھایا جا رہا تھا۔ زوناب ایک مرتبہ پھر چیخ پڑی جبکہ عمر اور غیر زوناب کے اس طرح

”دادی جان! مجھ سے کیا پوچھ رہی ہیں۔ ان سے پوچھیں۔ ایک تو بغیر بتائے اتنی خوف ناک فلم لے آئے اور زبردستی مجھے بھی اپنے ساتھ بٹھا کر دکھانے لگے۔ میں کب سے کہہ رہی ہوں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ فلم بند کریں یہ دونوں مجھے بھوت کی شکل دکھا رہے ہیں اب ایسے میں چیخ تو نکلے گی۔“ زوناب نے ساری بات عمر اور غیر پر ڈالتے



ہوئے کہا۔

”جب اتنا ہی چھوٹا دل ہے تو کیا ضرورت ہے اتنی خوفناک فلم دیکھنے کی؟ اب انہوں نے تمہیں رسی سے باندھ کر تو بٹھایا نہیں ہوگا۔ ضرورت تمہاری مرضی بھی ہوگی۔“ دادی جان نے اسے ڈانٹا۔

نہیں دادی جان! وہ..... میں تو بس ایسے ہی ان کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔“ زوناب نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔

”اور تم دونوں یہ تمہاری کوئی عمر ہے اتنی خوفناک فلمیں دیکھنے کی؟“ دادی جان کے کہنے پر دونوں ہی بھائی اپنا اوپر سے نیچے تک جائزہ لینے لگے۔ ماشاء اللہ دونوں ہی دس سال کے تھے۔ دادی جان کی یہ بات ان کی سمجھ سے باہر تھی۔

”سوری اماں بی! لیکن ہمارا خیال تھا کہ ہماری یہی عمر ہے ایسی فلم دیکھنے کی۔ اب آپ کی عمر میں تو ہم فلم دیکھتے آجھے نہیں لگیں گے اور ویسے بھی میں نے سنا ہے اس عمر میں دل بہت کمزور ہو جاتا ہے۔ ہمیں ہمیں خوف کے مارے ہارٹ اٹیک ہو گیا تو.....؟“ عمیر نے اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے معصومیت سے کہا۔

”تو بے! ان بچوں سے تو کوئی نہیں جیت سکتا۔ امریکا کے آزاد ماحول نے ان کا ستیا ناس کر کے رکھ دیا ہے۔“ دادی جان ہمیشہ سے جو راگ الاپتی آ رہی تھیں اب بھی وہی الاپ رہی تھیں۔

”اور زوناب! تم سے میں نے کتنی بار کہا ہے یہ اپنی اوٹ پٹانگ حرکتیں بند کر دو! کچھ گھر داری کے کام سیکھو۔ یہ آگے تمہارے کام چلیں گے لیکن تمہارے کانوں پر تو جوں تک نہیں رہتی۔ شادی کے لیے تم راضی نہیں ہو۔ کوئی لڑکا تمہیں پسند ہی نہیں آتا۔ ہر لڑکے میں تمہیں کیڑے نظر آتے ہیں۔ اب

کیا کوئی آسمان سے شہزادہ اتر کر آئے گا تمہارے لیے؟“ دادی جان گھوم پھر کر پھر اس کی شادی پر آگئی تھیں اور شادی کے ذکر سے زوناب چڑھی جاتی تھی۔ اس نے بے بسی سے ماں کی طرف دیکھا آخر لاڈلی جوٹھری ماں باپ کی..... بیٹی کی بے بسی دیکھ کر رابعہ بیگم سے رہانہ گیا۔

”ارے اماں جان! آپ کیوں اتنی فکر کرتی ہیں۔ ابھی کون سی اس کی عمر نکلی جا رہی ہے۔ شادی بھی ہو جائے گی۔“ رابعہ بیگم انہیں بہلاتی ہوئی کمرے سے لے گئی تھیں اور زوناب ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بیڈ پر ڈھسے گئی تھی۔

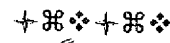
”ویسے ڈیر آئی! اماں بی ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔ آخر آپ کو کس آسمانی مخلوق کا انتظار ہے؟“ عمر نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے شرارت سے کہا۔

”مجھے کسی آسمانی مخلوق کا انتظار نہیں ہے۔“ زوناب نے جب کہ جواب دیا۔

”ارادے تو یہی بتا رہے ہیں۔“ عمیر بھی کہاں پیچھے رہنے والا تھا جھٹ بول پڑا۔

”یہ تم دونوں میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو اور ویسے بھی تم دونوں ان باتوں کے لیے چھوٹے ہو۔“ زوناب نے ڈانٹ کر کہا۔

”جسے دیکھو وہی نہیں چھوٹا کہہ کر دبا دیتا ہے۔ چل یاد عمر! ہماری تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔“ عمر عمیر کے گلے میں ہاتھ ڈالے منہ بنا کر کہنا ہوا کمرے سے نکل گیا۔



سعود زیدی! نور جہاں بیگم کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ان کی پیدائش کے چند سالوں بعد ہی ان کے والد کا مران زیدی کا انتقال ہو گیا تھا۔ کامران زیدی اپنا چلتا ہوا بزنس چھوڑ کر گئے تھے۔ ان حالات میں

نور جہاں بیگم کے بھائیوں نے ان کا ساتھ دیا اور ان کا بزنس سنبھال لیا۔ سعود زیدی نے اپنی پڑھائی مکمل ہوتے ہی اپنے والد کا بزنس سنبھال لیا تھا۔ نور جہاں بیگم کو اب اپنے بیٹے کی شادی کی فکر تھی اس لیے وہ ان کے لیے کسی اچھی لڑکی کی تلاش میں جت کھین اور آخر کار ان کی کوشش رنگ لائی اور رابعہ بیگم

”آم شیانہ نور جہاں“ میں بہار بن کر آ گئیں۔ رابعہ بیگم زیادہ اونچے گھرانے کی نہیں تھیں۔ ان کے والد وکیل تھے۔ والدہ حیات نہیں تھیں اس لیے انہوں نے بھی اپنی ساس کو ساس نہیں سمجھا ہمیشہ ماں سمجھا۔

مدلے میں وہ بھی نور جہاں بیگم کی آنکھ کا تارا بن گئیں۔ رابعہ بیگم کی ایک ہی بہن تھیں عذرا۔ وہ بھی شادی شدہ تھیں۔ شادی کے تین سال بعد اللہ نے رابعہ بیگم کو بیٹے جیسی نعمت سے نوازا جس کا نام انہوں نے نعمان رکھا۔ نعمان کی پیدائش کو دس سال کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن اب تک ان کی کوئی دوسری اولاد نہ

ہو پائی تھی۔ کبھی بھی رابعہ بیگم بہت اداس ہو جایا کرتی تھیں کہ اللہ نے ان کی قسمت میں صرف ایک ہی اولاد لکھی ہے لیکن نور جہاں بیگم انہیں ہمیشہ اپنی مثال دے کر سمجھاتیں تاکہ ان کا دکھ کچھ کم ہو جائے لیکن سب کچھ بے سود ثابت ہوتا تھا۔ خرا اللہ نے رابعہ بیگم کی سن ہی لی اور وہ ایک بار پھر امید سے ہو گئیں۔

اور ایک دن انہوں نے ایک بچی کو جنم دیا جس کا زوناب نام رکھا گیا اور سعود اور رابعہ جلد ہی بچی کو اپنے ساتھ گھر لے آئے۔ زوناب گھر میں کیا آئی تو گویا چمن میں بہار آ گئی تھی۔ وقت گزرتا گیا۔ سعود اور رابعہ اس کے لاڈ اٹھاتے نہیں تھکتے تھے۔ نعمان کی تو گویا جان

تھی زوناب۔ البتہ زوناب کی دادی ان کے اتنے لاڈ اٹھانے پر تھوڑا احتجاج کرتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ”لڑکیوں کو اتنا لاڈ پیا نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہی ان کی

ای بے جا حدیں پوری کر لی جائیں۔ یوں زوناب کو پڑھا دھن ہوئی ہے۔ اچھی تو تم لوگ اس کے اتنے ناز نخرے اٹھا رہے ہو لیکن اگر خدا خواستہ سسرال میں اس کے یہ ناز نخرے نہ اٹھائے گئے تو وہ سسرال چھوڑ کر گھر آ بیٹھے گی۔“

ان کا کہنا بھی ٹھیک تھا لیکن سعود زیدی ہمیشہ اپنی ماں کو یہ کہہ کر چپ کرا دیتے کہ ”اماں جان! جب تک زوناب ہمارے پاس ہے بس اس وقت تک ہی ہم اس کے ناز نخرے اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے بعد تو اسے اپنے سسرال چلے ہی جانا ہے۔ پھر اس پر ہمارا اتنا حق تھوڑی ہوگا جتنا اس کے سسرال والوں کا ہوگا۔“ اور نور جہاں بیگم ہمیشہ یہ کہہ کر رہ جاتیں کہ ”اس گھر کا تو باوا آدم ہی نرا ہے۔“ اور سعود زیدی مسکرا کر رہ جاتے۔

وقت تیزی سے پرگا کر اڑتا رہا۔ سعود زیدی نے نعمان کو ابتدائی تعلیم کے لیے امریکا بھیج دیا تھا۔ اس لیے اس کے حصے کی بھی ساری توجہ زوناب کے حصے میں آ گئی تھی۔ نعمان نے وہیں تعلیم حاصل کی اور اپنا بزنس بھی وہیں سیٹ کر لیا۔ رابعہ بیگم اور ان کی ساس نے نعمان کے امریکا میں بزنس کرنے پر احتجاج کیا تھا لیکن نعمان نے انہیں اپنی محبت سے منالیا تھا لیکن رابعہ بیگم اور ان کی ساس نے یہ شرط رکھی کہ وہ اس کیلئے امریکا نہیں جائے گا بلکہ اس کی بیوی بھی اس کے

ساتھ جائے گی۔ ماں اور دادی کی اس خواہش پر نعمان نے تسلیم فرم کر لیا اور اس طرح فریجہ ان کی زندگی میں شامل ہو گئیں۔ شادی کے ایک سال بعد ہی فریجہ نے دو جڑواں بیٹوں کو جنم دیا جن کا نام انہوں نے عمر اور عمیر رکھا۔ نعمان اور فریجہ ہر سال اپنے بچوں کو لے کر پاکستان آتے تھے لیکن اس دفعہ عمر اور عمیر اکیلے ہی پاکستان چلے آئے تھے۔ نعمان بزنس برائلم کی وجہ سے ان کے ساتھ نہیں آئے تھے لہذا فریجہ کو بھی نعمان



✦✦✦✦✦✦

”آئی! آپ ہمیں لان میں کرکٹ کھیلنے کا لاؤ  
دے کر لائی گئیں اور اب خود فری شو دیکھنے کھڑی ہو گئی  
ہیں۔ ہم اندر جا رہے ہیں۔“ اب کی بار عمر نے بہت  
زوردار احتجاج کیا تھا۔

”زونا ب بی بی آپ سیڑھی پر کھڑی کیا کر رہی ہیں؟“ بدر نے اچانک وہاں پہنچ کر چیخ کر پوچھا تو زونا ب سیڑھی سے گرتے گرتے پچی۔

زونا بیدار کو اکثر بدروح کہہ کر ہی مخاطب کرتی تھی۔ اس کا صحیح نام وہ صرف دادی جان کے سامنے ہی لیتی تھی کیونکہ اس کا نام بگاڑنے پر اسے دادی جان

”شکریہ بدر بھائی! جو کام ہم پون گھنٹے سے نہیں کر پائے وہ آپ کی بھینٹ کا آواز نے ایک لمحہ میں کر دکھایا۔“ عمر نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے کہا تو زوناب عمر کو کانکھیں دکھانے لگی۔

”آپ کو بڑی بیگم بلارہی ہیں اور انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ آپ کو اپنے ساتھ ہی لے کر آؤں۔“ اندازاً اہمیت جتانے والا تھا۔

”کیا مطلب؟“ کچھ نہ سمجھتے ہوئے زوناب بھی اس کے پیچھے تیز قدموں سے چلنے لگی تھی۔

”مطلب یہ کہ بھر ایک رشتہ اور پھر ایک بے چارے کی شامت۔ بڑی بیگم کے ارادے تو یہی

بتارے ہیں کہ اس دفعہ وہ رشتہ کرا کے ہی دم میں کی۔  
خدا ان کو ان کے مقصد میں کامیاب کرے۔ آمین۔“  
بدر نے ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہوئے کہا۔ زوناب جو  
یہ خبر سن کر پہلے ہی غصے میں آچکی تھی بدر کی اس دعا  
نے اس کے غصے کو اور ہوا دے کر بھڑکادیا تھا اور وہ دو  
کے بے حارے بدر کی پٹھنہ جڑ چکی تھی۔

”شکل اچھی نہیں تو بات تو اچھی کر لیا کرو۔ یقیناً

”نن.....نن.....سہیں زوناب بی بی! اسمے لے  
لیں جو میں نے بڑی بیگم سے کچھ کہا ہو۔ آج صبح ہی  
کسی صاحب کا فون آیا تھا۔ سعود صاحب ان سے  
جس طرح بات کر رہے تھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ  
صاحب ان کے دوست ہوں۔ ان صاحب نے ہی  
سعود صاحب سے بات کی تھی۔ میں ناشتا بنا رہا تھا

اس لیے میں نے یہ بات سن لی۔ آپ اندر جا کر  
 انہیں کچھ مت بتائیے گا۔ ان لوگوں کو نہیں پتا کہ یہ  
 بات مجھے معلوم ہے۔“ بدر نے رو ہاکی آواز میں کہا تو  
 زوناب جو بدر کی باتیں سن کر نرم پڑ چکی تھی اس کے  
 خاموش ہوتے ہی بول اٹھی۔

”مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ بدرنے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

وہ ہیں، میں نے جلد میں بنا دی۔  
 ہوئی وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

”سو نیا! ازم بہت اچھا لڑکا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ میرے بہت عزیز دوست کا بیٹا ہے۔ تم اس سے ایک بادل لو۔ وہ ایک بھتے بعد جرنی سے واپس آ رہا ہے۔ اس کے بعد ہم رشتے کی بات فائل کروں گے۔ مجھے یقین ہے اس سے اچھا شوہر تمہیں اور کہیں نہیں ملے گا۔ آج صبح ہی کاشف ضیاء

”کیا مطلب جلدی..... یہ جلدی ہے؟ تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے بالوں میں سفیدی آنے کا انتظار کروں؟“ کاشف ضیاء کا لہجہ تھوڑا سخت ہو گیا تھا۔

”نہیں بابا! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“ سونیا نے بات بنائی چائی۔

”تمہارا مطلب جو بھی تھا لیکن میں اب اس فرض سے جلد از جلد سبکدوش ہو جانا چاہتا ہوں۔“ کاشف ضیاء کرسی وھیکل کرکھڑے ہو چکے تھے۔ ”پچھلے سال ازم صرف ایک ماہ کے لیے پاکستان آیا تھا لیکن اب وہ ہمیشہ کے لیے پاکستان آ رہا ہے۔ میں یہ سب تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم اپنے آپ کو اس رشتے کے لیے تیار کر لو۔“ کاشف ضیاء نو فیصلہ سنا کے جا چکے تھے اور وہ ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر اپنے ارا مانوں کا خون ہو جانے پر رونے کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ پائی تھی۔

”اگر میری مال ہوئی تو وہ میرے ساتھ یہ زیادتی کبھی بھی نہیں ہونے دیتی۔ اب میں کیا کروں؟ یوسف بھی تو ایک مبینے سے دی گیا ہوا ہے۔“ سونیا کا دماغ اس وقت بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ سونیا

کاشف خیاہ کی واحد اولاد تھی۔ اس کی پیدائش کے چند گھنٹوں بعد ہی اس کی والدہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئی تھیں۔ کاشف خیاہ کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا جسے قبول کرنے میں انہیں کافی وقت لگا۔ انہوں نے اپنے آپ کو بس اپنے بزنس تک ہی محدود کر لیا تھا۔ وہ کسی سے نہیں ملتے تھے۔ سونیا کی دیکھ بھال کے لیے انہوں نے ایک آیا کو رکھ لیا تھا۔ وہ سونیا کو زیادہ نام نہیں دے پاتے تھے۔ سونیا کی خالہ اور بھوپتی تو تھیں لیکن آخر وہ بھی کب تک اسے دیکھیں۔ ان کا اپنا گھر بار تھا۔ کاشف خیاہ نے اپنی بیوی کے گزر جانے کے بعد یہ معمول بنالیا تھا کہ وہ صبح آفس کے لیے نکلتے اور رات گئے واپس آتے۔ جب سونیا نے تھوڑا بھوش سنہالا تو اسے اپنے پایا کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ ماں تو تھی ہی تھیں لیکن پایا کے ہوتے ہوئے بھی وہ ان کی محبت سے محروم تھی۔ وہ اکثر اس بات کا اظہار اپنی آیا کوثر سے کیا کرتی تھی۔ اب وہ بھی کیا کہتیں۔ وہ تو صرف ایک ملازمہ تھیں۔ اس لیے سونیا کو بہلا دیا کرتیں۔ سونیا یوسف کو پچھلے ایک سال سے جانتی تھی۔ ایک میوزک کنسرٹ میں ان کی ملاقات ہوئی۔ بس اسی ایک ملاقات نے ان دونوں کی زندگیوں میں پچھل چا دی۔ یوسف عباس جلیل اور زینت کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ان کا اپنا ذاتی بزنس تھا۔ اسی کے سلسلے میں یوسف ایک میمنے سے دہی گیا ہوا تھا۔ سونیا سوچ ہی رہی تھی کہ وہ پایا کو یوسف کے بارے میں بتائے لیکن اس سے پہلے ہی یوسف نے یہ دھماکا کر دیا کہ وہ دہی جا رہا ہے، کسی بزنس ڈیلنگ کے سلسلے میں کیونکہ بہت بڑی ڈیل ہے اس لیے ایک ماہ بھی لگ سکتا ہے۔ چنانچہ سونیا نے یہ فیصلہ کیا کہ یوسف کے دہی سے واپس آنے کے بعد وہ پایا کو یوسف سے ملوائے گی اور اپنی پسند کا اظہار بھی کرے گی لیکن پایا کے اتنے

اچانک فیصلے نے اس کی سوچے سمجھے کی ساری صلاحیتیں سلب کر دی تھیں۔

✽ ✽ ✽

”جی دادی جان! آپ نے مجھے بلایا؟“ دادی جان جو اس کی راہ دیکھ رہی تھیں زوناب کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کا اوپر سے لے کر نیچے تک جائزہ لینے لگیں۔

”یہ کیا حالہ بنا رکھا ہے تم نے اپنا؟“

جینز پر گھٹنوں سے اوپر تک کا کرتا اور کمر پر کس کر ڈوپٹا بندھا ہوا تھا۔ شوگرڈرکٹ بالوں کو اس نے بڑی بے دردی سے جوڑے کی شکل دے کر کچر میں پھنسا دیا ہوا تھا۔ دادی جان کے ٹوکے پر اس نے بھی اپنے حلیے کا جائزہ لیا اور جلدی سے کمر پر بندھا دوپٹا کھول کر اپنے شانوں پر پھیلایا۔ دادی جان کی گھورتی نگاہوں سے بچنے کے لیے زوناب کو ایسا کرنا پڑا۔

”اب تم بچی نہیں رہی ہو بڑی ہو گئی ہو۔ ذرا ڈھنگ کے حلیے میں رہا کرو اور یہ بالوں کا کیا ناس مارا ہوا ہے۔ کتنی بار کہا ہے ان میں تیل ڈال کر چوٹی بنا کر رکھا کرو پھر یہ بڑی لڑکی اللہ کی پناہ۔“ دادی جان نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

”دادی جان! شاید مہلا رہی ہیں۔ میں دیکھ کر آتی ہوں۔“ دادی جان کے پیچھے سے بچنے کے لیے زوناب اکثر ایسے ہی بہانے تراشتی تھی۔

”چپ ہو کے یہاں بیٹھو اور میری بات کان کھول کر سنو۔“ دادی جان اس کے ارادے بھانپ چکی تھیں اس لیے ڈانٹ کر بولیں اور زوناب بیزاری شکل بنا کر صوفے سے اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئی۔

”تمہارے لیے ایک رشتہ آیا ہے۔ لڑکا پڑھا لکھا ہے۔ تمہارے پایا کے دوست کا بیٹا ہے۔ آج کل دہی میں ہے۔ مجھے اور تمہارے والدین کو یہ رشتہ

بہت پسند آیا ہے اور ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جیسے ہی لڑکا دہی سے آتا ہے ہم تمہاری اس سے شادی کر دیں گے اور ہاں اس دفعہ کوئی رعایت نہیں برتی جائے گی۔ چاہے لڑکا تمہیں پسند آئے یا نہ آئے۔“ دادی جان نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

”ارے واہ شادی میری ہو رہی ہے اور مجھ سے ہی میری پسند نہیں پوچھی جائے گی۔ میں بھی دیکھتی ہوں کسے ہوتا ہے یہ رشتہ۔۔۔۔۔ ایسا چکر چلاؤں گی کہ سانب بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔“ یہ سوچ کر ہی اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی تھی۔ دادی جان اپنی بات ختم کر کے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”اے میں کیا کوئی لطیفہ سن رہی ہوں جو تم مسکرا رہی ہو؟“

”جی۔“ بے دھیانی میں زوناب کے منہ سے نکل گیا۔

”کیا؟“ دادی جان نے اسے غصے سے گھور کر کہا۔

”میرا مطلب ہے جی نہیں دادی جان میں جانتی ہوں آپ کو لطیفہ نہیں آتے۔۔۔۔۔ آپ کو تو بس میری کھینچی کرنا آتی ہے۔“ آخری جملہ زوناب نے دل میں کہا تھا۔

”اچھا اب میں جاؤں؟“ وہ جانتی تھی کہ وہ ذرا دیر اور دادی جان کے پاس بیٹھی تو وہ اسے نصیحت کرنا شروع کر دیں گی۔ دادی جان کی اجازت ملتے ہی وہ جھٹ کمرے سے دوڑ پڑی اور دادی جان نے مسکراتے ہوئے اپنا پان دان سنہال لیا۔

✽ ✽ ✽

سعود زیدی آج آفس سے جلد ہی نکل گئے تھے کیونکہ آج ان کا بیٹا اور بھو امریکا سے آ رہے تھے۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتے تھے لیکن ٹریفک میں بری

طرح پھنس گئے تھے۔ زوناب دو تین بار انہیں موبائل پر کال کر چکی تھی اور وہ بس اسے تسلی ہی دیے جا رہے تھے۔ سیل آف کر کے انہوں نے پریشانی سے ادھر ادھر گردن گھمائی تو ان کی نظر ایک جگہ ساکت ہو گئی۔ ”رضاعی میر۔“ بے اختیار ہی ان کے منہ سے نکلا تو وہ جوان کے برابر والی گاڑی میں براجمان تھے۔ اپنا نام سن کر انہوں نے کسی قدر چونک کر سعود زیدی کی طرف دیکھا تو وہ بھی ان ہی کی طرح حیرت کے سمندر میں غوطہ کھانے لگے۔

”یار سعود! تم اتنے برسوں بعد۔۔۔۔۔؟“ ایسے ہی کچھ الفاظ سعود زیدی کی زبان سے بھی ادا ہوئے تھے۔ خدا خدا کر کے ٹریفک ختم ہوا تو وہ دونوں ایک ریسٹورنٹ میں آ بیٹھے۔

”ابھی تھوری ہی دیر پہلے میں اپنے ملک کے ٹریفک نظام کو کوس رہا تھا لیکن شاید میں غلط تھا۔ اگر یہ ٹریفک جام نہ ہوتا تو میں تم سے کیسے ملتا۔ خیر تم بتاؤ جرنی سے کب لوٹے؟“ سعود زیدی کے لہجے میں بے قراری نمایاں تھی۔

”میں ایک سال پہلے ہی اپنی بیوی اور دو بیٹیوں کے ساتھ پاکستان شفٹ ہوا ہوں البتہ بیٹا ابھی جرنی میں ہی ہے۔ وہ بھی ایک ہفتے بعد پاکستان واپس آ رہا ہے۔“ رضاعی میر نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

”تم سناؤ آئی اور بھابی کیسی ہیں اور تمہارے کتنے بچے ہیں؟“ اب کی بار سوال رضاعی میر نے کیا تھا۔

”ہاں سب خیریت سے ہیں۔ جہاں تک بچوں کی بات ہے تو میرے دو ہی بچے ہیں، نعمان اور زوناب۔ بیٹے کی شادی کر چکا ہوں وہ امریکا میں سینٹرل ہے اور بہت جلد بیٹی کی شادی بھی کر دوں گا۔“ سعود زیدی نہ چاہتے ہوئے بھی زوناب کی شادی کے ذکر پر افسردہ ہو گئے تھے۔

”میں سمجھ سکتا ہوں سعود آخر میں نے بھی دو بیٹیاں بیانی ہیں۔“ رضا علی میر نے انہیں دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

”دو گھنٹے بعد مجھے نعمان اور فریحہ کو لینے جانا ہے مگر تم سے مل کر دل چاہ رہا ہے کہ تمہارے ساتھ بیٹھ کر گزرے دن یاد کروں۔ میں اب تک اپنے یونیورسٹی کے دنوں کو یاد کرتا ہوں۔ وہ بھی کیا دن تھے جب تم میں کاشف اور عباس تفریح کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ پڑھائی ختم ہوتے ہی اتنی نصف لائف شروع ہوئی اور ہم چاروں دوست اپنی اپنی زندگیوں میں اتنے الگ گئے کہ فاصلے بڑھتے ہی چلے گئے لیکن اب مجھے خوشی ہے کہ یہ فاصلہ آہستہ آہستہ سمٹتے جا رہے ہیں۔“ سعود زیدی کے چہرے پر خوشی کے رنگ نمایاں تھے۔

”ہاں سعود! تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں نے بھی زندگی کے ہر موڑ پر تم لوگوں کو بہت یاد کیا ہے۔ پہلے میں صرف کاشف سے ہی دوستی بٹھاتا تھا اب تم بھی اس میں شریک ہو گئے ہو۔“ رضا علی میر نے بے ساختہ مسکرا کر کہا۔

”کیا تم کاشف سے رابطے میں ہو؟“ سعود زیدی نے کسی قدر حیرانی سے پوچھا۔

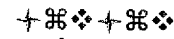
”ہاں! پاکستان شفٹ ہونے کے بعد ایک اسی سے رابطے میں رہا ہوں اور تمہیں ایک خوشخبری سناؤں؟ ہم دونوں نے اپنی دوستی کو رشتے داری میں بدلنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”واقعی! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ ویسے ایسی ہی ایک خوشخبری میرے پاس بھی ہے۔“ سعود زیدی نے مسکرا کر کہا تو رضا علی میر کی بڑی بڑی آنکھیں محسوس سے پھیل گئیں۔ ”ایسا ہی ایک فیصلہ میں نے اور عباس نے بھی کیا ہے۔“ ان کی مسکراہٹ بدستور قائم تھی۔

”تمہارا مطلب ہے عباس خلیل؟“ رضا علی میر نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں عباس خلیل۔ وہ اپنے بیٹے کی شادی میری بیٹی سے کرنا چاہتا ہے۔“ سعود زیدی نے ان کی بے یقینی کو بھانپتے ہوئے وضاحت کی۔

”اتنے جبرت انگیز انکشافات کے بعد تو مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں کوئی قلم دیکھ رہا ہوں۔“ رضا علی میر ابھی بھی بے یقینی کی کیفیت سے باہر نہیں آئے تھے۔ جاتے جاتے وقت سعود زیدی اور رضا علی میر نے آپس میں اپنے اپنے کارڈز کا تبادلہ کیا تاکہ وہ بے آسانی ایک دوسرے سے رابطہ کر سکیں۔



احزم ابھی تک جرمنی سے نہیں لوٹا تھا۔ پاپا نے اسے جب سے احزم کے آنے کی خبر سنائی تھی وہ بھی دعا کر رہی تھی کہ احزم کھانے سے پہلے یوسف دہی سے واپس آ جائے تاکہ وہ پاپا سے اسے ملوادے۔ پورے ایک ہفتے سے وہ کمرے میں بند پڑی تھی۔ اس کی روح کو کسی صورت سکون نہیں تھا۔ کوثر کمرے میں آئیں تو وہ بیڈ پر اوندھی پڑی تھی۔ وہ آہستگی سے چلتی ہوئی اس کے پاس ہی بیٹھ گئی تھیں۔

”سونیا! کیا بات ہے؟ دیکھ رہی ہوں پچھلے ایک ہفتے سے تم نے اپنے آپ کو کمرے تک محدود کر لیا ہے۔“ انہوں نے بڑے پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”کوثر کو اپنے پاس بیٹھا دیکھ کر وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ کوثر گو وہ بچپن ہی سے انابی کہتی تھی۔ کوثر بالکل بے سہارا تھیں۔ ان کے شوہر کے انتقال کے بعد ان کے سرال نے بھی ان سے آنکھیں پھیر لی تھیں اور انہیں گھر سے نکال دیا تھا۔ ایسے میں انہیں کاشف ضیاء نے سہارا دیا اور سونیا کی

ذمہ داری ان پر ڈال دی جو کوثر نے خوشی خوشی سنبھال لی تھی۔ انہیں سونیا سے اتنا لگاؤ ہو گیا تھا کہ اس کی تکلیف پر وہ تڑپ اٹھتی تھیں۔ ابھی بھی وہ سونیا کی تکلیف سے بے خبر نہیں تھیں اس لیے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس سے پوچھ بیٹھیں۔

”انابی! کتنا مجبور ہوتا ہے وہ انسان جو اپنے اندر اللہ تعالیٰ کو چھپا کر اپنی ہستی کو نیست و نابود کر کے صرف اور صرف دوسروں کے حکم پر ان کی مرضی کے مطابق جیتا ہے۔ کیا آپ ایسے انسان کے کرب کا اندازہ لگا سکتی ہیں جس کے پاس کئی ماہ و سال ہوں لیکن وہ ان میں سے ایک لمحہ بھی اپنی مرضی کے مطابق نہ گزرا سکتا ہو جو ہنستا ہو اور مسکان اس کے ہونٹوں کا ساتھ چھوڑ دے جو رونا چاہتا ہو پر کوئی ٹنگسار کوئی ہمدرد اس کے آنسوؤں کو جذب کرنے کے لیے نہ ہو خواہشات پالینا ہو پر اپنے ہی ہاتھوں انہیں دفن کرتا ہو جو نفرتوں کے پتے صحرا میں نکلے پاؤں صرف محبت کی بادشاہ میں گھسیٹا جائے۔ کیا انابی آپ نے ایسا بے تحاش اور مجبور انسان کبھی دیکھا ہے؟“ آنسوؤں کا ریزا بند توڑ کر اب اس کی آنکھوں سے روانی سے جاری تھا۔ انابی نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

”میں سمجھ سکتی ہوں سونیا بیٹا! کاشف صاحب نے نہ پہلے تمہارے ساتھ ٹھیک کیا اور نہ اب ٹھیک کر رہے ہیں لیکن تم تو جانتی ہو ان کی سخت طبیعت کو اور پھر تمہارے پاپا تمہارے لیے کچھ غلط تو نہیں سوچیں گے۔“ وہ اسے پیار سے بہلا رہی تھیں۔

”انہوں نے آج تک کبھی میرے بارے میں سوچا ہی نہیں ہے، پھر سچ اور غلط سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں اور میں بھی۔ اگر ان کی بیوی ان سے جدا ہوئی ہے تو وہ عورت میری بھی تو ماں تھی۔ پھر مجھے پاپا نے کس جرم

کی سزا دی؟ کیوں مجھے نظر انداز کیا؟ کیوں مجھے اپنی توجہ محبت پیار اور شفقت سے محروم رکھا؟ کیا تھا میرا قصور.....؟ صرف اتنا ہی کہ میری پیدائش کے بعد میری ماں اس دنیا سے چل بسی؟ ایسا تو کوئی اپنے پالتو جانوروں کے ساتھ بھی نہیں کرتا جو پاپا نے میرے ساتھ کیا ہے۔ نہ انہوں نے کبھی مجھے کوئی اہمیت دی اور نہ ہی میری باتوں کو اور نہ اب وہ میری پسند کو کوئی اہمیت دے رہے ہیں۔ میں ایک انجان شخص سے اس لیے شادی کر لوں کہ وہ ان کے دوست کا بیٹا ہے۔ جسے میں صرف شکل سے جانتی ہوں۔ انہوں نے اب تک مجھے صرف ایک بوجھ سمجھ کر اس گھر میں رکھا اور اب وہ یہ بوجھ اپنے سر سے اتار کر پھینک دینا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں میں اپنے فرض سے جلد بھجلا سکدوش ہو جانا چاہتا ہوں۔ ایسی زندگی جینے سے تو بہتر تھا کہ میں کبھی اپنی ماں کے ساتھ ہی مر گئی ہوتی۔“ سونیا کا پورا وجود غصے اور غم سے ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

”سونیا! میری بچی! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ آج سے پہلے تو کبھی تم نے ایسی باتیں نہیں کہی تھیں۔“ انابی نے اس کے رخساروں کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے پیار سے کہا۔

”انابی! اب برداشت نہیں ہوتا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے میں احزم سے شادی نہیں کروں گی کیونکہ میں.....“ سونیا کہتے کہتے رک گئی تھی جب کہ انابی اس کے اذھورے جملے پر چونک کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔ ”کیونکہ میں یوسف کو پسند کرتی ہوں اور اسی سے شادی کروں گی۔“ لہجہ قدرے ساٹھا تھا۔ انابی کچھ دیر تو اسے حیرانی سے دیکھتی رہیں پھر مسکرا کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

”تم فکر مت کرو۔ میں کوئی اچھا موقع دیکھ کر کاشف صاحب کو سمجھاؤں گی۔ چلو جلدی سے مسکراؤ۔“ انابی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تو وہ



مسکرا کر ان کے گلے لگ گئی۔

✽ ✽ ✽ ✽ ✽

نعمان اور فریحہ کے آنے سے ”آشیانہ نور جہاں“ میں گویا رونقیں اتر آتی تھیں۔ نعمان اور فریحہ کے آنے کی سب سے زیادہ خوشی زوناب کو تھی کیونکہ بابا اور ماما کے بعد وہی تھے جو اس کے لاڈ اٹھاتے تھے۔ انھی بھی وہ لوگ رات کے کھانے کے لیے ٹیبل پر موجود تھے۔ نور جہاں نیگم کی بار اپنے بیٹے کو آنکھوں کے اشارے سے کہہ چکی تھیں کہ وہ زوناب سے اس رشتے کے بارے میں بات کرے اور وہ اپنی بیوی کو کئی بار اشارے سے کہہ چکے تھے کہ وہ بات شروع کریں۔ مجبوراً کھانے کے دوران رابعہ نیگم کو یہی بولنا پڑا۔

”زوناب! ہم تم سے ایک بات کرنا چاہتے ہیں۔“ رابعہ نے پہلے اپنی ساس اور پھر شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ زوناب جو کہ عمر اور عیس کے درمیان مرغی کی دان کا مسئلہ سلجھانے میں اس طرح مصروف تھی گویا مسئلہ کشمیر سلجھ رہی ہو۔ ماما کی آواز پر فوراً ان کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”زوناب! تمہارے لیے ایک پرپوزل آیا ہے۔ تمہارے پایا کے دوست کا بیٹا ہے۔ بہت اچھی تعلیم ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ تم لڑکے سے ایک بارلے لو۔“ رابعہ نیگم اتنا کہہ کر رگیں اور زوناب کے چہرے کا جائزہ لینے لگیں۔

”جی ماما دادی جان نے مجھے بتایا تھا۔ مجھے لڑکے سے ملنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آخر پایا کے دوست کا بیٹا ہے لیکن اگر آپ لوگ بہتر سمجھیں تو مجھے ان کا فون نمبر دے دیں کیونکہ ملاقات سے پہلے اگر ہماری تھوڑی بات چیت ہو جائے تو بہتر ہوگا۔“ زوناب نے اپنے رویے سے ایسا ظاہر کیا تھا جیسے اسے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جب کہ ان

لوگوں کے لیے زوناب کا اتنا کہہ دینا بھی اطمینان کا باعث تھا ورنہ وہ تو رشتے کی بات سن کر ہی انکار کر دیتی تھی۔

”ہاں کیوں نہیں۔ میں تمہیں نمبر دے دوں گا۔ یوسف ایک ہفتے میں دہلی سے آ جائے گا۔“ یوسف زیدی جی کو اس رشتے کے لیے راضی ہوتا دیکھ کر اطمینان سے بولے جبکہ زوناب اپنے بنائے ہوئے پلان کی کامیابی پر دل ہی دل میں خوش ہونے لگی۔

✽ ✽ ✽ ✽ ✽

احزم کو دو دن ہو گئے تھے پاکستان آئے ہوئے لہذا صبح وہ آفس جانے کے ارادے سے جلدی ہی اٹھ گیا تھا۔ وہ تیار ہو کر ڈائمنگ ہال میں آیا تو اپنے والد رضاعلی میر اور والدہ امین کو وہاں پہلے سے موجود پایا۔ امین کی نظریں اپنے بیٹے کے پرکشش سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کلین شیوہ چمکتے ہوئے چہرے پر سیاہ چمک دار بال بڑی خوبصورتی سے سیٹ کیے گئے تھے اور اس کا چوڑا سینہ اس کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ نیوی بلیوسٹ میں اس وقت وہ کافی اسٹارٹ لگ رہا تھا۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا ان کے قریب آ چکا تھا۔

”کہاں کی تیاری ہے؟“ رضاعلی میر نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

”آفس کی۔“ وہ کرسی سے اٹھ کر اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”اتنی جلدی؟ میرا خیال تھا تم ایک ہفتے سے پہلے آفس جوائن نہیں کرو گے۔“ رضاعلی میر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اور آپ کو ایسا خیال کیوں آیا؟“ احزم نے امین کی طرف سے بڑھایا جانے والا چائے کا کپ تھام کر مسکرا کر پوچھا۔

”مجھے ایسا خیال اس لیے آیا کہ تم اتنے برسوں بعد اپنے ملک واپس آئے ہو تو یہاں آ کر گھومو گے پھر دو گے۔ ایک بار برنس میں چھپنے تو ان سب چیزوں کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بس اس لیے میں چاہتا تھا تم تھوڑا شہر کر برس جوائن کرو۔ خیر تمہاری مرضی۔ رضاعلی میر نے شانے اچکا کر خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”اچھا سنو کلن آفس کے بعد تم کاشف کی طرف نچلے جانا اور سونیا سے بھی مل لینا۔ مقصد تم جانتے ہو۔ سونیا اچھی لڑکی ہے۔ کاشف کی طرح مجھے بھی تم پر پورا اعتماد ہے کہ تم اس رشتے سے انکار نہیں کرو گے۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے تھے۔

احزم بڑے غور سے ان کی بات سن رہا تھا۔

”اور اگر میں آپ کے اعتماد پر پورا نہیں اترتا تو؟“

احزم نے معنی خیز نگاہوں سے رضاعلی میر کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ احزم کی بات پر چونک پڑا۔

”کیا تمہیں کوئی اور لڑکی پسند ہے؟ اگر ہے تو بتا دو۔“ رضاعلی میر نے بڑے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

”مجھے! وہ تو ڈیڈ۔“ اس نے گردن کودائیں بائیں

ہلا کر مسکرا کر کہا۔ ”لیکن ڈیڈ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ سونیا مجھے پسند نہ آئے اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کاشف انگل نے سونیا کو زبردستی اس رشتے کے لیے راضی کیا ہو۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس نے تو مجھے ٹھیک طرح سے دیکھا بھی نہیں ہے۔ دیکھئے ڈیڈ میں سمجھتا ہوں آپ کی اور کاشف انگل کی مضبوط دوستی کے رشتے کو کسی اور رشتے کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے پھر آپ لوگ ہمیں اس رشتے کے لیے پابند کیوں کر رہے ہیں؟ اگر یہ رشتہ نہیں ہوگا تو کیا آپ دونوں کی دوستی ٹوٹ جائے گی؟ کیا آپ کی دوستی کا انحصار اس رشتے پر ہے؟“ احزم نے بہ یک وقت اتنے سوال اٹھالئے تھے کہ رضاعلی میر کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ اسے کیا جواب دیں۔ لیکن گولم کی کیفیت میں ان دونوں کو کھیر رہی تھیں۔

”ڈیڈ میرا مقصد آپ کو کبھی کرنا نہیں تھا۔ میں صرف آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں ابھی سونیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میرا مطلب ہے اس کے مزاج اور عادات وغیرہ کے بارے میں۔ یہ میری

**اپنے دنیا کے کسی بھی خطے میں مفت وصول**

# پبلک آف

ایک رسالے کے لیے 12 کاگز سالانہ  
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے ہر کونے میں 600 روپے

سیریل ایسٹ ایشیائی ایڈیٹر کے لیے 6000 روپے

ڈرم ڈیماٹ ڈرافٹ، منی آرڈر، منی گرام، ڈسٹرن بونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہیں۔ مقامی افراد دفتر میں نقد ادائیگی کر کے کر سکتے ہیں۔

رابطہ: طاہر احمد قریشی ..... 0300-8264242

نئے آف گروپ آف پبلی کیشنز، کمرہ نمبر 7، فرید جیمز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔

فون نمبر: 2/35620771 +922-35620773 فکس: 2/5620773 +922-35620773 Email: circulationngp@gmail.com

پوری زندگی کا سوال ہے۔ میں اتنی جلدی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ آپ مجھے تھوڑا وقت دیں۔“ احزم کی رائے سے ایمن نے بھی اتفاق کیا تھا۔

”میرے پیارے بیٹے بے شک دیر تک سوچو مگر سوچنے کے بعد جو فیصلہ کرو وہ اہل ہونا چاہئے۔“ ایمن نے مسخنی خیر لہجے میں کہا تو احزم ہلکے سے مسکرا کر کرسی پیچھے دھیل کر کھڑا ہو گیا۔

”چلیں ڈیڈا“

”ہاں چلو۔“ رضاعلی میر بھی اپنا کوٹ درست کرتے ہوئے اس کی تائید میں کھڑے ہو گئے۔

ایمن بھی انہیں دروازے تک چھوڑنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔



آج سعود زیدی اور اربعہ کی شادی کی سالگرہ تھی۔ ہر سال کی طرح زوناب نے اس سال بھی فریخہ اور اپنی خالہ زاد کزن قمر کے ساتھ مل کر بڑی زبردست پلاننگ کی ہوئی تھی۔ اس نے فریخہ اور قمر کے ساتھ مل کر سارے انتظامات کر لیے تھے جس اب صرف گفت لیٹا باقی رہ گیا تھا۔ سعود زیدی اور نعمان صبح سے ہی لوگوں کو دعوت دینے لگے ہوئے تھے اور فریخہ اور قمر کچن میں مصروف تھیں تو اس نے عمر، عمیر اور بدر کے ساتھ گفت لینے جانے کا فیصلہ کیا۔ پچھلے ایک گھنٹے سے وہ گفت شاپ میں گھوم رہی تھی مگر اب تک اسے کچھ پسند ہی نہیں آیا تھا۔

”آئی! آپ اپنے لیے کوئی لڑکا تلاش کر رہی ہیں یا گفت؟“ عمیر نے جل کر کہا تو زوناب نے گھور کر اسے دیکھا۔

”زوناب بی بی! اب تو میری بھی نانگیں جواب دے لگی ہیں۔ آپ جلدی سے کوئی گفت پسند کر لیں۔“ بدر نے عاجزی سے کہا آخر زوناب نے

ایک گفت پسند کر ہی لیا پھر اچانک ہی اسے یاد آیا کہ اسے ٹیلر سے اپنے کپڑے بھی لینے ہیں۔ گفت پیک کر داکے وہ گفت شاپ سے نکل ہی رہی تھی کہ اچانک کسی سخت وجود سے جا لکرائی۔ اس شخص کے ہاتھ میں جو شو پیس تھا وہ زوناب کو گرنے سے بچانے کی وجہ سے اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین بوس ہو چکا تھا۔ ابھی وہ اس اچانک ہونے والی عمر سے سنبھل بھی نہ پالی تھی کہ اس شو پیس کے ٹوٹ جانے پر وہ ہونقوں کی طرح کبھی اس شخص کو اور کبھی زمین پر بکھرے کاغذ کے ٹکڑوں کو دیکھنے لگی۔ وہ شخص اپنے نقصان سے بے خبر زوناب کے معصوم سراپا کو تنک رہا تھا پھر جلد ہی اس نے اپنے چہرے پر غصے کے تاثرات قائم کر لیے۔

”یہ کیا کیا آپ نے؟“ سامنے کھڑا شخص نہایت غصے کے عالم میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

”دیکھئے مسٹر میں نے یہ جان بوجھ کر تو نہیں کیا۔ نکر اچانک ہوئی ہے۔ میں معافی چاہتی ہوں۔ میری وجہ سے آپ کا نقصان ہو گیا لیکن میں آپ کو اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ اتنا کہہ کر زوناب نے پرس کھولنا چاہا تو سامنے کھڑے شخص نے اسے ہاتھ کے اشارے سے پرس کھولنے سے منع کر دیا۔

”بات قیمت کی نہیں ہے۔ یہ میں نے کسی کے لیے پسند کیا تھا اور پوری دکان میں یہ ایک ہی پس تھا جو مجھے پسند آیا تھا جواب آپ کے اندھے پن کی نذر ہو گیا۔“ اس شخص نے سخت لہجے میں کہا۔

”بدر! تم بچوں کو لے کر گاڑی میں بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔“ زوناب کی طرف سے حکم ملنے پر بدر عمر اور عمیر کو لے کر گفت شاپ سے باہر نکل گیا۔

”دیکھئے مسٹر میں آپ سے اپنی غلطی کی معافی مانگ چکی ہوں۔ آپ کو تو اتنی بھی تمیز نہیں ہے کہ ایک

لڑکی سے کس طرح بات کرنی چاہئے۔ آپ بات کو خواجہ بڑھارہے ہیں۔ میں اپنی غلطی مان رہی ہوں اور آپ کو قیمت ادا کرنے کے لیے بھی تیار ہوں اور اس سے زیادہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟“ اب کی بار زوناب نے غصے سے دانت چیس کر کہا۔

”جی ہاں ٹھیک کہا آپ نے۔ اب آپ میرے لیے کیا کر سکتی ہیں جو کرنا تھا وہ تو آپ کر چکیں۔“ احزم معنی خیز لہجے میں اس سے دیکھ کر کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

”ہونہہ..... اکثر باز خان کہیں کا۔“ زوناب بھی غصے سے کہتے ہوئے کہہ کر گفت شاپ سے باہر نکل گئی اور احزم اس کے اس فقرے پر مسکرا کر رہ گیا۔ کل شام احزم کو سونیا سے ملنے جانا تھا اس لیے اسے خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لہذا راستے میں گفت شاپ پر نظر پڑتے ہی وہ اس کے لیے گفت لینے چلا آیا تھا اور اس حادثے کی وجہ سے اس شو پیس سے ہاتھ دھو بیٹھا۔



فریخہ تیار ہو کر زوناب کے کمرے میں آئی تو وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنی لب اسٹک کو آخری ٹچ دے رہی تھی۔ فریخہ مسکرائی ہوئی اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ سیاہ مٹیلے رنگ کے استراج میں سلک کی شارٹ شرٹ جس کے گلے اور دامن پر دھماکے، موتی اور کٹ دانے کی نفیس سی کڑھائی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ سیدھے ٹراؤزر میں زوناب کا سراپا قابل تعریف لگ رہا تھا۔ اپنے میک اپ کو آخری ٹچ دینے کے بعد وہ اپنے شو ٹنڈر کٹ بالوں کو پیچھے سمیٹ کر کچر لگا رہی تھی کہ فریخہ نے اسے ٹوک دیا۔

”رہنے دو زوناب! کھلے بالوں میں تم زیادہ اچھی لگ رہی ہو۔“ فریخہ نے شرارت سے اس کی

طرف جھک کر کہا۔

”تعریف کا شکریہ بھابی۔“ زوناب نے کہا اور جلدی سے دوپٹا سنبھالتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ مہمان آہستہ آہستہ ناشروع ہو گئے تھے۔ سعود زیدی رضاعلی میر کے گھر بھی دعوت دینے گئے تھے اور انہیں کاشف ضیاء کو بھی اپنے ساتھ لانے کے لیے کہا تھا اور انہیں تاکید کی تھی کہ وہ کاشف ضیاء کو کچھ نہ بتائیں۔ وہ انہیں سر پرانز دینا چاہتے ہیں۔ ادھر انہوں نے عباس جلیل کو بھی دعوت دی تھی اور انہیں بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ رضاعلی میر ایمن کاشف ضیاء اور سونیا کو وہاں لے کر پہنچو تو سعود زیدی ان کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ کاشف کو دیکھ کر سعود زیدی بے اختیار ان کی طرف لپکے۔ ادھر کاشف ضیاء کا بھی یہی حال تھا پھر کتنی ہی دیر تک وہ ایک دوسرے کے گلے سے لگدے۔ ان دونوں سے مل کر سعود زیدی ان دونوں کو عباس کی طرف لے آئے تھے۔ وہ ان دونوں سے پہلے ہی آ چکے تھے۔ ان دونوں کو سامنے دیکھ کر عباس خلیل کو تو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ وہ بے یقینی کی سی کیفیت میں ان کی طرف بڑھے جیسے کوئی خواب دیکھ رہے ہوں اور پھر جب انہیں یقین ہو گیا کہ یہ خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے پھر تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہا۔ ان چاروں نے تو اپنی محفل جمائی تھی جبکہ رابعہ ان کی پیو پیو کو پہنچا دینے کے لیے ان ہی کے ساتھ بیٹھ گئی تھیں۔ سونیا بھی ان ہی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔

زوناب نے خواتین کے بیچ اس نازک سراپا کو دکھا تو اسے اپنے ساتھ لے آئی تھی۔

”عائش! آپ بابا کے کسی دوست کی بیٹی ہیں! اتنا تو میں جانتی ہوں لیکن کس دوست کی ہیں یہ میں نہیں جانتی۔ کیا آپ مجھے بتائیں گی؟“ زوناب نے خود

ہی بات کا آغاز کیا۔

”کاشف ضیاء“ سونیائے مختصر جواب دیا۔

”میرا نام زوناب ہے اور یہ میری کزن ہے“  
”قمر“ زوناب نے اپنے برابر میں بیٹھی قمر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کا کیا نام ہے؟“ زوناب نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”سونیا“ سونیائے مختصر جواب دیا۔ اس وقت زوناب کو وہ لڑکی بیزاری سمجھی تھی لیکن اب

”کیا آپ پڑھتی ہیں؟“ زوناب ایک بار پھر بول پڑی۔

”جی نہیں۔“ سونیائے دوبارہ مختصر جواب دیا۔

”تو پھر کیا کرتی ہیں؟“ زوناب کو لگا کہ شاید اب وہ اسے اپنی مصروفیات گنوائے گی لیکن زوناب کا اندازہ بالکل غلط نکلا کیونکہ سونیائے صرف ”کچھ نہیں“

کہنے پر اکتفا کیا۔ قمر جو ان کی باتیں سن کر بور ہو رہی تھی آخر بول پڑی۔

”لگتا ہے آپ بہت کم گویا ہوئی ہیں لیکن ہم تو بہت بولتے ہیں اور اتنا بولتے ہیں کہ سامنے والا اکثر

ہمارے سامنے ہاتھ جوڑ کر درخواست کرتا ہے کہ خدا کے واسطے ہم پر رحم کرو اور چپ ہو جاؤ۔“ قمر کوفت سے مسکرا کر بولی تو سونیا قمر کی بات پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی۔

”اوہ تھیک گاڈ آپ مسکرائیں تو سہی۔“ قمر نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں اب بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سامنے ایک مسخری بیٹھی ہو اور چہرے پر مسکراہٹ نہ آئے۔“

زوناب نے اسے چراتے ہوئے کہا۔

”اچھا جناب! یہ مسخری اگر ہنسانا جانتی ہے تو نارانا بھی جانتی ہے۔ ذرا آئیے دو یوسف بھائی کو پھر تم دیکھنا۔“ قمر نے زوناب کو دھکاتے ہوئے کہا۔ یوسف

کے ذکر پر سونیا قمر اور زوناب کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ جانے کیوں اس کا دل یوسف کے نام پر بے چین ہوا اٹھا تھا۔ وہ اپنی اس کیفیت کو چھپانا چاہتی تھی لیکن باوجود کوشش کے چھپانہ پائی۔ قمر نے جب سونیا کے چہرے کو سوالیہ نشان بنادیا تو فوراً بول پڑی۔

”دراصل یوسف بھائی ان کے ہونے والے“ وہ“ ہیں۔ آج کل وہی میں ہوتے ہیں اس لیے اب تک یہ تحترمہ ان کے دیدار سے محروم ہیں۔“ قمر نے شرارت سے پھر پور نظروں سے زوناب کی طرف

دیکھ کر کہا جو مسلسل اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ قمر کی بات سن کر سونیا شدید الجھن کا شکار ہو گئی تھی۔

”وہ کہہ کر اسے یہی بات پریشان کیے جا رہی تھی کہ نام میں تو مماثلت ہو سکتی ہے کیونکہ دنیا میں نہ جانے کتنے ہی لوگوں کا نام یوسف ہوگا لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے یوسف کی طرح یہ یوسف بھی

آج کل وہی میں ہے۔“ قمر کی اس بات نے اسے مزید پریشان کر دیا تھا۔

”کیا یوسف صاحب آپ کے رشتے دار ہیں؟“ یہ پہلا موقع تھا جب سونیائے خود کو کوئی سوال کیا تھا۔

”نہیں رشتے دار تو نہیں ہیں۔“ پایا کے بہت عزیز دوست عباس جلیل کے اگوتے صاحبزادے ہیں۔ وہ جو پایا کے پاس گرے ٹکر کے سوٹ میں بیٹھے ہیں نا ان ہی کے بیٹے ہیں۔“ زوناب نے انگلی کے اشارے سے نشاندہی کرتے ہوئے بتایا۔ عباس جلیل کو دیکھنے کے بعد کسی شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی کیونکہ

یوسف بالکل اپنے پایا میں ملتا تھا۔ سونیا سکتے کے عالم میں عباس جلیل کو دیکھنے ہی جا رہی تھی۔ جب ہی قمر اور

زوناب کو اس کی اس حالت پر تشویش ہوئی۔

”تم ٹھیک ہو سونیا!“ زوناب نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فکر مند سے پوچھا تو

سونیا چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”ہاں ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ بمشکل اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

”اچھا قمر تم سونیا کے ساتھ بیٹھو۔ میں ماما کو یاد دلانے آتی ہوں کہ انہیں کب بھی کاٹنا ہے۔“ زوناب یہ کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی جبکہ سونیا اپنی دلی کیفیت کو

چھپانے قمر سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔

آپ سے مل کے ہم کچھ بدل سے گئے  
شعر پڑھنے لگے لگناتے لگے

وہ آنکھیں بند کیے اس ہوش ربا سراپا کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا جو اس سے ٹکر لگی اور سیدھا اس کے دل میں اتر گئی۔ اس کے حواسوں پر چھا چکی۔ کتنے گھٹنے

گزر چکے تھے اس واقعہ کو

مگر ایک پل کے لیے بھی تو وہ اسے اپنی سوچوں اور خیالوں سے نکال نہیں پایا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے مجھے؟“ وہ اپنے آپ سے کہتا ہوا ایک دم ہڑبڑا کر بیڈ سے اٹھ بیٹھا تھا۔

”میں کیوں اس چہرے کو بھلا نہیں پارہا؟ یا شاید بھولنا نہیں چاہ رہا۔“ ازم اپنے کمرے بالوں میں انگلیاں پھنسائے بے خودی کے عالم میں خود سے مخاطب ہوا۔ ”کیا مجھے محبت ہو گئی ہے؟ ازم علی میر“

کیا تمہیں واقعی محبت ہو گئی ہے؟“ وہ بے یقینی کے عالم میں اپنے آپ کو ٹٹول رہا تھا۔ ”لیکن وہ لڑکی تو

شاید شادی شدہ ہے لیکن یہ میری غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بچے اس کے نہ ہوں۔ بچوں کی

عمر اور اس لڑکی کو دیکھ کر ایسا لگتا تو نہیں رہا تھا کہ وہ اس کے بچے ہیں لیکن اس نے اس آدمی سے جس

طرح کہا اس سے تو یہی لگ رہا تھا کہ وہ اس کے بچے ہیں۔“ وہ خود ہی سوال اٹھاتا اور پھر خود ہی اس کی نفی

کے لیے کہتا ہوا۔

پہلے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

”اچھا قمر تم سونیا کے ساتھ بیٹھو۔ میں ماما کو یاد دلانے آتی ہوں کہ انہیں کب بھی کاٹنا ہے۔“ زوناب یہ کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی جبکہ سونیا اپنی دلی کیفیت کو چھپانے قمر سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔

بھی کرتا جاتا۔“ اب اس دل کو کیسے سمجھاؤں؟ ازم علی میر دل سے نہیں دماغ سے کام لو۔ اگر وہ لڑکی

شادی شدہ ہے تو کسی شادی شدہ عورت کے بارے میں اس طرح سوچنا اخلاق سے گری ہوئی بات

”ہے۔“ ازم کو اندر سے کسی نے جھنجھوڑا تو وہ شرمندگی سے سر کو ہلکا سا جھکادے کر بیڈ پر دراز ہو گیا۔

سونیا بیڈ پر لیٹی کسی گہری سوچ میں غرق تھی کہ فون کی بیل پر چونک پڑی۔ فوراً ہی اس نے بیڈ کی سائیڈ

ٹیبل کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ریسور اٹھالیا۔

”ہیلو۔“ اس نے بہت کمزوری آواز میں کہا۔

”ہیلو سونی۔“ سونیائے جتنی کمزور آواز میں ہیلو کہا تھا دوسری طرف سے اتنی ہی جاندار آواز سنائی دی تھی جس نے اس کے پورے وجود میں لچل چلا دی تھی۔

”یوسف تم کب آئے؟“ سونیائے حیرانی سے تقریباً چھلتے ہوئے پوچھا۔

”کل رات کی فلائٹ سے آیا ہوں اور اب آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ سونیا میں تم سے ملنا

چاہتا ہوں۔ پورا ایک ماہ ہو گیا ہے تمہیں دیکھے ہوئے۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں تم سے۔ بولو کہاں ملنے آؤ گی؟“ یوسف کی آواز سے اس کی بے قراری صاف ظاہر تھی۔

”یوسف! باتیں تو مجھے بھی تم سے بہت سی کرنی ہیں۔ تمہاری غیر موجودگی میں میں نے یہاں ایک ایک

لحہ سولی پر لٹک کر گزارا ہے۔ ہم اسی ریسٹورنٹ میں ملیں گے جہاں پر ملا کرتے تھے۔“ ابھی وہ اس سے

مزید باتیں کرنی کہ انابی کمرے میں داخل ہو گئیں۔

”میں تمہیں بعد میں فون کرتی ہوں۔“ انابی کو دیکھ کر سونیائے جلدی سے فون کر ڈیل پر رکھ دیا اور

پہلے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

”اچھا قمر تم سونیا کے ساتھ بیٹھو۔ میں ماما کو یاد دلانے آتی ہوں کہ انہیں کب بھی کاٹنا ہے۔“ زوناب یہ کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی جبکہ سونیا اپنی دلی کیفیت کو چھپانے قمر سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔



انابی کی طرف متوجہ ہوگئی۔

”سونیا! نیچے احزم تم سے ملنے آیا ہے۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے۔ تم جلدی سے وہاں پہنچو! تنے میں ملازمہ کے ساتھ مل کر چائے وغیرہ کا اہتمام کر لینی ہوں۔“ انابی اسے یہ خبر سنا کر کمرے سے نکل چلی تھیں اور سونیا کے چہرے پر یوسف سے ملنے کی خوشی کا جورنگ چڑھا تھا وہ احزم کے ملنے آنے کی خبر سن کر ماند پڑ گیا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی تو احزم اسی کا منتظر تھا۔ اس کے ہاتھ میں پھولوں کا بکے تھا۔ سونیا اس کے قریب آئی تو اس نے وہ بکے ایک دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ اسے تھما دیئے سونیا نے کوئی بھی تاثر دیئے بنا تھام لیا اور پھر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تو وہ دونوں بالکل خاموش بیٹھے رہے پھر احزم نے ہی بات کی شروعات کی۔

”سونیا! یہ ہماری پہلی ملاقات ہے اس لیے میرے پاس کرنے کے لیے کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میں آپ کے لیے بالکل انجان ہوں اور آپ میرے لیے۔ ہمارے والدین نہیں شادی کے بندھن میں باندھنا چاہتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شادی زبردستی کا سودا نہیں ہونی۔ شادی دو رحوں کا ملاپ ہوتا ہے۔ میرے دماغ میں بس آئیڈیل بیوی کا یہی تصور ہے کہ وہ تن من سے صرف میری ہو۔ اس کی زندگی میں مجھ سے پہلے کوئی نہ ہو۔ وہ میری باتوں کو سمجھے مجھے سمجھے اور ہاں میں غصے کا بہت تیز ہوں۔ وہ کوئی ایسی حرکت نہ کرے جس پر مجھے غصہ آجائے۔“

احزم نے ہنستے ہوئے کہا لیکن سونیا کا چہرہ کسی بھی تاثر سے بالکل عاری تھا۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ احزم کو اس کے رویے سے کافی الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں انابی اس کے لیے

چائے کے ساتھ ضروری لوازمات لے آئی تھیں۔ انابی کے کمرے میں آتے ہی سونیا کھڑی ہوگئی۔

”سوری احزم! میں آپ کو مزید کمپنی نہیں دے پاؤں گی۔ اس وقت مجھے بہت ضروری کام سے باہر جانا ہے۔“ سونیا نے احزم سے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا اور کمرے سے نکل گئی جبکہ انابی اور احزم اسے دیکھتے رہ گئے۔

”اس کا مطلب ہے میں بالکل ٹھیک سوچ رہا تھا۔ کاشف انگل نے سونیا پر زبردستی دباؤ ڈال کر اسے اس رشتے کے لیے راضی کیا ہے۔“ وہ اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ انابی نے اس کی طرف چائے کا کپ بڑھایا۔

”نہیں آئی! اب! میں چلوں گا۔ اس وقت مجھے اجازت دیں۔ میں پھر کسی وقت حاضر ہوں گا۔“ احزم نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”لیکن بیٹا! چائے تو پیتے جاؤ۔“ انابی بھی سونیا کے اس طرح چلے جانے پر کافی شرمندگی محسوس کر رہی تھیں اس لیے انہوں نے بھی اسے روکنے کے لیے زیادہ اصرار نہیں کیا اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔



یوسف کب سے ریستورنٹ میں بیٹھا کبھی دروازے کو اور کبھی اپنی گھڑی کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اچانک دروازے سے اسے ایک پری چہرہ اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوتے ہی اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ سونیا اب اس کے سامنے والی کرسی سے اٹھ چکی تھی۔

”میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں اتنی دیر کہاں لگا دی؟ شاید تم جانتی نہیں ہو کہ انتظار کے لمحات کتنے طویل اور تکلیف دہ محسوس ہوتے ہیں۔ انتظار اسی کا کیا جاتا ہے جس نے کوئی امید دلائی ہو۔“

امید وہی دلاتا ہے جو آپ کو اپنا سمجھتا ہو۔ اپنا اسی کو سمجھا جاتا ہے جس کے لیے دل میں نیک خیالات ہوں۔ نیک خیالات ان کے لیے ہوتے ہیں جس سے محبت ہو۔ محبت ان سے ہوتی ہے جن کو کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے اور جن کو تکلیف دینی ہوئی ہے ان کو انتظار کرایا جاتا ہے۔“ یوسف نے مصنوعی خطائی سے کہا۔

”بس اتنے سے انتظار میں تھک گئے اور تم نے جو مجھے پورے ایک مہینے کا انتظار کرایا ہے وہ کسی کتنی میں نہیں آتا؟“ سونیا نے شکوہ آمیز لہجے میں کہا۔

”اچھا تو تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ یہ انتظار تم نے اکیلے کیا ہے؟ جی نہیں مس سونیا کاشف! یہ ایک مہینہ گزرنے کا انتظار میں نے بھی اتنی ہی شدت سے کیا ہے جتنا کہ تم نے۔“ یوسف نے بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا کہ تو سونیا شرم سے نظریں جھکائی۔

”یوسف! کیا تمہارے دہی سے واپس آنے کے بعد تمہارے پاپا نے تم سے کوئی بات کی ہے؟“ سونیا نے کھوجتی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کل رات جب میں آیا تھا جب ہی ان سے ملاقات ہوئی تھی اور صرف برنس کے متعلق باتیں ہوئی تھیں۔ صبح جب میں جاگا تو پاپا آفس جا چکے تھے۔ خیریت تو ہے؟ تم کچھ پریشان لگ رہی ہو۔“ یوسف نے اس کے پریشان چہرے کو بغور دیکھ کر کہا۔

”نہیں یوسف! خیریت ہی تو نہیں ہے۔ تم جانتے نہیں ہو اس ایک ماہ میں اتنے خوفناک انکشافات سامنے آئے ہیں کہ میں تو دہل کر رہ گئی ہوں۔“ سونیا نے اپنے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب! میں سمجھا نہیں۔ کیسے انکشافات؟ کھل کر بتاؤ۔“ یوسف نے پریشانی سے پوچھا۔

”یوسف! تمہارے پاپا اور میرے پاپا یونیورسٹی کے زمانے کے بہت جگہری دوست ہیں اور یہ بات مجھے ایک ہفتے پہلے ہی پتا چلی ہے۔“ سونیا نے پہلا دھماکا کیا۔ یہ خبر سن کر تو یوسف کچھ دیر کے لیے سنائے میں آ گیا پھر بے ساختہ مسکراتا ہی چلا گیا۔ سونیا اس کی مسکراہٹ کی وجہ جانتی تھی لیکن ابھی دوسرا دھماکا باقی تھا سو فوراً بولی۔

”مسکراؤ جی بھر کر مسکرا لو۔ ابھی جو دوسرا دھماکا میں کروں گی تو وہ نا صرف تمہارے چہرے سے مسکراہٹ غائب کر دے گا بلکہ تمہارے ہوش بھی اڑا دے گا۔“ سونیا یوسف کو مسکراتا دیکھ کر بخیریدگی سے بولی تو یوسف کی مسکراہٹ فوراً ماند پڑ گئی۔ اب وہ پوری بخیریدگی سے اس کی طرف متوجہ تھا۔ سونیا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے یہ خبر کیسے سنائے۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی تھیں تذبذب کے عالم میں اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی لیکن الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ کافی دیر بعد وہ اپنی تمام تر ہمت جمع کر کے دوبارہ گویا ہوئی۔

”یوسف! تمہارے بیٹھے تمہارے والدین نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔“ بہت مشکلوں سے اس کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے تھے۔

”کیا؟“ یوسف یہ کہتے ہوئے جھٹکے سے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ آس پاس کے لوگ یوسف کی اس حرکت پر اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”پلیز یوسف! اپنے آپ کو سنبھالو۔ بیٹھ جاؤ۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔“ سونیا نے دبی ہوئی آواز میں کہا تو یوسف کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ آس پاس کے لوگوں کو دیکھتا ہوا دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

”تمہارے پاپا نے اپنے یونیورسٹی کے زمانے کے دوست کی بیٹی سے تمہارا رشتہ طے کیا ہے۔“ سونیا

نے اسے باقی کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔  
”ایسا نہیں ہو سکتا۔ پایا ایسا نہیں کر سکتے، میں خود پایا سے بات کروں گا۔“ یوسف انتہائی پریشانی کے عالم میں بولا۔

”یوسف! یہ براہِ علم صرف تمہارے ساتھ نہیں ہے بلکہ میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ میرے پاپا نے بھی اپنے ایک یونیورسٹی کے زمانے کے دوست کے بیٹے سے میرا رشتہ طے کر دیا ہے۔“ سونیا کے اس انکشافات پر یوسف لرز کر رہ گیا تھا۔

”یوسف! یہ سارے دوست اتنے عرصے بعد ملے ہیں اور اگر ہم اس رشتے سے انکار کرتے ہیں تو اس سے ان کی دوستی پر بھی فرق پڑے گا۔ تم تو جانتے ہو میرے پاپا کو وہ میرے انکار کو کوئی اہمیت نہیں دیں گے۔ بہت مشکل وقت ہے۔ میں تو سوچ سوچ کر پریشان ہو گئی ہوں کہ ہم آخر کیا کریں کہ ہمارے رشتے بھی ٹوٹ جائیں اور ان دوستوں کی دوستی پر بھی کوئی فرق نہ پڑے۔“ سونیا اپنی بات ختم کر کے رکی اور یوسف کے چہرے کا جائزہ لینے لگی جو کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ سونیا کو اس کی خاموشی کھٹک رہی تھی۔

”یہی کہ میں براہِ راست اس لڑکی سے مل کر انکار کر دوں گا اور انکار کی وجہ بھی بتا دوں گا۔“ یوسف نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”یوسف! میں لڑکی سے مل چکی ہوں۔ زوناب بہت اچھی لڑکی ہے۔ اگر تم اس طرح سے جا کر اسے رد کر دو گے تو اسے کتنی تکلیف ہوگی؟ ٹھکرائے جانے کا احساس ہر لڑکی کے لیے تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔“ سونیا کا انداز سمجھانے والا تھا۔

”تو تم کیا چاہتی ہو؟ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا

رہوں۔ یقیناً زوناب ابھی لڑکی ہوگی لیکن میں اپنی محبت کو اس پر قربان نہیں کر سکتا۔ بس اب میرے پاس یہی ایک راستہ ہے کہ میں اسے سب کچھ بتا دوں۔“ یوسف نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

”یوسف! جلد بازی سے کام نہ لو۔ ہمیں ایسا نہ ہو کہ معاملہ بگڑ جائے۔“ سونیا نے تشویش ظاہر کی۔  
”سونیا! اب معاملہ سلجھے یا بگڑے لیکن میں اس لڑکی کو سب کچھ بتا دوں گا اور اگر پھر بھی ہمارے والدین ہماری شادی کے لیے راضی نہ ہوں تو ہم کوئی انتہائی قدم اٹھالیں گے۔“ سونیا یوسف کا یہ فیصلہ سن کر کانپ سی گئی تھی۔

”یوسف! یہ سب اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔“ سونیا نے احتجاج کیا۔

”سونیا! تم مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ تم مجھ پر بھروسہ کرتی ہو یا نہیں؟“ یوسف نے میز پر رکھے اس کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے پیار سے پوچھا تو سونیا نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تو بس پھر تم مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں کچھ غلط نہیں ہونے دوں گا۔“ یوسف نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا تو سونیا کچھ مطمئن ہو گئی۔

✽ ✽ ✽

آج صبح ہی رابعہ بیگم کی بہن عذرا کو فون آیا تھا۔ انہوں نے پورے گھر کو دوپہر کے کھانے پر بلایا تھا۔ انہوں نے یہ دعوت خاص نعمان اور فریحہ کے آنے کی خوشی میں کی تھی۔ زوناب کو جب اس دعوت کی خبر ہوئی تو فوراً اس نے ایک منصوبہ بنا ڈالا۔ اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر جانے سے انکار کر دیا۔ رابعہ بیگم تو اپنی بہن کو فون پر منع کرنے جا رہی تھیں لیکن زوناب نے انہیں بڑی مشکلوں سے روکا اور سب کو دعوت پر جانے کے لیے راضی کر لیا۔ رابعہ بیگم اور سعود زیدی

جاتے وقت اسے بڑی تاکید کر کے گئے تھے۔ زوناب نے اپنے اکیلے ہو جانے کی وجہ سے عمر اور عیسر کو اپنے ساتھ ہی روک لیا تھا۔ ان لوگوں کے گھر سے جاتے ہی وہ بدر کے سر ہو گئی کہ وہ یوسف کو فون کرے۔

”زوناب بی بی! اگر میں نے آپ کا ساتھ دیا تو میرا اس گھر سے دانہ پانی اٹھ جائے گا۔“ بدر نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔  
”اگر نہیں دو گے تب بھی تمہارا اس گھر سے دانہ پانی اٹھ جائے گا۔“ زوناب نے اسے دھمکاتے ہوئے کہا۔

”آگے کتناں پیچھے کھائی۔ ان کا ساتھ دوں تو بھی پھنسنوں اور نہ دوں تو بھی پھنسنوں۔ یا اللہ! مجھے ان شیطانوں کے شر سے بچا۔“ بدر نے ہاتھ اٹھا کر رونے والے انداز میں کہا تو زوناب نے ایک گھونسا اس کی پیٹھ پر جڑ دیا۔

”بدر بھائی! آپ ان شیطانوں کی اسٹ میں ہمیں بالکل شامل نہ کریں۔ ہم تو بالکل معصوم ہیں۔ اب شیطان کے ساتھ رہتے ہیں تو تھوڑا اثر تو آئے گا۔“ عمر نے احتجاج کرتے ہوئے میز پر غصے سے زوناب کو دیکھا جو خونخوار نظروں سے عمر کو گھور رہی تھی۔

”تم لوگ فضول کی باتیں کر کے میرا وقت برباد کر رہے ہو۔ وہ لوگ جلدی آجائیں گے اور مجھے جو بھی کرنا ہے ان کے آنے سے پہلے کرنا ہے۔ بدریہ لو فون نمبر اور ابھی یوسف کو فون کر دو اور ہاں فون پر اپنا نام نہ بتا دینا اور جب یوسف کے ہاتھ میں ریسیور آجائے تو پھر فون مجھے دے دینا میں خود بات کروں گی۔ بس یہی کرنا ہے تمہیں۔“ زوناب نے چلا کر کہا۔

”اچھا اچھا! سمجھ گیا۔ میں بہرہ نہیں ہوں جو آپ اتنی زور سے چلا رہی ہیں۔“ بدر نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال کر سہلاتے ہوئے کہا۔

”اب جلدی فون کرو۔“ مجھے اپنا حلیہ بھی بدلنا ہے۔“ زوناب اسے کھینچتے ہوئے فون کے قریب لے گئی تھی۔

یوسف میسر پر بے چینی سے ٹپل رہا تھا۔ رات ہی پاپا نے اس سے رشتے کی بات کی تھی۔ وہ اس وقت اتنے خوش تھے کہ اسے اس وقت انکار کرنا مناسب نہیں لگا۔ وہ پچھلے دو گھنٹے سے انکار کی تدبیر سوچ رہا تھا مگر اسے صرف ایک ہی راستہ نظر آ رہا تھا کہ وہ زوناب سے بات کر لے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ فون کی بیل بجنے پر فوراً کمرے میں چلا آیا۔ ریسیور پر یوسف کی آواز ابھری تو بدر نے ٹھوڑی بارعب آواز میں کہا۔

”جی میں وقار بات کر رہا ہوں مجھے یوسف صاحب سے بات کرنی ہے۔“

”جی میں یوسف بول رہا ہوں لیکن میں تو کسی وقار کو نہیں جانتا۔“ یوسف نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ یہ سنتے ہی بدر نے جلدی سے ریسیور پاس پیچھی زوناب کو تھما دیا۔

”ہیلو یوسف! میں زوناب بات کر رہی ہوں۔ وہ دراصل مجھے پتہ نہیں تھا کہ یہ آپ کے بندر دم کا نمبر ہے اس لیے میں نے احتیاطاً ایسا کیا۔ امید کر لی ہوں آپ نے مائنڈ نہیں کیا ہوگا۔“ زوناب نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

”جی میں نے بالکل مائنڈ نہیں کیا۔ کہنے آپ نے کیسے فون کیا؟“ یوسف نے بڑی عجیبگی سے پوچھا۔  
”یوسف! میں چاہتی تھی کہ اب ہم دونوں کا رشتہ طے ہو ہی گیا ہے تو کیوں نہ ایک ملاقات ہو جائے۔

میں ابھی اسی وقت آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ آدھے گھنٹے میں میرے گھر پہنچ سکتے ہیں؟“ زوناب نے مدعا بیان کیا۔

آپ کے ہمتا بھرے جذبات  
کدھی تلاش میں؟



## دومنز کارڈیل

جو ضعف رحم کو زائل کر کے استقرار حمل اور  
حفاظت جنین میں مدد دے۔

کثرت و بے قاعدگی ایام، استحضار، نفاس کی  
زیادتی، لیکوریاء، ان سے پیدا شدہ کمزوری  
اور درد کو کرا ازالہ کرے۔

اور  
آپ کے بھول سے بچنے کے لیے

## ہنی نباتی گرائپ واٹر

دانت لگانے کے زمانہ کی جملہ تکالیف، بد ہضمی، قبض،  
اسہال، دودھ لٹنے اور پیٹ درد کو زائل کر کے

آپ کے بچے کو دے آرام  
اور آپ خود رہیں پرسکون



طب اسلامی کا پرنسپل عالمی ایوارڈ یافتہ ادارہ

اشرف لیبارٹریز پرائیویٹ لمیٹڈ فیصل آباد

Tel: 041-8847601-2 Fax: 041-8847607 e-mail: info@ashraflabs.com www.ashraflabs.com

AL HAMRA

”اُدھے گھٹنے میں.....!“ یوسف نے کچھ سوچتے ہوئے اس کی بات دہرائی۔ ”اوکے! میں پہنچ رہا ہوں۔“ یوسف نے اطمینان سے کہا اور فون کر ٹیل پر رکھ کر وارڈ روم سے کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گیا۔ زوناب پوری طرح اپنا حلیہ بدل کر آئینے کے سامنے کھڑی اپنی نوک پلک درست کر رہی تھی جب ہی بدر کی کپکپائی آواز آئی۔

”زوناب بی بی! یہ آپ ٹھیک نہیں کر رہی ہیں۔ اگر بڑی بیگم کو پتا چل گیا تو وہ تہلکہ مچا دیں گی۔“ وہ رونے جیسی صورت بنائے اس کے سامنے کھڑا تھا جب کہ زوناب اس کی باتوں کو نظر انداز کیے اب تک آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔

دادی جان کا گرتا اور پا جاما اس کے بدن پر کافی ڈھلا تھا جیسے اس نے بڑی سی چادر اوڑھ کر چھپانے کی کوشش کی تھی۔ بالوں میں سفید پاؤں لگا گیا تھا تاکہ وہ سفید ہو جائیں۔ آنکھوں کے کنارے انڈے کی سفیدی لگا کر جھریاں پیدا کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ اس کے خوبصورت چہرے سے کہیں اس کی جوانی جھلک نہ پڑے۔ آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والا چشمہ لگا کر وہ واقعی کوئی ضعیف عورت لگ رہی تھی۔ ”اماں بی! آپ کی چھڑی۔“ عمر نے زوناب کی طرف چھڑی بڑھاتے ہوئے شرارت سے کہا۔

”یہ چھڑی کہاں سے آئی؟ اسے تو اس وقت دادی جان کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔“ زوناب نے حیرت سے چھڑی کو تھامتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں ہونا تو اسے اماں بی کے ساتھ ہی چاہئے تھا لیکن آپ کا بھتیجا کچھ ذہین واقع ہوا ہے اس لیے جب آپ نے اپنی پلاننگ ہمیں بتائی تو اماں بی کے کہنے پر میں نے یہ چھڑی گاڑی میں نہیں رکھی کیونکہ اماں بی کے کردار میں حقیقی رنگ بھرنے

میں یہ بہت اہم کردار ادا کرے گی۔“ عمر نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کڑتے ہوئے کہا۔ ”دیکھا بدر تم نے..... یہ بچے کچھ دن میرے ساتھ رہ کر کتنے ذہین ہو گئے ہیں اور ایک تم ہو کتنے عرصے سے میرے ساتھ ہو مگر آج تک کچھ نہیں سیکھا۔“ زوناب نے اس کی ٹانگ پر چھڑی رسید کرتے ہوئے کہا تو بدر اچھل پڑا۔

”مجھے تو معاف ہی رکھئے۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“ بدر نے برا سامنہ بنا کر کہا۔ ”آئی! یوسف بھائی آگئے۔“ عمر نے کمرے میں آ کر بتایا۔

”کیا! یوسف آگئے؟ اچھا تم لوگوں کو یاد تو ہے نا تم لوگوں کو کیا کرنا ہے؟“ زوناب نے سوالیہ نگاہوں سے ان تینوں کی طرف دیکھا تو ان تینوں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ”تم ابھی تک کسی بھلتی ہوئی بدروح کی طرح بیٹھیں کھڑے ہو۔ جاؤ یوسف صاحب کو ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔“ زوناب نے بدر کو کمرے میں کھڑا دیکھ کر ڈانٹا تو وہ فوراً کمرے سے نکل گیا۔ وہ جلدی ہے چادر کو سر پر جما کر چھڑی ہاتھ میں اٹھائے آگے بڑھی تھی۔

وہ ڈرائنگ روم میں آئی تو یوسف وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جھک کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب آ گئی۔ یوسف اس کے ادب میں جلدی سے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”السلام علیکم!“ یوسف نے جھک کر سلام کیا۔ ”آئے ولیکم السلام۔“ زوناب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”کیسے ہو مایاں؟“ زوناب دادی جان کو باتیں کرتے دیکھتی رہتی تھی ان ہی طرح پوچھا۔ ”جی اللہ کا شکر ہے“ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“



یوسف نے مسکرا کر بڑے ادب سے کہا۔

”کیا زوناب سے ملنے آئے ہو؟“ زوناب نے چشمہ ناک پر کھسکا کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ کچھ جھینپ سا گیا۔

”جی۔“ وہ سر اثبات میں بلاتا ہوا بولا۔

”دیکھو میاں! ہمارے یہاں لڑکا لڑکی شادی سے پہلے پون کھلم کھلا نہیں ملتے۔ یہ بڑی بے شرمی کی بات سمجھی جاتی ہے۔“ زوناب کی بات پر یوسف بڑبڑا سا گیا۔

”جی، لیکن.....“ یوسف نے کچھ کہنا چاہا کہ زوناب نے سچ میں سے ہی اس کی بات کاٹ دی۔

”چھوڑو میاں لیکن ویسے..... یہ جراثیم تو آج کل ہر نوجوان نسل میں پائے جاتے ہیں لیکن تمہاری معلومات کے لیے بتاؤں۔ زوناب اس وقت گھر پر نہیں ہے۔ وہ اپنی خالہ کے یہاں باقی گھر والوں کے ساتھ دعوت میں گئی ہوئی ہے۔“ زوناب نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر یوسف کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ یوسف کچھ بولتا وہ خود بول پڑی۔

”وہی زوناب بالکل مجھ میں ملتی ہے۔ تم نے مجھے دیکھا سمجھو زوناب کو دیکھ لیا۔ آخر دادی جو ہوں اس کی۔ بہت ملتی ہے مجھ میں۔ بس عادات و اخلاق میں مجھ پر نہیں گئی۔ بہت لڑکا ہے۔ ضدی ہوتی ہے کہ پوچھو مت۔ کیوں بچو؟“ اس نے مسکراتے ہوئے عمر اور عمیر کی طرف دیکھا جو اپنی آنٹی کی اداکاری سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ زوناب کے پوچھنے پر زور زور سے سر اثبات میں ہلانے لگے۔

”میاں! میں تو حیران ہوں کہ تم نے زوناب سے شادی کرنے کے لیے ہامی کیسے بھری؟“

یوسف خاموشی سے انہیں دیکھے چلا گیا تو وہ پھر

بولی۔

”ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی؟“ زوناب نے کہا۔

”آپ مجھے کچھ بتا رہی تھیں۔“ یوسف نے یاد دہانی کرائی۔

”ہاں میاں! میں یہ کہہ رہی تھی کہ ہے تو وہ میری پوتی لیکن اگر میں تمہیں اس کے بارے میں نہیں بتاؤں گی تو یہ تمہارے ساتھ زیادتی اور دھوکا ہوگا۔ ہر لڑکی کے ماں باپ چاہتے ہیں کہ اگر اس کی بیٹی میں عیب بھی ہوں تب بھی وہ اچھے گھر کی بہو بنے۔ اسی طرح میرے..... میرا مطلب ہے زوناب کے ماں باپ بھی اس کا گھر سنا سنا چاہتے ہیں۔“ زوناب نے مشکوک انداز میں کہا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ آپ مجھے زوناب کے بارے میں کیا بتانا چاہتی ہیں؟ پلیز صاف لفظوں میں کہئے۔“ زوناب کی باتوں نے یوسف کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔

”ہائے بھنا! کیا بتاؤں۔ میرا تو سوچ کر ہی کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ مگر تم سے بات چھپانا بھی تو غلط ہے۔“ زوناب نے سینہ پیٹتے ہوئے رونے والے انداز میں کہا۔ یوسف بہت ناز دانا کو دیکھ رہا تھا۔

”خیر اب تو تم اس کے شریک سفر بننے جا رہے ہو تو تمہیں بتا دیتی ہوں۔ میری پوتی پچھلے سات سال سے ہسٹریا کی مریضہ ہے۔ اصل میں یہ اس کی ماں کی خاندانی بیماری ہے۔ رابعہ کو بھی تھی۔ تو بہت بوجب اسے دورہ پڑتا تھا تو پورا گھر الٹ دیتی تھی۔ جو چیز ہاتھ میں آئی اٹھا کر مارتی تھی لیکن شادی کے پچیس تیس سال بعد یہ بیماری ٹھیک ہو گئی اور زوناب کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔ شادی کے پچیس تیس سال بعد وہ بھی ٹھیک ہو جائے گی۔ ہائے ہائے ان محسوس بچوں سے پوچھو جب زوناب کو دورہ

پڑتا ہے تو وہ کیا درگت بناتی ہے ان کی۔“ زوناب نے دکھ بھرے انداز میں عمر اور عمیر کو دیکھا۔

”جی یوسف بھائی! ابھی تو ہم ان کی پھینکی ہوئی چیزوں کو بیچ کر لیتے ہیں اور کبھی وہ چیزیں ہماری ٹانگ، کبھی پیٹ اور کبھی سر پر لگ جاتی ہیں۔“ عمیر نے اداکاری کرتے ہوئے باری باری ٹانگ، پیٹ اور سر کو پکڑا۔

”اور یہ ہمارے گھر کا ملازم ہے۔“ زوناب نے بدر کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس بے چارے کا حال بھی ان سے کچھ مختلف نہیں ہے۔“

”جی یوسف صاحب! ذرا کبھی ان کے موڈ کے خلاف بات ہو جائے تو وہ مجھے اپنے گھونٹوں سے دھنک کر رکھ دیتی ہیں۔“ بدر نے انتہائی مظلوم صورت بنا کر کہا اور یوسف ماتھے پر شکنیں سجائے باری باری ان کی باتیں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ حقیقت جاننے کے بعد اب وہ زوناب کا رشتہ آسانی سے ٹھکرا سکے گا۔ زوناب یوسف کے چہرے کے اتار چڑھاؤ بغور دیکھ رہی تھی سو زوناب بولی۔

”میاں! کہیں تم اپنا فیصلہ بدلنے کے بارے میں تو نہیں سوچ رہے۔ اگر ایسا سوچ رہے ہو تو یہ تو تمہارا حق ہے۔ اب کوئی جاننے بوجھتے تو کنوئیں میں پھلانگ نہیں لگائے گا۔“ زوناب انتہائی چالاکی سے بولی۔

”اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ فی الحال آپ مجھے اجازت دیں۔ میں اب اپنے والدین کے ساتھ ہی آؤں گا۔“ یوسف زوناب سے اجازت لے کر تیز قدموں سے وہاں سے چلا گیا اور زوناب اپنا پلان کامیاب ہو جانے پر خوشی سے ہنسنے لگی۔ بدر، عمر اور عمیر بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگے۔

✽ ✽ ✽

سونیا کے مسلسل روئے نے یہ بات تو احزم پر

صاف واضح کر دیتی تھی کہ وہ اس میں انٹرنل نہیں ہے۔ جب بھی کبھی احزم اسے اپنے ساتھ کہیں باہر چلنے یا زور وغیرہ کی آفر کرتا، سونیا بڑی سہولت سے انکار کر دیتی۔ ان سب باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے احزم نے آخر فیصلہ کر ہی لیا کہ وہ سونیا سے مل کر اس رشتے سے صاف انکار کر دے گا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کی شادی کسی سمجھوتے کی بنیاد پر ہو۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جو شادی سمجھوتے کی بنیاد پر ہوتی ہے وہ زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہتی۔ ٹوٹ جاتی ہے۔ احزم نے اپنے مام ڈیڈ کو بھی اپنے اس فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا تا کہ اچانک انہیں یہ خبر سن کر دھچکا نہ لگے۔ رضا علی میر احزم کا یہ فیصلہ سن کر تھوڑے عرصے میں ہوئے تھے لیکن وہ اپنے بیٹے کی خوشیوں کو اپنی دوستی کی جھینٹ بھی نہیں چڑھا سکتے تھے اس لیے انہوں نے اس معاملے میں خاموشی اختیار کر لی تھی۔

✽ ✽ ✽

”ارے میں پوچھتی ہوں اب کس چیز کا انتظار کر رہے ہو تم لوگ۔ لڑکا خیر سے دئی سکا گیا ہے تو بات آگے کیوں نہیں بڑھاتے؟ اس سے پہلے کہ تمہاری لاڈلی اپنا ارادہ بدل دے جلدی سے اس کی شادی کر دو۔“ نور جہاں بیگم نے ناشتے کی میز پر سب کو ساتھ دیکھ کر بات چھیڑ دی تھی۔

”اماں جان! آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ زوناب سمجھ دار بیٹی ہے۔ عباس تو باقاعدہ رشتہ لے کر آنا جا رہا ہے مگر سچ بتاؤں تو میں ہی اپنے آپ کو تیار نہیں کر پا رہا ہوں۔ زوناب چلی جائے گی تو گھر میں بالکل سناٹا ہو جائے گا۔ اسے اتنی محبتوں سے بالا ہے۔ اب اسے اپنے آپ سے دور کرنا بہت مشکل لگ رہا ہے۔“ سعوزیدی نے اداس لہجے میں کہا۔

”تو کیا بیٹی کو گھر بٹھا کر رکھو گے؟“ نور جہاں بیگم

نے حیرانی سے پوچھا تو سعود زیدی مسکرا دیئے۔

”میں نے ایسا کب کہا؟“

”تم نے ایسا نہیں کیا مگر تمہاری باتوں کا مطلب تو یہی ہے۔ تب ہی کہتی تھی بیٹی سے اتنا لاؤ نہ کرو اب بھگتو۔ میرا فرض تھا سمجھانا، عمل کرنا نہ کرنا تمہاری مرضی۔ اس گھر کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔“ نور جہاں بیگم خفا ہوئی ہوئی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور چھڑی کے سہارے ہستہ ہستہ چلتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔ رابعہ بیگم شوہر پر ایک نظر ڈال کر ساس کو منانے فوراً ہی ان کے پیچھے نکلیں۔

”پاپا! دادی جان ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہماری محبتیں اپنی جگہ ایک نہ ایک دن تو زوناب کو اپنے گھر جانا ہی ہے۔ آپ کب تک اسے گھر بٹھا کر رکھیں گے۔ آپ عباس انکل سے بات کریں کہ وہ جلد از جلد اپنی امانت لے جائیں۔“ نعمان نے پاپا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں آج ہی عباس سے بات کروں گا۔“ سعود زیدی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور آفس جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

✦ ✦ ✦ ✦ ✦

دن کے بارہ بجتے کو آئے تھے لیکن زوناب تھی کہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ مجبوراً رابعہ بیگم کو اسے جگانے کے لیے اس کے کمرے میں آنا پڑا۔

”زوناب! اب اٹھ بھی جاؤ۔ دیکھو کتنا دن چڑھ گیا ہے۔“ رابعہ بیگم نے اس کے اوپر سے مکمل چھینٹتے ہوئے کہا۔

”جی ماما! اٹھ رہی ہوں۔“ زوناب نے کسماسک کر روٹ بدلتے ہوئے کہا۔

”زوناب! اگر تمہاری دادی کو پتا چل گیا کہ تم ابھی تک سو رہی ہو تو وہ بہت خفا ہوں گی اور ویسے بھی اتنی دیر تک سونا اچھی بات نہیں ہے۔ اس سے صحت پر بھی

برا اثر پڑتا ہے۔“ رابعہ بیگم اس کے سر ہانے بیٹھی سمجھا رہی تھیں۔ ”تم جلدی سے فریش ہو جاؤ۔ میں تمہارا ناشتا نہیں بھجواؤتی ہوں۔ مجھے بہت کام ہے۔ آج یوسف کے والدین بھی آ رہے ہیں۔ شام تک مجھے سارے کام نہنانے ہیں۔“ رابعہ بیگم یہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں اور زوناب جو ابھی تک پوری طرح بیدار بھی نہیں ہوئی تھی یہ خبر سن کر بھونچکا رہ گئی۔ ابھی وہ اس کیفیت سے باہر نکل بھی نہیں پائی تھی کہ عمر اور عمیر دوڑتے ہوئے اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔

”آئی! روز امید ہم آ پہنچا ہے۔ یوسف بھائی اپنے والدین کے ساتھ آج تشریف فرما ہو رہے ہیں۔ اگر آج یوسف بھائی نے اماں بی کے سامنے ہمارا بھانڈا پھوڑ دیا تو ہم تو کسی کو شکل دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔“ عمیر نے شرمندگی سے اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو بچو! ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یوسف کے بتانے پر اگر دادی جان نے ہم سے پوچھ چکھ کی تو ہم صاف مکر جائیں گے۔“ زوناب نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ حالانکہ اسے خود بھی یہی خوف تھا کہ اگر یوسف نے دادی جان کو سب کچھ بتا دیا تو کیا ہوگا؟

”چلو عمر! ہم روز سیاہ منانے کی تیاری کرتے ہیں۔“ عمیر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”میرا تو خیال ہے کہ ہم واپس جانے کی تیاری کرتے ہیں۔ تم ازم میں تو اماں بی کی مار برداشت نہیں کر سکتا۔ میں ابھی پاپا سے بات کرتا ہوں کہ وہ ہمیں واپسی کے ٹکٹ لادیں۔“ عمر یہ کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ عمیر بھی اس کے پیچھے کمرے سے چلا گیا اور زوناب انہیں روکتی ہی رہ گئی۔

آخر وہ مشکل گھڑی آ ہی پہنچی جب اسے یوسف سمیت دادی جان کا بھی سامنا کرنا تھا۔ وہ رانگ روم کے باہر کھڑی اندر کے ماحول کا جائزہ لے رہی تھی۔ بظاہر تو اسے ماحول کافی خوشگوار نظر آ رہا تھا لیکن ایک انجانا خوف اس پر حاوی تھا۔ اس نے اطمینان سے ایک گہرا سانس خارج کیا اور اندر جانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ رابعہ کی نظر زوناب پر پڑ گئی۔ انہوں نے اسے آنکھوں کے اشارے سے اندر آنے کے لیے کہا تو مجبوراً وہ اپنے وجود کو گھٹیت ہوئی اندر داخل ہوئی۔

”ارے زوناب! آؤ۔“ یوسف کی امی نے اسے دیکھتے ہی اپنے پاس بلا لیا۔ وہ یوسف پر ایک نظر ڈال کر ان کے برابر بیٹھ گئی۔ یوسف اب بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”مل تو میں تم سے پہلے بھی چکی ہوں مگر آج خاص طور سے تم سے ملنے آئی ہوں۔“ سعود بھائی نے کافی انتظار کرایا ہے ہمیں۔“ یوسف کی امی نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ زوناب کی کیفیت اس وقت ایسی تھی کہ نہ وہ مسکرا سکتی تھی اور نہ روکتی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ ہمیں ان بچوں کو تھوڑا نام و دینا چاہئے کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے پہلی بار مل رہے ہیں۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ ہم لوگوں کی موجودگی میں یہ لوگ بات کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کریں۔“ سعود زیدی نے بیٹی کی پریشانی بھانپ لی تھی۔ سو یہ تجویز سب کے سامنے رکھی جو سب ہی کو پسند آئی۔

”زوناب! تم یوسف کو باہر لان میں لے جاؤ۔“ رابعہ بیگم نے زوناب کی گھبراہٹ دیکھتے ہوئے کہا تو وہ فوراً ”جی“ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ یوسف کو بھی اس کی تائید میں اٹھنا پڑا۔ وہ تیز حیرت قدموں سے چلتی ہوئی باہر لان میں آ گئی تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ

یوسف اس کے ساتھ ہے۔ وہ شرمندگی کی وجہ سے اس کا سامنا کرنے سے کتر رہی تھی۔ یوسف اس کی کیفیت کو سمجھتا ہوا اس کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔

”زوناب! اس دن میں آپ کے کہنے پر آپ کے گھر آیا تھا۔ آپ تو نہ ملیں البتہ آپ کی دادی سے ملاقات ضرور ہوئی۔ انہوں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ بتایا اور یہ بھی بتایا کہ آپ ہسٹریا کی مریضہ ہیں۔ ویسے آپ کو دیکھ کر ایسا لگتا تو نہیں ہے کہ آپ ہسٹریا کی مریضہ ہیں۔“ یوسف نے انتہائی سنجیدگی سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”پلیز یوسف! میں شرمندہ ہوں۔ دراصل میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی اس لیے مجھے یہ ڈراما کرنا پڑا۔ آپ پلیز کسی سے کچھ مت کہنے گا۔ مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ دراصل عمر اور عمیر بہت خوفزدہ ہیں۔ وہ بھی میرے ساتھ اس ڈرامے میں شامل تھے۔ دادی جان تو مجھے نہیں چھوڑیں گی اور میرا ساتھ دینے کے جرم میں انہیں بھی نہیں بخشیں گی۔“ زوناب نے روہا کی آواز میں کہا۔

”ریلیکس زوناب! میں نے کسی سے کچھ بھی نہیں کہا ہے اور نہ میرا ایسا کوئی ارادہ ہے۔ ویسے اس دن آپ نے کمال کی اداکاری کی تھی۔ مجھے ذرا بھی شک نہیں ہوا کہ جو خاتون میرے سامنے بیٹھی ہیں وہ بوجھ نہیں جوان ہیں۔“ یوسف اب باقاعدہ مسکرا رہا تھا۔

”پتا کیسے چلتا۔ آخر میں نے اتنی محنت جو کی تھی۔“ زوناب نے بھی مسکراتے ہوئے فخر سے کہا۔

”زوناب! میں اس دن آپ سے ملنے آیا تھا تاکہ آپ سے مل کر ساری بات کلیئر کر دوں۔“ یوسف نے ایک گہری نظر زوناب کے چہرے پر ڈال کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔ زوناب کی پوری توجہ یوسف کے سر ایا پر مرکوز تھی۔ ”زوناب جو پچھ آپ چاہ رہی ہیں

وہی کچھ میں بھی چاہتا ہوں مگر فرق صرف اتنا ہے کہ آپ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتے اور میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔

یہ پہلا موقع تھا جب زوناب کو کسی نے اس طرح رد کیا تھا۔ برا تو اسے لگا تھا لیکن وہ مجھے یہی چاہتی تھی کہ لڑکا خود انکار کرے اور بالکل ویسا ہی ہوا تھا۔ کچھ لمحے توقف کے بعد وہ پھر زوناب سے مخاطب ہوا۔

”زوناب! آپ کو شکرا نے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں آپ کو اپنے قابل نہیں سمجھتا یا آپ میں کوئی کمی ہے بلکہ میں کسی اور لڑکی کو پسند کرتا ہوں اور اس کے علاوہ میں اپنی زندگی میں کسی دوسری لڑکی کو شامل کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ یوسف نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”تو پھر آپ اندر جا کر سب سے کہہ دیں کہ آپ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے اور جس سے شادی کرنا چاہتے ہیں اس کے بارے میں بھی بتادیں۔ اس طرح آپ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور میرا بھی۔“ زوناب یہ کہہ کر اندر جانے کے لیے مڑ گئی۔

”لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ یوسف نے بڑی بے بسی سے کہا تو زوناب چونک کر اس کی طرف پلٹی۔ ”کیوں نہیں کر سکتے؟“ وہ کمر پر ہاتھ رکھے اس سے پوچھ رہی تھی۔

”اگر میں انکار کرتا ہوں تو اس سے میرا کام تو بن جائے گا لیکن مجھے خوف ہے کہ اس سے آپ کے پاپا اور میرے پاپا کی دوستی میں فرق آ جائے گا۔“ یوسف نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

”یعنی آپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ رشتہ بھی نہ ہو اور دونوں دوستوں کی دوستی بھی قائم رہے۔ تھوڑا مشکل تو ہے لیکن ناممکن نہیں۔ اگر میں نے اپنے پاپا کو یہ بات بتائی تو وہ میرا ہی ساتھ دیں گے اور اگر آپ مجھے اس

لڑکی کے بارے میں تھوڑا بہت بتادیں تو میں پاپا سے اس کا بھی ذکر کر دوں گی۔ وہ انکل کو سمجھا دیں گے۔ ویسے کیا لڑکی آپ کے خاندان کی ہے؟“ زوناب نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

”نہیں خاندان کی تو نہیں ہے۔ کاشف انکل کی بیٹی ہے۔ سونیا۔“ یوسف نے مسکرا کر کہا۔

”اُوہ تو وہ سونیا ہے جو آپ کے دل پر راج کر رہی ہے۔ آپ کے انتخاب کی تو داد دینی پڑے گی۔“ زوناب نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھ کر کہا۔

”پلیز زوناب! کوئی ایسی صورت نکالو کہ میں اور سونیا اپنے گھر والوں کی مرضی سے ایک دوسرے کے ہو جائیں اور ان دوستوں کی دوستیاں بھی قائم رہیں۔“ یوسف کے لہجے میں التجا تھی۔

”آپ فکر نہ کریں۔ میں کچھ نہ کچھ تو کر ہی لوں گی۔ تھوڑی مشکل تو ہوگی لیکن کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی آج کل میرے پاس منصوبے بنانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے۔“ زوناب نے مسکرا کر کہا تو یوسف بھی مسکرا دیا۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر جب سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو زوناب پاپا کے کمرے میں چلی آئی۔ سعود زیدی کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے جبکہ رابعہ بیگم وارڈ روب میں کپڑے رکھ رہی تھیں۔ زوناب کو کمرے میں دیکھ کر دونوں ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”ماپا! پاپا! مجھے آپ لوگوں سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ زوناب نے پاپا کے برابر میں جگہ سنبھالتے ہوئے کہا۔

”کیا بات کرنی ہے؟“ رابعہ بیگم نے اس کے قریب آتے ہوئے پریشانی سے پوچھا۔

”وہ بات یہ ہے کہ میں یوسف سے شادی نہیں

کر سکتی۔“ زوناب نے اٹکتے ہوئے کہا تو سعود اور رابعہ زوناب کی اس بات پر اسے حیرانی سے دیکھنے لگے۔ ”اب یوسف میں کیا برائی ہے؟“ سعود زیدی کا لہجہ بہت نارمل تھا۔

”پاپا! برائی یہ ہے کہ وہ کسی اور لڑکی کو پسند کرتا ہے اور مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ تو کیا آپ زبردستی میری شادی یوسف سے کرالیں گے؟“ زوناب نے حقیقت بیان کی۔

”کیا!... یوسف کسی اور لڑکی کو پسند کرتا ہے تو اس نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی۔ اب بتا رہا ہے جب بات اتنی آگے بڑھ گئی۔ ان کے چہرے سے غصہ جھلک رہا تھا۔ رابعہ کی حالت بھی ان سے کچھ مختلف نہیں تھی۔

”پاپا! ابھی کون سی ہماری منگنی ہوگئی ہے۔ بات ابھی اتنی آگے نہیں بڑھی۔ وہ انکار کر کے آپ دونوں دوستوں کے درمیان خلیج پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے یہ ساری باتیں مجھے بتادیں۔ اگر وہ چپ رہتا تو یہ بھی تو دھوکا ہوتا۔“ زوناب نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا تو ان کے چہروں سے غصے کے تاثرات آہستہ آہستہ غائب ہونے لگے۔

”پاپا! اس وقت مجھے آپ کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔ یوسف، کاشف انکل کی بیٹی سونیا کو پسند کرتا ہے۔ آپ عباس انکل سے بات کریں اور انہیں ساری صورت حال سمجھائیں اور یہ بھی یقین دلائیں کہ میرا اور یوسف کا رشتہ نہ ہونے پر آپ دونوں کی دوستی پر کوئی فرق نہیں پڑے گا اور ان کو کاشف انکل کے گھر رشتہ بھیجے پر راضی کریں کیونکہ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو وہ دونوں کوئی انتہائی قدم اٹھالیں گے۔“ زوناب نے انہیں ساری تفصیل سمجھاتے ہوئے کہا۔ سعود زیدی زوناب کی باتیں سن کر گہری سوچ

میں ڈوب گئے تھے۔ ”پاپا! کیا سوچ رہے ہیں۔ آپ میری مدد کریں گے نا؟“ زوناب نے معصوم صورت بنا کر پوچھا۔

”زوناب! تم ہمیشہ مجھے کسی نہ کسی امتحان میں ڈال دیتی ہو۔ اب میں تمہاری مدد نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا۔“ سعود زیدی نے بیٹی کے گالوں کو پیار سے چھوتے ہوئے کہا تو زوناب نے ان کے ہاتھوں کو بے ساختہ چوم لیا۔

”یو! رگریٹ پاپا۔“ جی مجھے پتا ہے۔“ سعود زیدی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تو زوناب مسکرائی ہوئی ان کے سینے سے جا لگی۔

”لیکن سعود اماں جان!...“ رابعہ بیگم کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

”تم ان کی فکر نہ کرو۔ میں خود انہیں سنبھال لوں گا۔“ سعود زیدی نے انہیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ ”او کے پاپا! اب آپ لوگ آرام کریں کافی رات ہوگئی ہے۔“ زوناب یہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی اور سعود زیدی کتاب بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر کھڑک بیڈ پر نیم دراز ہو گئے۔

✧ ✧ ✧ ✧ ✧

”خیریت تو ہے سعود! تم نے فون پر فوراً مجھے اپنے آفس آئے کو کہا۔ سب ٹھیک تو ہے نا؟“ عباس جلیل نے ان کے آفس میں داخل ہوتے ہوئے گھبراہٹ سے پوچھا۔

”ہاں یار! سب خیر ہے۔“ سعود زیدی انہیں دیکھ کر اٹھ کر ان کی طرف چلے آئے تھے اور انہیں لیے ایک صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔

”بات ہے تو خاص اس لیے تمہیں اپنے آفس بلایا ہے۔ اگر گھر پر یہ بات کرتا تو بنگامی صورت حال



پیدا ہو سکتی تھی۔“ سعود زیدی نے مسکرا کر کہا۔  
 ”یار سعود! تم نے تو میرے ہاتھ پاؤں بھلا دیے ہیں۔ اب بک بھی دو کیا بات ہے؟“ عباس جلیل نے مصنوعی حلقی سے کہا۔  
 ”بک رہا ہوں۔ تم سانس تو لے لو۔“ سعود زیدی نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔  
 ”میں سانس لے رہا ہوں، تم بولو۔“ عباس جلیل نے بے چینی سے کہا۔  
 ”اچھا عباس! یہ بتاؤ کہ میری اور تمہاری دوستی کتنی گہری ہے؟“ سعود زیدی نے عباس جلیل کو جاچتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
 ”میں نہیں جانتا کہ تمہیں یہ سوال پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی لیکن اب تم نے پوچھا ہے تو میں تمہیں بتاؤں کہ ہماری دوستی سمندر کی گہرائی جتنی گہری ہے اور اگر ہم اس کی گہرائی تک اترنا چاہیں بھی تو نہیں اتر سکتے۔“ عباس جلیل نے بڑے فخر سے جواب دیا۔  
 ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو بات میں کہنے جا رہا ہوں وہ ہماری دوستی پر اثر انداز نہیں ہوگی۔“ سعود زیدی نے صوفیہ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اطمینان سے کہا۔  
 ”یار تو اتنی پہیلیاں کیوں بھجوا رہا ہے۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتا؟“ عباس جلیل نے ٹھنجلاتے ہوئے کہا۔  
 ”عباس! میں اپنی بیٹی کی شادی تمہارے بیٹے کے ساتھ نہیں کر سکتا۔“ سعود زیدی نے گواہ دھماکا کیا تھا۔  
 ”یہ کیا کہہ رہے ہو سعود! کیا کوئی کمی ہے میرے بیٹے میں؟ کیا وہ تمہیں پسند نہیں ہے؟“ عباس جلیل نے صدمے کی سی کیفیت میں پوچھا۔  
 ”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔ یقیناً تمہارا بیٹا لاکھوں

میں ایک ہے اور میرا داماد بننے کے لائق بھی ہے لیکن شاید میری بیٹی کے نصیب میں ہی وہ نہیں ہے۔“ سعود زیدی نے افسردہ لہجے میں کہا۔  
 ”کیا تمہاری بیٹی کسی اور کو..... اس سے پہلے کہ عباس جلیل اپنا جملہ پورا کرتے“ سعود زیدی نے سچ میں سے ہی ان کی بات کاٹ دی۔  
 ”نہیں میری بیٹی کسی کو پسند نہیں کرتی البتہ تمہارا بیٹا کسی کو پسند کرتا ہے۔“ سعود زیدی نے اطمینان سے کہا۔  
 ”کیا.....! یوسف کسی کو پسند کرتا ہے تو اس الو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“ عباس جلیل غصے سے بولے۔  
 ”عباس! دھیرج رکھو۔ جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں اسے دھیان سے سنو۔ دیکھو مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ تمہارا بیٹا میرا داماد نہیں بن سکتا لیکن اس سے زیادہ خوشی مجھے اس بات کی ہے کہ وہ کاشف کا داماد بنے گا۔“ عباس جلیل بڑی حیران نگاہوں سے سعود زیدی کو دیکھ رہے تھے۔  
 ہاں..... یوسف کاشف کی بیٹی سونیا کو پسند کرتا ہے اور میں نے یہی کہنے کے لیے تمہیں یہاں بلایا ہے کہ تم یوسف کا رشتہ لے کر کاشف کے پاس جاؤ اور میری طرف سے بے فکر رہو۔ جیسا کہ تم نے ابھی کہا کہ ہماری دوستی سمندر کی گہرائی جتنی گہری ہے یہ اپنی جگہ قائم رہے گی۔ ہم ان بچوں کی خوشیوں کو اپنی دوستی کی بھینٹ تو نہیں چڑھا سکتے نا۔“ سعود زیدی نے بڑے تحمل سے انہیں سمجھایا تو عباس جلیل بھینکتی آنکھوں کے ساتھ ان کے گلے لگ گئے۔  
 ”بس بس اب اتنا زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ سعود زیدی نے انہیں اپنے آپ سے الگ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا تو وہ بھی مسکرا دیے۔

لیکن سعود اکاشف نے تو اپنی بیٹی کا رشتہ رضا کے بیٹے کے ساتھ طے کر دیا ہے پھر یوسف.....“ وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر سعود زیدی کی طرف دیکھنے لگے تھے۔  
 ”ابھی رشتہ طے نہیں ہوا ہے۔ رضا مجھے بتا رہا تھا کہ اگر احزم چاہے گا تو یہ رشتہ ہوگا۔ ویسے ان دونوں کا خیال ہے کہ ان کے بچے ان کی دوستی کا بھرم رہیں گے اور اس رشتے کو قبول کر لیں گے۔ اب کاشف کو تو تم جانتے ہو کتنے سخت مزاج کا ہے۔ اس کی بیٹی احتجاج کرے گی بھی تو وہ کہاں اس کی سننے والا ہے۔ اس لیے میں تو تم کو یہی مشورہ دوں گا کہ تم فوراً کاشف کے گھر رشتہ لے کر پہنچ جاؤ۔ رضا سے میں خود بات کر لوں گا۔“ سعود زیدی نے یقین دلانے والے لہجے میں کہا تو عباس جلیل کچھ مطمئن ہو گئے۔  
 ✧ ✧ ✧ ✧ ✧  
 سونیا لان میں تھی جب اسے انابی نے آ کر بتایا تھا کہ اس کے لیے احزم کا فون آیا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے احزم کا فون سننے کے لیے اندر آنا پڑا تھوڑی دیر بعد ہی احزم کو دوسری طرف سے ایک سریلی آواز سنائی دی۔  
 ”ہیلو سونیا“ میں احزم بول رہا ہوں۔ کیسی ہیں آپ؟“  
 ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ سونیا نے مختصر جواب دیا۔  
 ”سونیا! میں آج آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز انکار مت کیجئے گا۔“ احزم نے درخواست کرتے ہوئے کہا۔  
 ”اوکے! کہاں ملنے آتا ہے؟“ سونیا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”جگہ تعین آپ کریں گی یا میں کروں؟“ احزم نے سوال کیا۔  
 ”آپ ہی کر لیں۔“ دوسری طرف سے بڑی بے نیازی سے کہا گیا۔ پھر احزم نے سونیا کو ملاقات کی جگہ کے بارے میں بتا کر رابطہ منقطع کر دیا۔ احزم کی طرف سے رابطہ منقطع ہونے کے بعد سونیا نے جلدی سے یوسف کو فون کر کے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا اور اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ احزم سے کہاں ملنے جا رہی ہے۔ یوسف اور زوناب جو جو بچپنے دونوں سے سونیا اور احزم کا رشتہ توڑنے کی پلاننگ بنا رہے تھے اب یوسف نے اپنے منصوبے کو کوئی جامہ پہنانے کا پروگرام بنالیا تھا۔ سونیا کی طرف سے رابطہ منقطع ہونے کے بعد یوسف نے زوناب کو فون کر کے جو کچھ اسے سونیا نے بتایا تھا وہی کچھ زوناب کو بھی بتا دیا اور اپنے منصوبے سے بھی آگاہ کر دیا۔ سونیا جب ہوٹل پہنچی تو احزم وہاں پہلے سے موجود اس کا انتظار کر رہا تھا۔ سونیا آس پاس کا جائزہ لیتی ہوئی احزم کی ٹیبل کے قریب پہنچ گئی احزم نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ کرسی سے ہٹ کر بیٹھ گئی۔  
 ”آپ میرے بلانے پر یہاں آئیں اس کے لیے شکریہ۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“ احزم نے بغور سونیا کے چہرے پر نظر پڑ جاتے ہوئے کہا جو اس کی طرف ہی متوجہ تھی۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر اس سے مخاطب ہوا۔  
 ”سونیا! میں نے جو بات کرنے کے لیے آپ کو یہاں بلایا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے والدین چاہتے تھے کہ ہم شادی جیسے اثوٹ بندھن میں بندھ جائیں اور انہیں کافی حد تک یقین بھی تھا کہ ہم اس رشتے سے انکار نہیں کریں گے لیکن شادی زبردستی کا سودا نہیں ہے۔ آپ سے ملنے کے بعد مجھے ایسا لگا کہ

آپ کا جھکاؤ میری طرف نہیں ہے۔ شاید کاشف انکل نے آپ کو زبردستی اس رشتے کے لیے راضی کیا ہے۔ میں آپ کی پوزیشن سمجھ سکتا ہوں۔ آپ ایک لڑکی ہیں شاید اسی لیے انکار نہیں کر پائیں لیکن یہ حقیقت جاننے کے بعد کہ آپ مجھ میں انٹرنل نہیں ہیں میں آپ سے زبردستی شادی نہیں کر سکتا اور باپا یا اور کاشف انکل کی دوستی کا سوال تو وہ اتنی کمزور نہیں ہے کہ ذرا سی نہیں سے ٹوٹ جائے۔“

احزم تو اپنی بات ختم کر چکا تھا لیکن سونیا اب تک چیراں لگا ہوں سے اسے ایک ٹک دیکھتے ہی جاری تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ احزم کے اس فیصلے پر اس کا رد عمل کیسا ہونا چاہئے۔

”میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو کچھ نہیں کیا میں.....“ وہ اٹھی آگے کچھ کہتا کہ زوناب وہاں آدھمکی۔

”ہیلو احزم..... تم کب آئے جرمنی سے؟“ زوناب کے اس طرح مخاطب کرنے پر وہ اسے ہونفوں کی طرح دیکھنے لگا۔ سونیا زوناب سے تھوڑی ہی دور کھڑے یوسف کو دیکھ چکی تھی جو اسے دور سے ہی خاموش رہنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ سونیا کو یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہیں لگی کہ وہ دونوں یہاں پلاننگ سے آئے ہیں لیکن اب وہ انہیں کیسے سمجھائی کہ یہ سب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس لیے خاموش تماشائی بن بیٹھی رہی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا بھول گئے پچھلے سال ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ پھر تم مجھے بتائے بنا ہی جرمنی چلے گئے تھے۔ کچھ یاد آیا؟“ زوناب نے اس کی گھورنی نگاہوں کو دیکھ کر خفا ہوتے ہوئے کہا۔

”دیکھئے محترمہ! میں آپ کو بالکل نہیں جانتا اور آپ میرے بارے میں اتنا کیسے جانتی ہیں؟“ احزم نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

”احزم! تم کتنے بدل گئے ہو۔ اب تو تم یہ بھی کہو گے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے اور نہ ہی تم نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔“ زوناب نے رونی صورت بنا کر کہا۔

”جی ہاں بالکل! جب میں آپ کو جانتا ہی نہیں تو کیسی محبت اور کیسی شادی۔ کہیں آپ کسی پاگل خانے سے تو نہیں بھاگ کر آئیں؟“ احزم انتہائی سخت لہجے میں بولا۔

”ہاں! اب تو تم یہی کہو گے پاگل ہی تو تھی جو تم جیسے انسان سے محبت کر بیٹھی۔ تم پر اعتبار کر بیٹھی لیکن میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اتنے لمبے انتظار کے بعد تمہارا یہ روپ میرے سامنے آئے گا اور یہ لڑکی کون ہے؟“ زوناب نے سونیا کو بناوٹی زہر خند لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا نیا شکار.....؟ میری طرح اس کے ساتھ بھی ناٹم پاس کر رہے ہو یا.....“ زوناب ابھی اپنا جملہ مکمل کر بھی نہ پائی تھی کہ احزم غصے سے چلا اٹھا۔

”بہت ہو گیا محترمہ۔ اب اگر ایک اور لفظ اپنی زبان سے نکالا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ احزم غصے سے دھاڑا۔ ہٹل میں موجود تمام لوگ اب احزم کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ جبکہ زوناب کا تو یہ حال تھا کہ احزم کے غصے کو دیکھ کر خوف سے اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ اسے لگا کہ اب وہ تھوڑی دیر اور وہاں کی تو اس کی خیر نہیں۔

”تم سے برا تو کوئی ہو بھی نہیں سکتا۔ دھوکے باز جھوٹے فریبی کہیں کے۔“ زوناب یہ کہہ کر روٹی ہوئی وہاں سے چلی گئی تھی۔ سونیا نے دیکھا کہ زوناب کے پیچھے ہی یوسف بھی ہٹل سے نکل گیا تھا۔ احزم غصے کی حالت میں زوناب کے پیچھے لپکا ہی تھا کہ سونیا نے اسے روک لیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ زوناب اس وقت

یوسف کے ساتھ ہے اور اگر احزم اس کے پیچھے گیا تو جو گڑبڑ ابھی ہوئی ہے اس سے بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔

”احزم! میرا خیال ہے کہ اس وقت آپ کو گھر جانا چاہئے۔ کیا میں آپ کو ڈراپ کر دوں؟ آپ اس وقت کافی غصے میں ہیں اور اس حالت میں ڈرائیونگ کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“ سونیا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

”نہیں! میں خود چلا جاؤں گا۔“ لہجہ کافی اکھڑا ہوا تھا۔

”اوکے! پھر میں چلتی ہوں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔“ سونیا یہ کہہ کر وہاں سے چلی گئی اور احزم تنہی ہی دیر وہاں بیٹھا زوناب کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ لڑکی ہمیشہ میری زندگی میں طوفان برپا کر کے چلی جاتی ہے۔ اب کے ہاتھ آئی تو چھوڑ دوں گا نہیں۔“ احزم سوچتا ہوا وہاں سے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

گھر پہنچنے ہی سونیا نے شدید پریشانی کے عالم میں یوسف کو فون کیا۔ دوسری طرف سے دوسری ہی تیل میں فون اٹھایا جا چکا تھا۔

”ہیلو یوسف! میں سونیا بول رہی ہوں۔“

”میرے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ میں تمہیں اپنی پلاننگ بتاتا اور میرا خیال ہے کہ میری پلاننگ نے تمہیں اس مصیبت سے چھٹکارا دلادیا ہے۔“

یوسف نے اطمینان سے کہا۔

”تمہاری اس پلاننگ نے مجھے کسی مصیبت سے چھٹکارا نہیں دلایا بلکہ زوناب کو مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ یوسف! کم از کم ایک بار تو تم اپنی پلاننگ مجھ سے وٹکس کر لیتے۔ تم جانتے ہو احزم نے مجھے ہٹل کیوں بلایا تھا؟“ سونیا نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

”نہیں۔“ یوسف نے مختصر جواب دیا۔

”یوسف! احزم نے مجھے یہ کہنے کے لیے بلایا تھا کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا اور اگر تم نے تھوڑا انتظار کیا ہوتا تو تمہیں یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔“ سونیا کے لہجے میں افسوس تھا۔ دوسری طرف یوسف گوگو کیفیت میں بیٹھا سونیا کی باتیں سن رہا تھا۔

”یوسف! تم شاید جانتے نہیں ہو کہ احزم کے پاپا تمہارے اور زوناب کے پاپا کے بھی دوست ہیں۔ اب آگے تم خود سوچ سکتے ہو۔ زوناب نے آج جو کچھ احزم کے ساتھ کیا ہے اس کی وجہ سے احزم بہت غصے میں تھا۔ ابھی تو وہ مجھی زوناب کو نہیں جانتا اور جب اسے پتا چلے گا کہ وہ سعود انکل کی بیٹی ہے تب کیا ہوگا اور اگر احزم نے یہ بات سب کو بتادی تب تو اور بھی برا ہوگا۔“ سونیا نے نشوونما ظاہر کی۔

”پلیز سونیا! مجھے ڈراؤ مت۔ یہ باتیں تم مجھے پہلے بھی بتا سکتی تھیں۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ احزم کے پاپا میرے اور زوناب کے پاپا کے بھی دوست ہیں ورنہ میں ایسی پلاننگ کرتا ہی کیوں.....؟ خیر جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ میرا نہیں خیال کہ احزم زوناب اور میرے بارے میں جاننے کے بعد کسی کو کچھ بتائے گا۔ میرا خیال ہے ہمیں ابھی اس معاملے میں





کے اشارے پر اس کی نظر سونیا کے برابر میٹھے سر پہے پر جاگی۔ اگر ایسا اسے آواز نہ دیتیں تو وہ نہ جانے اور کتنی دیر شاگرد کی ہی کیفیت میں اسے دیکھ ہی جاتا۔

”احزم بیٹا! تم ٹھیک ہو؟“ ایمن نے اس کی حالت دیکھ کر فکر مند سی ہو چھا۔

”ہاں! مام! آئی ایم اوکے۔“ احزم یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ پھر وہ لمحہ بھی آگیا جب سونیا اور یوسف نے اپنے اپنے نام کی انگوٹھی ایک دوسرے کو پہنا دی۔

زونا اب ان کے پیاس سے اٹھ کر اپنا دوپٹا سنبھالتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی کہ سامنے سڑائی پٹی سے ٹکرائی اور اس تصادم کے نتیجے میں بچی کے ہاتھ میں جو کولڈ ڈرنک کا گلاس تھا وہ زونا کے کیڑوں پر گر گیا۔

”سوری آئی۔“ بچی نے اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی فوراً زونا سے معافی مانگی۔

”اے اوکے۔“ زونا نے اس بچی کی معصوم سی صورت دیکھ کر پیار سے کہا اور واٹس روم جانے کے لیے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

راہداری پار کرتے ہوئے وہ ایک کمرے کے آگے سے گزر رہی تھی کہ اچانک اس کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک انجانے وجود نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے میں گھسیٹ لیا۔ کمرے میں بالکل گھپ اندھیرا تھا۔ فوری طور پر تو زونا ب کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ اوپر سے اس وجود نے اسے اتنی مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اس سے چھڑا نہیں پار رہی تھی۔ پھر اچانک کمرے میں تیز روشنی ہو گئی۔ اس تیز روشنی میں وہ اپنے سامنے کھڑے وجود کو دیکھ کر کانپ سی گئی تھی۔ کچھ دیر تو وہ اسے ہولقوں کی طرح دیکھتی رہی۔ اسے اپنی جان بچانے کا صرف یہی ایک راستہ نظر آ رہا تھا کہ وہ کمرے سے بھاگ جائے اس لیے اس نے

اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا اور برق رفتاری سے کمرے سے نکلنا چاہا مگر احزم نے اس کے منصوبے کو ناکام بنادیا اور اسے بازوؤں سے پکڑ کر دیوار سے ٹکادیا اور اپنے دونوں ہاتھ دیوار سے اس طرح ٹکائے کہ اس کا وجود اس کے دونوں ہاتھوں کے حصار میں آ گیا۔

”کیوں مس زونا! یہی نام ہے نا تمہارا۔۔۔ تم کیا سمجھ رہی تھیں کہ میں تمہیں اتنی آسانی سے چھوڑ دوں گا۔ میں اپنا شکار اتنی آسانی سے نہیں چھوڑتا۔“

سعود انکل کا خیال نہ ہوتا تو تمہیں اسی وقت پولیس کے حوالے کر دیتا لیکن نہیں مجرم تو تم میری ہو اس لیے تمہیں سزا بھی میں ہی دوں گا؟“ احزم نے غصے سے دانت تیش کر کہا۔

”آپ میرے پاپا کو کیسے جانتے ہیں؟“ زونا نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

”میں آپ کے پاپا کو اس طرح جانتا ہوں کہ وہ میرے ڈیڈ رضا علی میر کے دوست ہیں۔“ احزم نے اس کے خوفزدہ لہجے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

”کک۔۔۔ کک۔۔۔ کیا آپ رضا انکل کے بیٹے ہیں؟“ زونا نے مشکل بھلاتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں! میں ان ہی کا بیٹا ہوں۔“ احزم نے اپنے چہرے پر ہلاکی سنجیدگی طاری کی ہوئی تھی۔ احساسِ ندامت سے آنسوؤں کے قطرے زونا کی آنکھوں میں موتیوں کی طرح جھللا رہے تھے۔ وہ اپنی صفائی میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

”اگر تم نے وہ ڈراما نہ کیا ہوتا تو آج سونیا کی مگنی یوسف کے بجائے مجھ سے ہو رہی ہوتی۔ صرف تمہاری وجہ سے میں اسے اپنی محبت کا یقین دلانے میں ناکام ہو گیا۔ اب تمہاری سزا یہی ہے کہ میں باہر

جا کر سب کو سب کچھ بتا دوں۔“ احزم بناوٹی غصہ چہرے پر سچائے باہر جانے کے لیے پلٹا تو زونا نے جلدی سے اس کا بازو تھام لیا۔

”پلیز احزم! صرف ایک چنگاری سب کچھ جلا کر رکھ کر دے گی۔ آپ میری غلطی کی سزا دوسروں کو نہیں دے سکتے۔ قصور وار میں ہوں اس لیے سزا بھی مجھے ملنی چاہئے۔ پلیز احزم! میری بات کا یقین کیجئے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں یہ بات نہیں جانتی تھی کہ سونیا کا رشتہ رضا انکل کے بیٹے سے طے ہوا ہے اور نہ ہی یہ بات مجھے یوسف نے بتائی تھی ورنہ میں ایسا کبھی نہیں کرتی۔“

سونیا اور یوسف ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور شادی کرنا چاہتے تھے اس لیے ان دونوں کو ملانے کے لیے میں نے یہ سب کیا۔ اب اگر آپ نے کسی کو کچھ بھی بتایا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ ان دوستوں کی دوستی کے ساتھ ساتھ سونیا اور یوسف کا رشتہ بھی ختم ہو جائے گا۔ پلیز ایسا مت کیجئے۔“ وہ سسک کر رو پڑی تھی۔ احزم سے اس کا روناد کچھ نہیں جا رہا تھا۔ وہ اسے چپ کرانا چاہتا تھا لیکن پھر ایک خیال سکتا ہے ہی رک گیا۔

”ٹھیک ہے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا لیکن اس لیے نہیں کہ مجھے تم پر ترس آ گیا ہے بلکہ اس لیے کہ قصور صرف تمہارا ہے تو سزا بھی تم ہی کو ملنی چاہئے اور تمہاری سزا یہ ہے کہ تم مجھ سے شادی کر کے یہ سزا بھگتو گی۔“ احزم نے زیر لب مسکرا کر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”کیا؟“ زونا نے بمشکل اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”میں اپنا پریوزل تمہارے گھر بھیجوں گا اور مجھے تمہارا جواب ہاں! میں چاہئے۔ نہ کہنے کی صورت میں تم جانتی ہو کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔“ احزم اسے دھمکا تا ہوا کمرے سے نکل گیا اور وہ احزم کا فیصلہ سن

کر اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔

✧ ✧ ✧ ✧ ✧

رضاعلی میر اور ایمن لان میں بیٹھے شام کی چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ احزم بھی وہاں چلا آیا۔

”مام! ڈیڈ! میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔“ احزم نے ان کے سامنے والی کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔

”ہاں کہو۔“ رضاعلی میر نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

”آپ لوگ چاہتے تھے نا کہ میں سعود انکل کی بیٹی سے شادی کر لوں؟ میں زونا سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ احزم نے ان کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”لیکن اس دن تو تم۔۔۔“

”جی مام! اس دن میں نے آپ لوگوں کے اس فیصلے پر بہت غور کیا اور بہت غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ لوگوں کا یہ فیصلہ غلط نہیں ہے۔“

احزم نے مام کی بات سنا کر اس سے کٹ کر مسکرا کر کہا۔

”احزم تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ مجھے تمہارے اس فیصلے سے کتنی خوشی ہوئی ہے۔ جیسے ہی سونیا اور یوسف کی شادی منٹ جائے گی، ہم سعود بھائی کے گھر تمہارے لیے زونا کو مانگنے چلے جائیں گے۔ کیوں رضا؟“ ایمن نے مسکرا کر رضاعلی میر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں! بالکل! جیسا تم کہو۔“ رضاعلی میر نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

”اوکے! اب میں چلتا ہوں۔ مجھے اپنے ایک دوست کے گھر جانا ہے۔“ احزم نے اجازت طلب لہجے میں کہا اجازت ملتے ہی وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا

وہاں سے چلا گیا۔

✠ ✠ ✠ ✠ ✠

سونیا اور یوسف کی شادی ہوئی تو عباس جلیل نے انہیں فوراً سنگاپور کے ککٹ لادے کہ وہ وہاں اپنی مومن منانے چلے جائیں۔ وہ دونوں اتنی جلدی جانا نہیں چاہتے تھے لیکن عباس جلیل کے کہنے پر انہیں مجبوراً جانا پڑا۔ سونیا اور یوسف کی شادی ہوتے ہی رضاعی میر اور اسٹن سعوزیدی کے گھر زوناب کا رشتہ لے کر پہنچ گئے جو انہوں نے باہمی مشورے اور زوناب کی رضامندی لینے کے بعد قبول کر لیا۔ رضاعی میر فوراً احزم اور زوناب کی شادی کرنا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے سعوزیدی کو صرف دو مہینے کا وقت دیا تھا شادی کی تیاریاں ”آشاندہ نور جہاں“ اور ”میر پبلش“ میں زور و شور سے جاری تھیں۔ اس رشتے پر سب ہی خوش تھے سوائے زوناب کے کیونکہ یہ بات تو صرف وہی جانتی تھی کہ دنیا کی نظر میں یہ ایک بدستہ ہوگا لیکن اس کے لیے یہ ایک سزا ہوگی جو اب اسے ساری عمر بھگتنی ہوگی۔ شادی کے دن قریب آئے تو قمر نے مستقل اس کے گھر پر ڈیرا جما لیا۔ زوناب کو ستانے کا کوئی موقع فریاد اور قہر تھا کہ جانے نہیں دیتی تھیں۔ مجبوراً وہ بھی کبھی مسکرا کر بھی شرمائے کی باتوں کا جواب دیتی اور جب بھی بہت تنگ ہو جاتی تو اپنی جان چھڑانے کے لیے مالکے کمرے کی راہ لیتی۔

دن پر لگا کر اڑے جا رہے تھے اور وہ سوچے جا رہی تھی کہ اب تک اسے صرف پیار ہی پیار ملا تھا اور اب اسے اپنے شریک سفر کی نفرت ہی ملے گی جو اسے بڑے صبر اور ضبط سے برداشت کرنی ہوگی لیکن کہیں نہ کہیں اسے یہ یقین ضرور تھا کہ وہ اس کی نفرت کو محبت میں بدل دے گی۔

وہ اپنے پورے ہوش رہا سن کے ساتھ دہن کے روپ میں نئی احزم کے برابر میں سر جھکائے بیٹھی

تھی۔ کیرہ مین اور مودی میکر ان خوبصورت لمحات کو اپنے کمروں اور مودی میں محفوظ کر رہے تھے۔ احزم نے اسے آج برائے ہوئے ہی اس کے قیامت خیز حسن کو دیکھا تھا مگر اس کے کزنز وغیرہ بھی وہیں موجود تھے جن کی شرارتی نظروں اور آوازوں سے جھینپ کر وہ اسے دل بھر کر دیکھ بھی نہیں پایا تھا۔

✠ ✠ ✠ ✠ ✠

اور پھر وہ لمحہ آ پہنچا جب اسے ان پیدار کرنے والی ہستیوں کو چھو کر پیا کے گھر جانا تھا۔ راجہ بیگم تو اتنی برداشت کے باوجود بیٹی کی رخصتی کے وقت اپنا ضبط کھو بیٹھی تھیں۔ نور جہاں بیگم اور سعوزیدی کا بھی یہی حال تھا وہ لوگ اسے اپنے آپ سے لپٹنے سے خوش رہنے کی ڈھیروں دعائیں دے رہے تھے۔ بمشکل ہی انہوں نے زوناب کو اپنی محبت کی جھاوٹ میں رخصت کیا۔ وہ رخصت ہو کر ”میر پبلش“ آئی تو وہاں اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ گھر آتے ہی احزم کی بہنوں اور کزنز نے اسے گھیر لیا جبکہ زوناب کو وہ لوگ پہلے ہی کمرے میں بٹھا آئی تھیں۔ بہت مشکلوں سے اسٹن نے احزم کی جان ان لوگوں سے چھڑائی اور اسے کمرے میں بھیج دیا۔

✠ ✠ ✠ ✠ ✠

دروازہ کھولتے ہی دل موہ لینے والی مہک کے ساتھ کمرے کا نظارہ دیکھ کر وہ بے ساختہ مسکرا اٹھا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو سانس پھولوں سے جے بیڑ پر زوناب کھل اڑھ نیم دراز تھی۔ وہ اس سے ایسے ہی روئے کی توقع کر رہا تھا ایک لمحے کے لیے اسے زوناب کے اس رد عمل پر بہت ہنسی آئی لیکن اس نے پھر جلدی سے اپنے چہرے پر غصہ طاری کر لیا۔ زوناب اس کی طرف پیٹھ کیے لیٹی ہوئی تھی۔ نیند تو اس کی آنکھوں سے کب کی روٹھ چکی تھی۔ احزم کے کمرے میں آنے سے پہلے وہ جاگ رہی تھی لیکن جیسے ہی اسے یہ محسوس ہوا کہ احزم کمرے میں آچکا ہے تو وہ سوتی بن گئی۔ احزم تیزی

سے چلتا ہوا زوناب کے قریب آ کھڑا ہوا۔ زوناب کی آنکھیں تو بند تھیں لیکن اس کے وجود سے سختی پر فہم کی خیر خوشبو نے اسے یہ احساس کرا دیا تھا کہ وہ اس کے بہت قریب کھڑا ہے۔ احزم نے جھٹکے سے کبل اس کے اوپر سے پٹا دیا تھا۔ احزم کی اس حرکت پر زوناب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی اور اسے سواہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”تم کیا بھیجتی ہو کہ میں تمہیں اتنے آرام و سکون کی نیند سونے دوں گا؟ اگر اس دن تم نے وہ ڈراما نہ کیا ہوتا تو آج تمہاری جگہ یہاں سونیا ہوتی۔ میری محبت ہوتی، میری چاہت ہوتی۔“ احزم نے انتہائی غصے سے اسے دیکھ کر کہا۔ احزم کو غصے میں دیکھ کر وہ بہم گئی تھی۔

”لیکن احزم! سونیا صرف یوسف سے پیار کرتی تھی تو پھر وہ آپ کو اپنے دل میں جگہ کیسے دیتی۔ اگر آپ کو یہ بات سونیا سے شادی کے بعد پتا چلتی تب آپ کیا کرتے؟ آپ مان کیوں نہیں لینے کہ آپ کی محبت یک طرفہ تھی۔“ زوناب نے بڑی ہمت سے اسے جواب دیا۔

”میں تمہارا لکچر سننے نہیں آیا ہوں۔ تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے میں تمہیں صرف اس کی سزا دینا چاہتا ہوں۔“ احزم کا لہجہ ذوق منی تھا۔ اس کی بات سن کر زوناب کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

”شادی کے بعد اکثر شوہر اپنی بیویوں کے ساتھ مار پیٹ کرتے ہیں۔ میرے خیال سے یہ طریقہ ٹھیک رہے گا۔“ احزم نے کچھ سوچتے ہوئے زوناب کو گھور کر کہا تو زوناب کا دل اچھل کر خرق میں آ گیا۔

”کیا آپ مجھ پر ہاتھ اٹھائیں گے؟“ زوناب نے جھٹکے سے بیڈ سے اٹھتے ہوئے روہائی آواز میں کہا۔

”اگر تمہیں ہاتھ اٹھانے پر اعتراض ہے تو میں ڈنڈا اٹھا لیتا ہوں۔“ احزم نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”کیوں زوناب! ابھی سے گھبرا گئیں۔ اب تو تمہیں اسے ساری زندگی بھیلنا ہے۔ تم نے کیا سوچا تھا کہ اسے اپنی محبت سے جت لوگی۔ تم اس کے دل میں کبھی بھی اپنی جگہ نہیں بنا سکتیں کیوں کہ سونیا ہی اس کی زندگی اس کی محبت اور شاید اس کی خواہش ہے۔ تم اس سے اتنی امیدیں کیوں وابستہ کر چلی ہو؟ اس نے تم سے شادی صرف تمہیں سزا دینے کے لیے کی ہے نہ کہ رشہ الفت بنانے کے لیے۔“ زوناب کو اندر سے کسی نے جھنجھوڑا تھا۔ وہ جو جھل قدموں سے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے صوفے پر جا گئی تھی۔ وہ بنا آنکھیں جھپکائے اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔

”تم مجھے ایسے دیکھ رہی ہو جیسے میں اس دنیا کی مخلوق ہی نہیں ہوں۔“ احزم شرارت سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”احزم! میں مانتی ہوں کہ میں قصور وار بھی ہوں

اور سزا کی منت بھی۔ یہاں آنے سے پہلے میں اپنے آپ کو ہر سزا کے لیے تیار کر کے آئی تھی لہذا اب آپ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ آپ مجھے سنا دیجئے۔“ زوناب نے چہرے کا رخ پھیر کر نارمل لہجے میں کہا لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ کہنے کے لیے اسے کتنی قیامتوں سے گزرنا پڑا تھا۔ وہ اس کے ساتھ رہ کر ہر سزا جھگٹنے کو تیار تھی لیکن شاید اسے ہی اس کا ساتھ گوارا نہیں تھا۔

”ہاں آج میں تمہیں اپنا فیصلہ سنا کر اس سزا سے رہائی دے دوں گا۔“ احزم نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ وہ ہنوز اس سے رخ پھیرے بیٹھی تھی۔ احزم نے ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کے کوئل چہرے کا رخ اپنی طرف کیا تو وہ حیران نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج میں تمہیں ساری حقیقت بتا دوں گا۔ کیا تم حقیقت جاننا چاہتی ہو؟“ احزم نے مسکرا کر اس کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے سوال کیا۔ زوناب کو اس وقت وہ شخص کسی پہیلی سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

”زوناب حقیقت کس بھی ہے کہ.....“

تم سے ملنے کے بعد  
حسرتیں چل اٹھیں  
ارماں توڑ اٹھے  
خوابیں جاگ اٹھیں  
تم سے ملنے کے بعد  
میرے دل کے ویراں  
اجڑے ہوئے گلشن میں  
ہزاروں پھول کھل اٹھے  
تم سے ملنے کے بعد  
میرے من کے بیاسے  
سوکھے صحرا میں

بادل برس اٹھے  
تم سے ملنے کے بعد  
”یہ کیا میں اتنا خوبصورت انکشاف کر رہا ہوں اور تم روری ہو؟“ احزم نے اس کی آنکھوں میں چمکتے آنسو دیکھ کر پریشانی سے کہا۔ آنسوؤں پر اس کا اختیار نہ تھا۔ وہ بے اختیار ہی اس کی آنکھوں سے جاری تھے۔ زوناب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس پر یقین کرے یا نہ کرے۔ کہیں وہ اس کے جذبات سے کھیل تو نہیں رہا؟ اس وقت کئی سوچوں نے اس کے دماغ میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ وہ اپنے ہونٹوں کو بے دردی سے اپنے دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔ احزم اس کے ہر عمل کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

”اس بے چارے پر اتنا ظلم مت کرو۔ تمہارا مجرم میں ہوں تو سزا بھی مجھے ملنی چاہئے۔“ احزم نے شرارت سے کہا لیکن دوسری طرف گہری خاموشی تھی۔ زوناب کا چہرہ تمام تاثرات سے خالی تھا۔

”زوناب! میں جانتا ہوں کہ تمہیں میری چاہت پر یقین نہیں آ رہا لیکن میں تمہیں اپنی چاہت کا یقین دلانا چاہتا ہوں۔ یہاں زوناب تمہاری ایک جھلک ہی مجھے تمہارا دیوانہ بنا گئی تھی جب تم مجھ سے گفتِ شاپ میں ٹکری لیں۔ تب ہی میں اپنا آپ بھائی تھا اور پھر جب تم نے ہونٹ میں وہ ڈر لیا کہ اب میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب تم میرے ہاتھ آئیں تو تمہیں چھوڑوں گا نہیں اور دیکھو میں اپنے فیصلے کا کتنا پکا ہوں۔ آج تم میرے ساتھ ہو۔ میری زندگی میں شامل ہو۔ سو نیا کی منگنی والے روز مجھے پتا چلا کہ تم سوچو اور نکل کی بیٹی ہو تب میں نے بھی ایک پلان بنا ڈالا۔ میں جانتا تھا کہ تم اتنی آسانی سے مجھ سے شادی کے لیے ہاں نہیں کرو گی اس لیے مجھے وہ ڈراما کر کے کھانا پڑا تا کہ تم ہاں کرو۔ آئی ایم سوری بٹ آئی ریگلی لو یو۔“ احزم نے محبت سے ہنر پور لہجے میں اس کی آنکھوں میں جھانک کر

کہا تو وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہو گئی۔

”ڈراما تو اب تمہی آپ بہت اچھا کر رہے ہیں۔“

آپ کیا سمجھتے ہیں میں آپ کی ان جھوٹی پڑ غریب باتوں میں آ جاؤں گی؟ سچ اور جھوٹ کا یہ کھیل اب آپ ختم کیوں نہیں کر دیتے؟ پہلا آپ نے مجھے دھماکا کر دیا جھوٹا رشتہ بنایا اور اب آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی اس جھوٹی محبت کا یقین کر کے ایک اور دھوکا کھاؤں؟ آپ کی ان باتوں پر یقین کر کے اپنی آنکھوں میں اپنے سچاؤں اور پھر آپ کے دل میں جو بدلے کا جذبہ پل رہا ہے اس کی تسکین کے لیے آپ میرے پسپوں کو چھینا پھڑ کر روں۔ نہیں احزم علی میرا! میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔“ وہ غصے سے تڑخ کر بولی۔

”تمہیں زوناب! تم غلط سوچ رہی ہو۔“ احزم کو اس سے اتنی تلخ گوفی کی امید نہیں تھی۔ احزم تڑپ کر اس کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔

”خدا کے لیے زوناب! میرا یقین کرو۔ میں صرف تمہیں ستارہ ہاتھ اور وہ سب مذاق تھا۔ میرا یقین کرو اس دن میں نے سو نیا کو بھی یہی کہنے کے لیے ہونٹ بلایا تھا کہ میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ میں اپنی بات اس سے کہہ چکا تھا جب تم وہاں پہنچیں اور حقیقت سے لاعلمی کی بنا پر تم نے وہ ڈراما انجام دیا۔ سو نیا کی منگنی والے روز ہی میں اسے ساری حقیقت سے آگاہ کر چکا تھا اس لیے میں نے اس سے مدد کی درخواست کی جو اس نے کافی دیر بحث کے بعد قبول کر لی۔ میں نے ہی اسے منع کیا تھا کہ وہ تمہیں یہ نہ بتائے کہ میں اس سے شادی سے پہلے ہی انکار کر چکا تھا۔ زوناب! میں نہیں جانتا کہ میری وضاحتیں تمہیں میری محبت کا یقین دلایا یا نہیں گی یا نہیں لیکن میرے دل میں آنکھوں میں پسپوں میں صرف تم ہو۔ میری محبت میری چاہت صرف تم ہو۔ زوناب میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔“

احزم یہ کہتا ہوا اسے حیران اور پریشان چھوڑ کر کمرے سے چلا گیا۔ ٹھوڑی دیر بعد جب وہ کمرے میں واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پورٹریٹ تھا۔

”پینٹنگ میرے بچپن کا شوق ہے۔ اس دن جب تم مجھ سے گفتِ شاپ میں ٹکرائی تھیں تو میں ایک لمحے کے لیے بھی تمہیں اپنے خیالوں اور تصور سے دور نہیں کر سکا تھا۔ تو تمہاری یہ پینٹنگ بنا ڈالی۔“ احزم نے پورٹریٹ اس کے ہاتھ میں چھماتے ہوئے کہا جسے اب وہ محویت سے دیکھ رہی تھی۔

”کیا میں اپنی زوجہ محترمہ کو اپنی محبت کا یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا ہوں؟“ احزم نے اس کی طرف جھک کر شرارت سے پوچھا۔

”بالکل نہیں۔“ زوناب نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے سنجیدگی سے پورٹریٹ اس کے ہاتھ میں چھماتے ہوئے کہا۔ ”محض اس پورٹریٹ کو دیکھ کر میں آپ کی محبت کا یقین کیسے کر لوں؟“ وہ اس سے رخ موڑ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”مجھے آپ کی محبت پر یقین نہیں ہے۔“ وہ بات بناتے ہوئے وہاں سے جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو احزم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ اسے اپنے نزدیک بٹھالیا۔

”لگتا ہے مجھے تمہیں اپنی محبت کا یقین دلانا ہی پڑے گا۔ بعد میں مجھ سے شکایت مت کرنا۔“ احزم نے اسے اپنی ہاتھوں میں بھرتے ہوئے شرارت سے کہا تو وہ شرم سے نظریں جھکا گئی۔ احزم نے اپنی محبت کی مہر اس کے ماتھے پر ثبت کی تو زوناب نے شرما کر اپنا چہرہ اس کے کشادہ سینے میں چھپا لیا۔ آج اسے شدت سے محسوس ہوا کہ واقعی اس سے ملنے کے بعد اس کی کھر دردی اور بے مزہ زندگی میں چپکے سے بہاؤ لگتی ہے۔





# بھگی پلکوں کی

اقر اصغر احمد

جھانک کر کے نہ اپنے کاندھوں پر بار کرنا  
محبتوں کو عبادتوں میں شمار کرنا  
قدم تمہارے سمندروں کو سمیٹ لیں گے  
کبھی محبت کے ایک دریا کو پار کرنا

واہ کی زرد راج، بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں اور پھر گویا گھر میں ایک طوفان سا اٹھ گیا تھا۔ اس کے حواس دادی کی چیخ سن کر منتشر ہوئے تھے، وہ ابھی مستحیل بھی نہ پائی تھی کہ باہر سے آتی آوازوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ حیرت و استعجاب میں ڈوبی ہوئی آوازیں اب قہقہوں و مسرتوں میں بدل گئی تھیں۔ وہ جو دادی کی چیخ سن کر خوف زدہ ہو گئی تھی اور کبھی شاید ڈاگو گھر میں کھس آئے ہیں۔ باہر سے ہنسنے، بولنے کی آوازیں سن کر تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ بال روم کی طرف بڑھی تھی۔ اندر باہر کی تمام باتیاں جل رہی تھیں۔ اس کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آدھی رات کو کون سے ایسے مہمان آ گئے تھے جن کے استقبال کو پورا گھر ہی بیدار ہو چکا تھا۔ ناصرف بیدار ہوا تھا بلکہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ بھی از حد فرما رہا تھا۔ کیا جا رہا تھا۔

”ارے کہیں تائی جان تو نہیں آگئیں اس لکڑی کے ساتھ.....؟“ اچانک ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن کو جھٹکا دے گیا اور وہ اندر جاتے جاتے بال روم کے اطراف میں بنی گیلری میں آگئی جہاں سے وہ اندر کا منظر بخوبی دیکھ سکتی تھی کیوں کہ دروازے کے اوپری حصے میں معمولی سا چھید تھا۔ اس کا جب بھی اجنبی مہمانوں کو دیکھنے کا ارادہ ہوتا تو وہ اپنا خفیہ ذریعہ استعمال کرتی تھی۔ اس نے اندر دیکھا تو معلوم ہوا کہ سب ہی کمرے میں موجود ہیں کاسی ساڑھی میں دادی کے پہلو میں بیٹھی ہوئی وہ تائی ہی تھیں جن کے خوب صورت چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

”اوہ.....! میرا اندازہ درست ثابت ہوا یہ لوگ آگئے۔ مگر ان کو تو ایک ہفتہ بعد آنا تھا..... اتنی جلدی کیوں آگئے یہ لوگ؟“ وہ سوچتی ہوئی دروازے سے دور ہوئی اور دبے قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آکر بیڈ پر لیٹ گئی۔

”کھانے کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔ ہم نے جہاز پر کھالیا تھا۔ اس وقت صرف چائے چلے گی۔ طغرل آپ کیا لیں گے؟“

”ہم بھی چائے پیئیں گے اگر سب پیئیں گے تو.....“ اس نے صباحت کی گود سے آبرو کو لیتے ہوئے ماں کو جواب دیا۔ آبرو جوئے چہرے اور نئے لوگوں کو دیکھ کر پہلے ہی شرمارہی تھی۔ طغرل کی گود میں جاکر مزید شرمانے لگی۔ صباحت چائے بنانے چلی گئیں تو دادی نے عادلہ اور عازنہ کو مدد اور طغرل کے لیے کمرے درست کرنے کا حکم صادر کر دیا۔

”اماں جان! پری گھر میں موجود نہیں ہے کیا.....؟“ مدد نے صباحت اور لڑکیوں کے جانے کے بعد اس کی غیر موجودگی محسوس کی تھی۔

”رات دیر سے سوئی تھی وہ، اس وجہ سے اس کی آنکھ نہیں کھلی ہوگی۔“ انہوں نے ان کی دل آزاری کے خیال سے بات سنہائی تھی ورنہ وہ جانتی تھیں کہ پری گہری نیند سونے کی عادی نہ تھی، وہ یقیناً بہت پہلے بیدار ہوگئی ہوگی۔ مگر حقیقت جاننے کے بعد اس طرف آنے سے گریز کیا ہوگا۔

”کیسی ہے وہ.....؟ اب تو بالکل بدل گئی ہوگی؟ اسے دیکھنے کئی سال گزر گئے۔ سب کی تصویریں ہمارے پاس ہیں ماسوائے پری کے..... بار بار کہنے کے باوجود اس نے اپنی کوئی تصویر ہمیں نہیں بھیجی۔“

”ارے بہو! بڑی عجیب لڑکی ہے، وہ کوئی تصویر بنوائی کب ہے۔“ دادی نے پورے خلوص سے سچائی بیان کی۔

”دادی جان! وہ موٹی بھینس ابھی تک احساس کمتری کا شکار ہے؟“ آبرو کے کان کھینچتا وہ ہنس کر استفسار کرنے لگا۔

”طغرل! پلیز..... آتے ہی جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“ مدد نے فوراً بیٹے کو ٹوکا۔

”مماوہ اچھی نہیں، موٹی لڑکی ہے۔ زمین کا بوجھ ہے۔“

”اماں جان! آپ دیکھ رہی ہیں یہ کیا کہہ رہے ہیں پری کے بارے میں.....؟“ انہوں نے کن اکھیوں سے فیاض صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ اسی لمحے صباحت چائے اور دیگر لوازمات ٹرائی پر رکھے آئیں تو باتوں کا دوسرا سلسلہ شروع ہو گیا جو صبح تک چلتا رہا۔



امید کی شاخوں پر  
آرزوؤں کی کلیاں کھل چکی ہیں!  
نہ معلوم یہ کلیاں کبھی پھول بن پائیں گی۔

یا شاید.....!  
خواہشوں کے مزار پر  
سوکھے پتوں کی طرح کبھر جائیں گی!

”یہ کمراب مجھ سے چھین لیا جائے گا۔ میرے ساتھ وقت ایسا ہی ظلم کرتا ہے۔ ہمیشہ مجھ سے میری عزیز ترین چیز چھین لی جاتی ہے۔ نا جانے کب تک میرے ساتھ یہ سب ہوتا رہے گا؟“ آنسو آنکھوں سے نکل کر تکیے میں جذب ہو گئے تھے وہ سونے کی سعی کرنے لگی۔



”آنے سے پہلے فون کر دیتے، ایئر پورٹ پر سب لینے آ جاتے ہم۔“ اماں جان بہو کو سینے سے لگائے دعا مانگنے کے بعد طغرل کی طرف بڑھی تھیں جس نے خود آگے بڑھ کر ان کو لپٹا لیا تھا اور کئی منٹ تک ان کو بازوؤں میں پیچھے کھڑا ہاتھ۔ بڑی عقیدت، بڑی محبت تھی اس کے انداز میں..... دادی نے اس کی پیشانی چومی اور سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کو خاصا جھکنا پڑا تھا۔

”ماشاء اللہ! خوب قد نکال لیا ہے تو نے طغرل۔ اپنے باپ اور چچا کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔“ دادی بلائیں لیتی ہوئی محبت سے بولیں۔

”مجھے تو لگ رہا ہے اماں جان اس کی پیشانی چومنے کے لیے آپ کو اسٹول استعمال کرنا پڑے گا۔“ فیاض صاحب کی بات پر قہقہہ لگا۔

”ارے میاں! ماشاء اللہ کہو۔ آنکھیں ترس گئی تھیں اس کی پیاری صورت دیکھنے کے لیے۔ ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی تھی میں۔“ وہ اس کو اشارہ ہو جانے والی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی گویا ہونیں۔

”تب ہی تو جیسے ہی مجھے اطلاع ملی کہ کسی کے دو ٹکٹ کیٹسل ہوئے ہیں، فوری طور پر میں نے وہ سیٹس بک کر والیں اور ہم یہاں آ گئے کہ ایسا موقع بار بار نہیں ملتا ہے اور آپ لوگوں کو اطلاع اس لیے نہیں دی کہ آپ کو حیران دیکھ کر جو عمر المادہ اس خوشی سے بڑھ کر ہے۔“ طغرل نے بڑے لاڈ سے دادی کے شانے پر چہرہ نکاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اس کی ادا پر نہال ہو ہو گئی تھیں۔ مدد نے بیگم سب سے مل رہی تھیں۔

عادلہ، عازنہ اور سب میں چھوٹی آبرو جو سوئی و جاگتی سی کیفیت میں ان دو افراد کو دیکھتی سی دیکھ رہی تھی۔ مدد نے اس گول مٹولی سی گڑیا کو پیار کیا تھا جو ان کے پاکستان سے جانے کے بعد اس گھر میں پیدا ہوئی تھی اور پر رونق اضافہ تھی۔

”آئی! آپ کے سر پر انز نے ہمارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔“ عادلہ نے ان سے ملتے ہوئے شکوہ کر ڈالا تھا۔

”اوہ..... سوری ڈیر! دراصل یہ سب طغرل کی وجہ سے ہوا ہے۔“ وہ اس کا رخسار تھپتھا کر مسکراتے ہوئے بولیں۔

”ہم نے کپڑے تیار کر دائے تھے، جوتے جیولری سب خاص الخاص بنوائے تھے کہ ایئر پورٹ جائیں گے۔“ عازنہ نے بھی اظہارِ افسوس کیا۔

”کوئی بات نہیں ہے بیٹا! ابھی بہت مواقع آئیں گے۔ آپ کو سب کچھ استعمال کرنے کا موقع ملے گا، اب آپ جاکر بھابھی اور طغرل کے لیے کھانے کا انتظام کرو۔“ فیاض صاحب کو بچپوں کا بات کو دہرائے جانا طبعی پسند نہ آیا تو ان کے احساس دلانے پر صباحت بھی جھل سی ہو کر اٹھیں۔

سالانہ امتحانات غنقریب ہونے والے تھے اور وہ ان دنوں انوکھے امتحان میں مبتلا تھی۔ محبت کے امتحان میں، محبت اگر آگ بھی تو اسے بھڑکانے میں وردہ پوری طرح شامل تھی۔ وہ دعوے تو بے حد گہری دوستی کے اس سے کرتی تھی مگر اپنے کزاینہ کی طرف داری اس سے زیادہ کرتی تھی۔ کالج، کوچنگ اور گھر آ کر بھی اس کی زبان پر سنی کی باتیں ہوتی تھیں۔ سنی کے مشاغل، اس کی پسند، ناپسند، اس کی عادات و مزاج، اس کے معمولات سمیت سب پر وہ بے تکان بولتی اور وہ جو پہلے اس ذکر سے گہرائی اور گریز کرتی تھی۔ اب اس کو یہ سب سننا اچھا لگتا تھا، کئی بار ایک موضوع کو سننا اچھا لگتا تھا۔ وردہ امتحانات کی تیاری کے بہانے اس کے ہاں تقریباً روز ہی آنے لگی تھی اور امتحان کی تیاری کی بجائے محبت کی تیاریاں کروانے میں مصروف رہتی تھی۔ اب بھی وہ رجاء کے قریب بیٹھی مسلمان کی بے قرار راتوں و بے تاب دنوں کی داستان سن رہی تھی اور وہ لیوں پر شرمیلی مکان سچائے سن رہی تھی۔

”محبت اتنی مستحکم ہوئی ہے کہ کسی جیسا سخت جان بندہ اپنا آپ ہار جائے..... اسے یقین نہیں ہوتا ہے، وہ مجھ سے پوچھتا ہے یا! تمہاری دوست جادوگر سے جو پہلی نظر میں بندے پر جادو کر دیتی ہے اور پھر اس بندے کو اسی کے علاوہ کوئی دوسرا دکھائی نہیں دیتا ہے۔“ وہ آنکھیں نیچا کر کہہ رہی تھی۔

”یا اللہ! وہ ایسی باتیں تم سے کرتے ہیں۔“ وہ شرم سے دہری ہوئی۔

”ہاں، مجھ سے کرتے ہیں مگر تمہارے لیے..... میرے لیے نہیں۔“

وہ ایک دم ہی برامان کر گیا ہوئی۔ اس کی عادت تھی بات بات پر خفا ہونے کی۔

”اوہ! تم ناراض ہو گئیں..... میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“

”ہاں بھی! میں بھول جاتی ہوں۔ تمہارا تعلق کس قدر قیادوسی و تنگ نظر خاندان سے ہے۔ تمہارے ہاں تو بھائیوں سے بھی بے تکلف ہونے کا رواج نہیں ہے۔ پھر بھلا کزیز سے تو اس طرح کی بے تکلفی کا تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔“ رجاء کو لگا وردہ نے اس کے ماحول کی تدبیر کر کے اس کو جوتا پیچ مارا ہو۔

”سوری ڈیز! میری پہلی میں ایسی کوئی روایت نہیں ہے، ہم بہت روشن دماغ اور کھلے ذہن کے لوگ ہیں۔ مہماپا کے دوستوں کے ساتھ، مہماپا کی دوستوں کے ساتھ آزادانہ ملتے ہیں۔ ہمارے ہاں گیٹ ٹو گیدر پارٹیز ہوتی ہیں۔ جس میں سب شریک ہوتے ہیں۔ کسی پر اعتراض نہیں ہوتا۔“ وہ اس قدر خیر انداز میں بتا رہی تھی کہ رجاء کو اپنی خاندانی ناموس و خوب صورت حد بندیاں حقیقتاً فرسودہ اور بے محل لگنے لگی تھیں۔

”خود کو ابھی سے بدلو۔ تمہیں یہاں نہیں رہنا۔ آثار قدیمہ کی ہتھکی ہوئی روح کی طرح..... تمہیں سنی کا جیون ساتھی بننا ہے۔ سنی کے ساتھ اعلیٰ طریقے سے اٹھنا بیٹھنا ہے۔ سنی کا زیادہ وقت لندن، پیرس، نیویارک میں گزرتا ہے۔“

”پلیز وردہ!“ شرم سے اس کا برا حال تھا۔ وردہ نے سنبھلے پنوں کا جال اس کے گرد بٹن دیا تھا جہاں وہ مہکتی خواہشوں میں جکڑتی جا رہی تھی۔

”اوہ بے وقوف! اتنا بھی کوئی شرماتا ہے کیا؟“ وہ ہنس پڑی۔

”ڈرے مجھے..... میرے یہ سپنے محض سپنے ہی رہیں گے، جانتی ہو نا! میں جس گھرانے سے تعلق

رکھتی ہوں وہاں یہ سب ناممکن ہے بلکہ..... ایسے خواب دیکھنا بھی معیوب ہے۔“ رجاء حقیقت پسندی سے گویا ہوئی۔

”میری جان! یہ ممکن کا دور ہے، ناممکن کا نہیں۔ تم سنی سے ایک ملاقات کے لیے راضی نہیں ہو، جبکہ وہ تمہاری چاہت میں بہت آگے جا چکا ہے اور تم ابھی اس کی قوت سے بھی واقف نہیں، وہ تمہیں یہاں سے لے جائے گا اور تمہارے گھر والے اس کا راستہ بھی نہ روک سکیں گے۔“

نہیں..... نہیں..... پلیز! ایسا کچھ نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ گھبرا کر بولی۔

”پھر مل لو اس سے ایک بار..... بہت محبت کرتا ہے، بے حد احترام کرتا ہے، ایک میلی نگاہ بھی نہ ڈالے گا تم پر، بے فکر ہو کر مل لو۔“

”نہیں۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

”واہ بھی! یہ بھی اپنی نوعیت کا انوکھا مذاق ہے، محبت کرتی ہو مگر ملوگی نہیں..... اپنی محبت کی خوش بو کے اندر مہکا کر بھی اسے دیدار سے محروم رکھو گی؟ اسے حسن پر اتنا غور بھی اچھا نہیں ہوتا۔“

”وردہ! یہاں میں بے اختیار ہوں۔ سمجھتی کی کوشش کرو۔“ اس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے تھے۔

”ٹھیک ہے! میں تمہاری ”مجبوریاں“ بتا دوں گی سنی کو پھر وہ خود ہی کوئی راستہ ڈھونڈ نکالے گا۔ تم بے فکر رہو، کسی کو معلوم بھی نہیں ہوگا۔“



بہت عرصے بعد وہ سب اکٹھے بیٹھے، بے شمار باتوں کے ذخیرے تھے ان کے پاس جو ختم بھی نہ ہونے تھے مگر رات تمام ہو گئی تھی۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی ان لوگوں نے نشست برخاست کی، فیاض صاحب، طفل کو لے کر مسجد کی جانب روانہ ہو گئے۔ مذہب باقاعدگی سے نماز ادا کرنے کی عادی نہ رہی تھی مگر وہ اس گھر کے اصول جانتی تھی کہ اماں جان کی موجودگی میں کوئی نماز قضا کرنے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ مذہبی معاملے میں وہ کسی سے بھی رعایت برتنے کی قائل نہ تھیں۔

”اوہ..... ہوا!..... اٹھ گئیں تم؟“ وہ نماز پڑھ کر جہاں نماز تہہ کر رہی تھیں جب عادلہ اسے دیکھ کر طنزیہ انداز میں چبکی تھی۔

”آئی اور طفل بھائی آگئے ہیں..... کس قدر دروازہ بجایا تمہارا مگر تم نہیں انھیں۔ میں نے تو سوچ لیا تھا اب تمہیں اللہ ہی اٹھائے گا۔“

”جس کا منہ اچھا نہ ہو، اس سے اچھی بات کی توقع کرنا بے وقوفی ہے۔“ وہ کہاں اس کو چھوڑنے والی تھی فوراً ہی مسکرا کر جواب دیا تھا۔

”اچھا.....! تم خود تو حسینہ عالم ہو؟“ عادلہ میں قوت برداشت صفر تھی۔

”ہوں..... بے شک میں مس یونیورس سے بھی بڑھ کر ہوں۔“

”ہونہ، یہ منہ اور مسور کی دال!“



”صبح میرے کمرے میں آنے کا مقصد کیا ہے تمہارا؟“

”تمہارا کمرہ!.....! ہا ہا ہا.....“ وہ ہنسنے لگی، پری ضبط سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ ”دادی جان نے کہا ہے کہ یہ کمرہ خالی کر دو۔ طغرل بھائی نماز پڑھ کر آرہے ہوں گے۔ وہ ساری رات کے جاگے ہوئے ہیں، آرام کریں گے۔ غور سے دیکھ لو اپنے ”مزار“ کو بس اب یہ گیا تمہارے ہاتھ سے..... چوم لو یہاں کی ایک ایک چیز کو، نگاہوں میں پسلاؤ، پھر تمہیں یہ کمرہ انہیں ملنے والا۔“ عادلہ جو کافی عرصے سے اس کا کمرہ حاصل کرنا چاہ رہی تھی، بہت خوش تھی۔

”زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے، انشاء اللہ بہت جلد میں اپنے کمرے میں ہوں گی۔“ پری پر یقین لہجے میں گویا ہوئی۔

”واقعی! طغرل بھائی کے ساتھ.....؟“ اس کے انداز میں گھٹیا ہنسنے لگی۔ وہ صدمے سے اسے دیکھتی رہ گئی جبکہ وہ سر جھٹک کر وہاں سے چلی گئی۔ فیاض صاحب بھانوج اور بیٹے کے خیال سے دوپہر کو ہی آفس سے آ گئے تھے۔ کھانا بے حد مزے دار بنا ہوا تھا اور پھر سب نے طویل عرصہ بعد ساتھ کھایا تھا، اس وجہ سے بھی کھانے کا مزہ دو بالا ہو گیا تھا۔ حسب عادت سب کچ کے بعد کچھ دیر آرام کرنے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔



طغرل اس کے کمرے پر قابض ہو چکا تھا، وہ اپنا ضروری سامان پہلے ہی دادی جان کے کمرے میں منتقل کر چکی تھی پھر خود بھی ان کے کمرے میں آ گئی۔ اس کے چہرے پر گہری تنجید لگی تھی۔ عادلہ نے وہ ناز بیا بات کہہ کر اس کا موڈ خراب کر دیا تھا اور اس کو شرمندگی بھی نہ تھی۔ پھر ذہن اتنا منتشر ہو گیا کہ وہ جو پہلے ہی فیصلہ کر چکی تھی کہ طغرل کا سامنا نہیں کرے گی (پیشانی کی جوت کی نشان کے باعث) لیکن مذہ آنٹی کا بھی وہ سامنا نہ کر سکی۔ ناشتے کے وقت کچن میں خود کو مصروف رکھا اور یہی معمول اس نے بچ کے وقت رکھا۔ دادی اور مذہ آنٹی کے کئی بار بلوانے کے باوجود گرم گرم پچھلے پکانے کا ہانا نہ کرنی رہی۔ کھانے سے فارغ ہو کر آنٹی کچن میں چلی آئیں اور اس کے سلام کے جواب میں بڑی محبت سے اسے لپٹاتے ہوئے کہا۔

”آپ بہت اسرار اور خوب صورت ہو گئی ہیں۔ پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ اگر عازرہ نہ بتاتی تو میں آپ کو پہچان بھی نہیں پاتی۔ چب ہم یہاں سے گئے تھے تو آپ کو خاصا صحت مند چھوڑ کر گئے تھے۔“ ان کے انداز میں خوش گوار حیرت تھی۔ وہ چپ مسکرائی رہی تھی۔ ”رات سے آپ سے ملاقات نہیں ہوئی..... کوئی ناراضی ہے کیا؟“

”نہیں بھلا ناراضی کیوں ہوگی؟ میں آپ کے پاس یہاں فارغ ہو کر آرہی تھی۔“ مذہ خوش اخلاقی، نرم مزاج کی مالک تھیں۔ دور درہ کران کی پر خلوص طبیعت میں اور زیادہ ہی حلاوت و اپنائیت سراپت کر گئی تھی۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگیں جو یہاں کسی کو پسند نہ تھیں۔ ان لوگوں کی خیریت معلوم کرنے لگیں جن کا یہاں نام لینا بھی کسی کبیرہ گناہ کے مترادف تھا۔



”میں پوچھتی ہوں اس طرح منہ بھلا کر کب تک بیٹھی رہے گی؟ بچے کو کمرہ کیا دیا ہے کہ انفسوس ہی صبح سے ختم نہیں ہو رہا ہے۔ غضب خدا کا! ایسی بد مانگ اور اکڑ والی ہے کہ سالوں بعد آنے والی تانی اور بھائی سے ملنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ مذہ خود گئی بالآخر اس سے ملنے۔“ دادی جو اس کی بد مزاجی کے خلاف بھری بیٹھی تھیں موقع ملتے ہی ہنسنے کی مانند پھٹ پڑی تھیں۔ وہ خاموش رہی کہ غلطی اس کی تھی۔ ”کیا سوچتی ہوگی مذہ، کیسی تربیت کی ہے تمہاری میں نے؟ ذرا تمیز و اخلاق نہیں سکھائے؟“ نامعلوم دادی کو اپنی تربیت پر حرف آنے کا خوف تھا یا اس کا تاثر خراب ہونے کا۔

”مگر کہا کرے کوئی..... ماں کے دودھ کی تاثیر سے بچے بچ نہیں سکتے۔ اس عورت کی ہٹ دھرمی و خود سری کہیں نہ کہیں دکھائی دے جاتی ہے تم میں۔“

یہ لہجہ، یہ بے مہر سفاک انداز کسی خجھر کی طرح اس کے دل میں پیوست ہو جاتا تھا۔ اس لمحے دادی کا انداز بے گانگی و بے مروتی لیے ہوتا تھا گویا وہ اس سے نہیں، کسی غیر سے مخاطب ہوں اور وہ اس دکھ سے منجمد ہونے لگتی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ اپنے اور دادی کے درمیان اسے ایک اجنبیت و بے گانگی کی دیوار حائل دکھائی دی تھی۔ اس کے اندر سناٹے اترنے لگے تھے۔

”دو دنوں انہی چھو بیوں کو تو فون کر دو ورنہ وہ گلہ کریں گی کہ ان کو اطلاع ہی نہ کی کسی نے بھابی اور بیٹے کے آنے کی۔ دیگر رشتہ داروں کو تو اس وقت اطلاع دی جائے گی جب ان ماں بیٹے کی تسکین اتر جائے گی۔“ دادی اسی طرح ہشاش بشاش تھیں۔ ان کو احساس بھی نہ تھا کہ کچھ لمحے قبل ہی ان کی زبان کی دھار اس کے احساسات کو بری طرح گھائل کر چکی ہے۔

”دادی جان! ایک بات پوچھوں؟“ اس کی آواز بے جان تھی۔

”ہاں..... ہاں کہو..... کیا بات ہے؟“ انہوں نے تسبیح پڑھتے ہوئے کہا۔

”میری..... ماما..... بہت خراب تھیں؟“ یکھت تسبیح کے دانے ان کی انگلی وانگوٹھے کے درمیان ساکت ہو گئے۔ چہرے پر تناؤ سادر آیا۔

”بتا میں نادادی جان! وہ اتنی خراب تھیں کہ کبھی ان کو اچھے نام سے پکارا نہیں جاسکتا ہے؟“ اس کی آواز رندہ لگتی تھی۔

”پری! ماضی کی اس کتاب کے باب کو کھولنے کی سعی مت کرو۔ اسی میں ہی بھلائی ہے۔“

”ماضی کبھی دُش نہیں ہوتا۔ یہ بھولے بھٹکے لوگوں کی طرح یادوں کے دیروازوں پر دستک دیتا رہتا ہے۔ پکارتا رہتا ہے۔“ دادی کے چہرے پر ناگواری و دشمنی سرخی بن کر پھیلنے لگی تھی لیکن پری کے چہرے پر حزن بھری اداسی اور آنکھوں میں چمکتی نمی نے ان کی ممتا کو بے دار کر دیا تھا۔

”فالتو باتیں مت کرو۔ تمہیں آج شاپنگ پر جانا تھا۔ اب تو ڈرائیور چلا گیا ہے۔ ایسا کرنا کل صبح ہی چلی جانا۔ ابھی عزیز ورشتے داروں کو خبر نہیں کر رہی ہوں۔ دو تین دنوں بعد کروں گی۔ تب تک تم اپنا کام کر لو۔ کپڑے وغیرہ لے آؤ۔ اپنے لیے، فیاض سے کہا تھا میں نے شاپنگ کے لیے رقم دے دے۔ اس نے دی یا نہیں؟“

وہ فوراً بہت مہربان ہو گئی تھیں۔ پری نے اثبات میں گردن ہلا دی تھی۔  
”شام میں چائے کے ساتھ کباب اور پھلوں کی چائ ضرور بنانا۔“



موقع ملتے ہی حاجرہ، رضیہ کے ہاں پہنچ گئی تھیں۔ رضیہ جو بیٹھی سبزی بناری تھیں۔ عادت کے مطابق انہیں دیکھ کر خوشدلی سے مسکرائی تھیں۔

”آؤ..... حاجرہ بہن! یہاں بیٹھو۔“ انہوں نے فلور کشن بڑھایا۔

ایمان داری کی بات ہے، تمہارے پاس آنے کے بعد طبیعت بہت خوش ہو جاتی ہے۔ آنے والے کو ”آؤ“ کہہ دو تو بڑی خوشی ملتی ہے۔“ رضیہ کی پر خلوص پزیرائی انہیں خوشی سے سرشار کر دیتی تھی۔

”آؤ کا مطلب ہوتا ہے خوش آمدید..... پھر بھلا ہم کس طرح کسی کی آمد پر خوشی کا اظہار نہ کریں جب آنے والا خوشیاں لا رہا ہو؟“ رضیہ نے مزاج کے مطابق سادہ سی بات کہی تھی مگر ناخواندہ حاجرہ اپنی سوچ سے یہ سمجھ کر کہ وہ تو نئی پڑوسن کے چھن پر بات کرنے آئی ہیں، خوشیوں کے ذکر پر شرمندہ سی ہو گئی تھیں۔  
”جھنڈیاں بنار ہی ہوا آج؟“

”ہاں، تمہارے بھائی کو بے حد پسند ہیں۔ جھنڈی گوشت بنار ہی ہوں۔“ انہوں نے بڑی نفاست سے جھنڈیاں صاف کی تھیں۔

”میرے ہاں تو روزیہ مسئلہ رہتا ہے کہ آج کیا کیا جائے۔ سبزیاں اور دالوں سے یہ لوگ رغبت ہی نہیں رکھتے ہیں۔ نہ بیٹوں کو پسند نہ باپ کو اور تو اور بیٹیاں بھی ناک بھوں بنائی ہیں دال سبزی کے نام پر..... سب کو گوشت چاہیے۔ وہ بھی کسی دال سبزی کے بغیر بھنا ہوا۔“

”آج محل زیادہ تر گھروں میں یہی مسئلہ رہتا ہے۔ صبح اسی سوال سے شروع ہوتی ہے کہ آج کیا کیا جائے جو سب خوش ہو کر کھالیں۔“ انہوں نے جھنڈیاں رجا کو تھمتے ہوئے کہا جو حاجرہ کو سلام کرنے آئی تھی۔

”امی! آپ خالہ کے پاس بیٹھ جائیں، روٹیاں میں بنالوں گی۔“ رجا نے ان سے جھنڈیوں کی ٹوکری لیتے ہوئے کہا۔

”تم تیار کرو امتحانوں کی..... روٹیاں میں خود بنالوں گی..... پھر کام ہوتا ہی کتنا ہے۔ میں خود کر لوں گی۔ تم بس خوب اچھی تیاری کرو۔“ رضیہ بیٹی کی طرف دیکھ کر دالار سے بولیں۔ حاجرہ نے رجا کو دیکھ کر کہا۔

”کیا بات ہے رجا بیٹی! بہت کمزور لگ رہی ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”جی خالہ! میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ ان کی کھوجتی نگاہوں سے خائف ہو کر وہاں سے کچن میں چلی آئی، ڈش کاؤنٹر پر رکھ کر بڑی تیزی سے دھڑکتے دل پر اس نے ہاتھ رکھا تھا۔ عجیب ذہن ہو گیا تھا اس کو ہر ایک سے خوف آنے لگا تھا کہ کوئی اس کے دل کا بھید نہ پالے۔ کسی کو اس کے منہ کے جذبوں کی خبر نہ ہو جائے۔ راتوں کی نیند، دن کا قہار، بھوک پیاس سب اس سے روٹھ گئے تھے۔ اس کی ماں سادہ و عام فہم

عورت تھی۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ امتحانات کی تیاری کے باعث کمزور ہو رہی تھی۔ جبکہ وہ محبت کی آگ میں کسی شمع کی مانند آہستہ آہستہ پگھلنے لگی تھی مگر کہاں کے امتحان..... کیسی تیاری..... وہ سب بھلائے بیٹھی تھی۔ ماں اس کی بہت سادہ و گھریلو عورت تھیں جن کا وقت نماز و افکار کے علاوہ گھر کے دیگر کاموں میں گزرتا تھا یا پھر حاجرہ اور دوسری پڑوسن ان کے پاس آ کر اپنا دکھ درد بیان کر تیں تو وہ خلوص و ہمدردی سے سنتیں اور کبھی دلا سوں سے، کبھی استطاعت کے مطابق ان مسائل کو حل کرنے کی سعی کرتی تھیں۔ خالہ حاجرہ نے جس کھوجے انداز میں اس کی کمزوری کا اظہار کیا تھا اس سے وہ کچھ سمجھ ہی گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سیدھی سادی ماں تو اس پر اندھا اعتماد کرتی ہے۔ وہ اور وردہ گھنٹوں کمرے میں سنی کی باتیں کر لیتی تھیں اور یہ ان کا اعتماد ہی تھا کہ انہوں نے کبھی ان کی نگرانی نہیں کی تھی اور مہمان نوازی کے لیے وہ جب لوازمات لے کر آتی تھیں تو اس خیال سے کہ ان کی پڑھائی کا خرچ نہ ہو، وہ ان کے پاس بیٹھتی بھی نہ تھیں۔ شروع شروع میں وہ ضمیر کی تلخ سے بے چین ہو جاتی تھی یہ سوچ کر کہ وہ سادہ لوح ماں کو کس طرح دھوکا دے رہی ہے، ان کے اعتماد و اعتبار کا خون کر رہی ہے لیکن..... یہ احساس مختصر مدت کے لیے اس کے اندر پیدا ہو کر سو گیا تھا۔

جب برائیوں میں کشش محسوس ہونے لگتی ہے تو اچھائیاں ذہن سے محو ہو جاتی ہیں۔ پھر نہ اپنا احساس رہتا ہے نہ دوسرے کا خیال۔ یہی اس کے ساتھ ہوا تھا۔ وردہ کی باتوں میں اسے اب سکون ملنے لگا تھا۔ وردہ کے جانے کے بعد بھی وہ سنی کے خیالوں میں کھونے لگی تھی، سنی سے محبت کیا ہوئی۔ اسے تنہائیاں اچھی لگنے لگی تھیں۔ حاجرہ خالہ کا بیاں و چلاک عورت تھیں ان کا کام یا مشغلہ یہی تھا کہ وہ محلے کے ہر گھر پر نگاہ رکھتی تھیں۔ لڑکا لڑکی، میاں بیوی، ساس، بیو، نند دیور ہر ایک کے معاملات پر ان کی نگاہ ہوتی تھی اور سب کے تعلقات کی ان کو خبر ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان سے گھبرا گئی تھی اور کچھ دلوں سے وہ دیکھ رہی تھی کہ وہ نئی پڑوسن عموماً اس کے کمرے سے نظر آتی کھڑکی سے کھڑی اسے دیکھ رہی ہوئی اور اس کی نگاہیں بڑی بے باک ہوتی تھیں۔



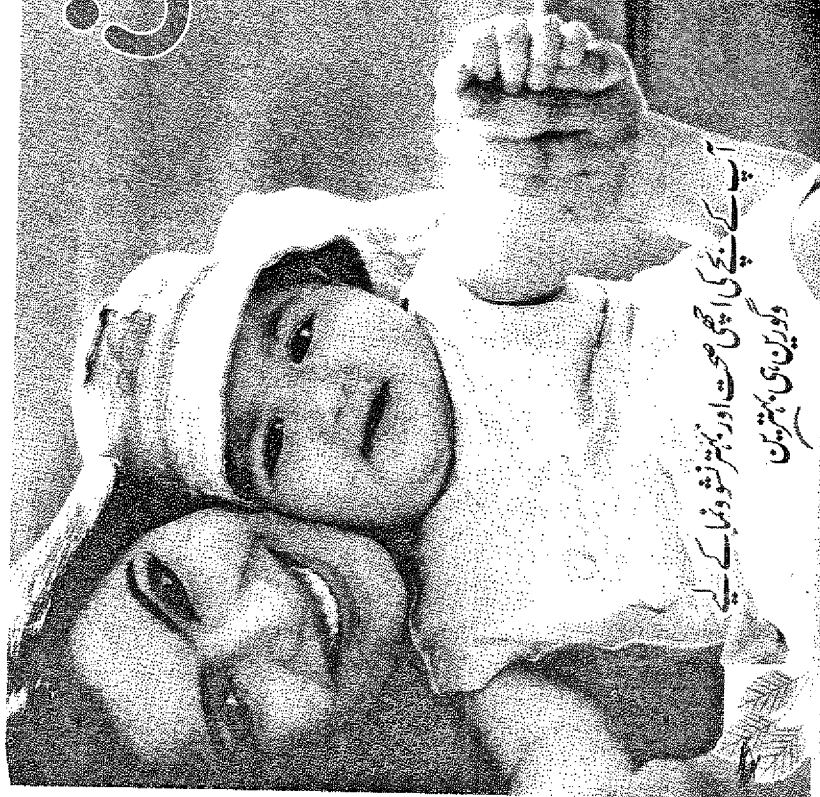
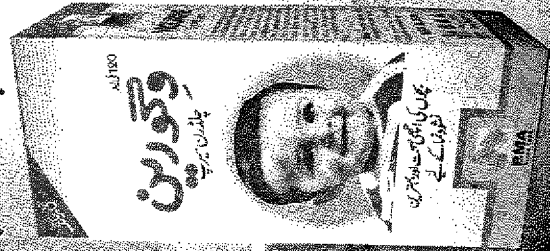
خواب گاہ اسے بے حد پسند آتی تھی، بالکل اس کی مرضی و پسند کے مطابق تھی۔ بے حد نفاست لیکن سادگی سے آراستہ روشن، ہوادار اور کشادہ، اس کی دونوں کھڑکیاں باہر لان میں کھلتی تھیں۔ بیڈ پر دراز ہونے کے بعد بھی اور صبح خوشنما پھولوں سے لدے درخت نظر آتے تھے، دوسری کھڑکی سے ناریل کے پیڑ کی چھدری شاخوں سے آسمان پر چمکتا چاند کی شرمیلی دو شیرہ کی مانند بادلوں کی اوٹ میں چہرہ چھپا رہا تھا۔

طغرل بیڈ پر دراز اس چاند کو تنگ رہا تھا۔ ایک عرصے بعد وہ اپنے وطن، اپنے گھر کی فضاؤں میں سانس لے رہا تھا۔ جب یہاں سے گیا تھا تو جدائی اور دوری جیسے احساسات کا ادراک ہی نہ تھا اور جب کئی دنوں تک اس کی اپنی عزیز ترین بہنوں یعنی دادی جان اور چچا جان سے ملاقات نہ ہو سکی تو اس نے جانا جدائی کتنا بڑا کرب ہے۔ ایک ایسا درد جو کسی گلی گلی کی مانند اندر ہی اندر سلاگنا رہتا ہے، تڑپاتا رہتا ہے۔ وہاں سیٹ ہونے کے لیے اس کو طویل



آپ کے بھول کی ابھی صحت دن بدن بہتر ہے

دوگورین  
جلد دن سپر



آپ کے بچے کی اچھی صحت اور بہتر نشوونما کے لیے

BMA Pharma  
Since 1952  
AL-Hadiya

عرصہ کی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ دادی جان، چچا جان اور دیگر رشتہ داروں اور کزنز کی یادوں سے اسے نکلنے میں مکمل کامیابی تو حاصل نہ ہو سکی تھی البتہ وقت رفتہ کے ساتھ وہ سمجھتا کر بیٹھا تھا۔ تعلیم اور کھیلوں کے ساتھ اسے دوستوں اور کزنز کی دوستی وہاں بھی مل گئی تھی کہ اس کی ماما کی فیملی یعنی آدھا میکہ وہاں رہائش اختیار کیے ہوئے تھا۔ نانا، نانی، تین ماسوؤں اور دو خالائوں کے گھرانوں کے علاوہ دیگر رشتہ داروں اور دوست احباب سمیت ایک وسیع حلقہ وہاں رہائش پزیر تھا۔ جن سے عموماً علیک سلیک رہتی تھی، وہ فطرتاً آزاد خیال تھا اور لوگوں سے قریبیں، دوستیاں نبھانے کا از حد شوقین تھا۔ وہاں کی آزاد فضاؤں میں اسے سیٹھ ہونے میں وقت نہ لگا تھا لیکن جن ہستیوں نے اس کو مضطرب رکھا تھا ان میں ایک اس کو جان سے بڑھ کر عزیز تھیں تو دوسری جانی دشمن!

وہ پھولے پھولے گالوں اور موٹی موٹی بے حد چمکی آنکھوں والی پری جس کی اس سے کبھی بنی ہی نہ تھی۔ وہ دھونس دھاندلی والی طبیعت کے باعث سب کزنز پر رعب جما کر فائدہ اٹھاتا تھا۔ چچا اور چھوٹیوں کے بچے جو سب ہی تقریباً ہم عمر تھے پر حکومت کرتا تھا ان میں فقط ایک وہ تھی جو اس کی کسی دھونس، دھمکی و رعب میں نہ آتی تھی۔

وہ اس کی ہم مزاج، ہم فطرت تھی۔ اس کی طرح ہی جنگجو سر پھری، کسی کے رعب میں نہ آنے والی نڈر لڑکی، کھیل کا میدان ہو یا گھر کا ماحول، وہ ایک دوسرے سے سمجھتا نہ کرتے تھے۔ ویسے تو ان میں کانٹے کا مقابلہ رہتا ہی تھا مگر..... جب بات دادی کی ہوتی تھی تو پھر ایک زبردست جنگ ہوتی تھی کہ دونوں ہی دادی کو اپنی اور صرف اپنی جاگیر گردانتے تھے۔ حالانکہ دادی بڑی دیانت داری کے ساتھ دونوں کو اپنے بازوؤں میں دبا کے یگانگت و برابری کا درس دیتی تھیں۔ ان کے انداز میں پیار بھری یکسانیت ہوتی تھی جس کو وہ تسلیم کرنے کو راضی نہ ہوتے تھے اور عموماً اس بات پر لڑائی چھڑ جاتی تھی، جب دادی کسی کی پیشانی پہلے چوم لیتی تھیں۔

طغرل قد میں پری سے لمبا ہونے کے باعث فائدہ اٹھالیا کرتا تھا جب بھی دادی پری کی پیشانی چومنا چاہتیں وہ بڑھ کر جھٹ اپنی پیشانی آگے کر دیا کرتا تھا اور اس بے ایمانی پر گھسان کارن بڑتا پھر پری غصے میں کسی جنگلی بلی کی مانند اس پر حملہ کر دیتی تو جواباً وہ بھی شدت سے اس کے بال کھینچ ڈالتا۔ دھکا دیتا تھا پھر کئی مرتبہ وہ ڈیڈی سے اس کی وجہ سے مار کھا چکا تھا۔ ڈائٹ تو اس کو اکثر ہی پڑا کرتی تھی کہ وہ اگر دادی، ماما اور چچا کا لاڈلا تھا تو وہ اس کے ڈیڈی کی از حد لاڈلی تھی۔ اس کے ڈیڈی سب بچوں پر اس کو فوقیت دیتے تھے۔ ڈیڈی کی اس کو اتنی فکر بھی نہ تھی کہ ساری چاہتوں، الفتوں، محبتوں کا پیکر دادی جان تھیں اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ دادی جان پری کو پیار کریں اور اس نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ سب سے زیادہ پیار پری سے نہیں، اس سے کریں اور ایک دن دادی نے اسے چپکے سے بتایا تھا کہ وہ سب سے زیادہ پیار اس سے کرتی ہیں۔ پری سے بھی زیادہ..... اور وہ اس دن بہت ہی خوش ہوا تھا مگر دادی سے اسے وعدہ کرنا پڑا تھا کہ وہ یہ بات کسی کو نہیں بتائے گا اور پری کو تو بالکل بھی نہیں..... ورنہ وہ اس سے دوستی تو زکر پوری کی پوری پری کی دادی بن جائیں گی اور ان کی یہ دھمکی اس کو خوفزدہ کر گئی تھی ورنہ کسی کو تو نہیں پری کو وہ ضرور



”بھائی بنگلہ اور طفل کے سامنے آپ اور بچیاں از خود ہی کھینچی جاتی ہیں، وہ لوگ تو باہر کے ملک میں وقت گزارنے کے باوجود بھی سادہ و بے تکلف ہیں۔ وہ ناز برداریاں کروانے والے نہیں ہیں۔“ انہوں نے ہنسنے انداز میں جواب دیا۔

”جب کوئی اپنوں سے دور غیروں میں رہتا ہے تو اپنوں کی قدر کرنی آ جاتی ہے۔“

”تو پھر تو میرے حساب سے غیروں میں رہنا زیادہ سودمند ہے۔“

”اچھا..... وہ کیوں بھلا؟“ وہ چڑ کر گویا ہوئیں۔

”اپنوں میں رہ کر جب حسد کرتے ہیں۔ تاراض رہتے ہیں، کینہ پالتے ہیں۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔ اس کے بجائے اگر ہم ایک دوسرے سے پورے خلوص کے ساتھ محبت کرنے لگیں، رشتے اپنی اصل خوب صورتی کے ساتھ باہم مربوط ہو جائیں تو جدائی کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔“

”آپ تو ایسی ہی باتیں کرتے ہیں گویا خدا نخواستہ آپس میں جنگیں لڑی جا رہی ہوں ہماری اور ہم ایک دوسرے کی تشکیل دیکھنے کے روادار نہ ہوں۔“

”دوسرے لوگوں کے متعلق تو مجھے معلوم نہیں ہے مگر آپ کے بارے میں میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے رشتے دار اگر یہاں آ کر اپنی شکلیں نہ دکھا جائیں تو آپ کبھی ان کے گھر جانے اور ان کی شکلیں دیکھنے کی روادار نہ ہوں۔“ فیاض صاحب بڑے ٹھنڈے کجے میں طنز فرما رہے تھے اور صباحت ایسے شعلوں میں گھر گئی تھی جس کی آگ تو دکھائی نہ دے رہی تھی پروہ بری طرح جھک رہی تھیں۔

”اچھا.....! ابھی تو آپ مجھے آئے روز بھائی کے ہاں جانے کا طعنہ دے رہے تھے بلکہ میری ان بہنوں کو بھی گھٹیت لیا تھا جو دل و جان سے آپ کی عزت کرتی ہیں اور اب..... آپ یہ طعنہ دے رہے ہیں کہ میں کسی کے ہاں جانے کی روادار نہیں ہوں۔ منافقت میرے اندر ہے یا آپ کے طرز افکار میں؟“

”میں اپنے میکے کی نہیں..... آپ کے میکے کی بات کر رہا ہوں۔ اپنے میکے کو آپ سر کے بل چل کر جاتی ہیں، خواہ صبح و شام کیوں نہ جانا پڑے۔“

”ارے مرد کامیکہ کہاں ہوتا ہے؟“ وہ غصہ بھول کر اچھپے سے بولیں۔

”لڑکی کے رشتے داروں کو جب میکہ کہا جاسکتا ہے تو مرد کے رشتے داروں کو کیوں نہیں؟“

”بات کا بنگلہ بنانا تو کوئی آپ سے کچھ۔ نامعلوم کیا کیا اسی سیدھی باتیں آپ سوچتے رہتے ہیں مرد کامیکہ.....!“ وہ ہنس پڑی تھیں۔



وردہ کا اصرار ہرگز رتے دن کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔

مسلمان اس سے ملنے کے لیے تڑپ رہا ہے، اس سے ملنے کے لیے بے چین ہے۔ وہ اس کے پیغامات کی ترسیل کا ذریعہ بنی ہوئی تھی اور پرچہ کے دل کی حالت ابتری کا شکار ہو جایا کرتی تھی اور وہ پرکٹے پرندے کی مانند بے بسی محسوس کرنے لگتی تھی اور سنی کی یاد اس پر اداسی بن کر چھانے لگتی تھی۔ بے گلی بن کر اس کے

بنانا کہ دادی اس سے زیادہ اس سے پیار کرتی ہیں اور جواب دہ روتی۔ اس کی غلامی آنکھوں سے کرتے آنسو اسے بڑی خوشی دیتے تھے۔ جب وہ یہاں سے گیا تو اسے دادی سے چمچھڑنے کے دکھ کے ساتھ ساتھ یہ بھی دکھ تھا کہ اب پری دادی پر قبضہ جمالے گی۔ دادی پوری کی پوری اس کی ہو جائیں گی۔ ان کا سارا پیار وہ حاصل کر لے گی۔ اس نے بہت ضد کی دادی کو ساتھ لے جانے کی، مگر ڈیڈی نے بھی کہا مگر دادی کسی طور اپنا گھر، اپنا ملک چھوڑنے کو تیار نہ ہوئی تھیں۔ وہ خفا خفا سامیہاں سے گیا تھا۔ مگر وہاں جا کر دادی کی یاد نے ساری تنگی بھلا دی تھی۔ وہ ان کو باقاعدگی سے فون کرتا تھا..... ان کی یاد سے زیادہ اسے یہ احساس مضطرب و مشتعل رکھتا تھا کہ پری دادی کی محبت کے مزے لوٹ رہی ہے۔ عادلہ اسے ہر بات سے آگاہ رہتی تھی۔ یہاں رہتے تھے تو ان کے درمیان لڑائیاں کرانے والی عادلہ ہی تھی، وہاں بھی وہ ہر بات سے اس کو آگاہ رکھتی تھی۔ تمام کزنز سے اس کی دوستی وقت گزرنے کے ساتھ مضبوط ہو گئی تھی، سب کی تصاویر اس کے پاس تھیں ماسوائے پری کے..... نہ ہی کبھی اس سے بات ہوئی تھی اور نہ ہی اسے کبھی خواہش محسوس ہوئی تھی۔ بقول عادلہ کہ وہ بدتمیز، بد زبان اور بد اخلاق لڑکی تھی جس کو کوئی طرح کے احساس کمتری لاحق تھے۔ بدلتے وقت اور عمر نے بھی اس پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ بچپن ہی سے ایسی تھی، گستاخ اور کسی کو خاطر میں نہ لانے والی..... اب بھی وہ دونوں گزرنے کے بعد بھی ملنے نہیں آتی تھی۔ مگر تو از خود ہی اس سے ملنے چلی گئی تھیں اسے بھی کہا تھا مگر وہ سنی ان سنی کر کے بیٹھا رہا تھا۔ اسے کوئی شوق نہیں تھا اس سے ملنے کا۔



”تو ہے! آپ کی بہنیں گھر آجائیں تو واپسی کا راستہ ہی بھول جاتی ہیں۔“ بھائی اور طفل جب سے آئے ہیں گھر کا ماحول ہی بدل کر رہ گیا ہے۔ پہلے ان کی ناز برداریوں میں لگے رہے۔ پھر ان سے ملنے آنے والوں کی خاطر داریوں میں۔“ صباحت کاٹھن کے نئے نکور پرچہ پھری بیس سوٹ میں ملبوس تھیں، فیاض صاحب سے مخاطب ہوئی تھیں جو حسب عادت مطالعے میں مصروف تھے۔ عموماً وہ ان کی باتوں پر سنی ان سنی کر دیا کرتے تھے۔ مگر اس وقت انہوں نے جوان کے قریبی رشتوں کے متعلق جس نوعیت کی گفتگو کی تھی وہ ان کو بہم کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ ان رشتوں کو دل و جان سے جانتے تھے۔

”میری بہنوں نے کون سے یہاں پڑاؤ ڈال لیے ہیں جو آپ کو فکر لاحق ہو گئی ہے؟ چند گھنٹوں کے لیے آتی ہیں بہنوں بعد..... تم کو وہ بھی برداشت نہیں ہے..... پھر اس معاملے میں میں آپ کی بھائی صاحبہ کی برداشت و حوصلہ کو داد دوں گا جو آپ اور آپ کی بہنوں کی ہر دوسرے دن آمد پر مٹاتے پریشان لائے ناخاندہ پیشانی سے پیش آتی ہیں۔“

”واہ! بہنوں کے معاملے میں آپ کی زبان کیسے کتر کتر سرتے کی مانند چل رہی ہے ورنہ منہ سے بیٹھے رہتے ہیں۔“ وہ دل ہی دل میں چل اٹھی تھیں۔

”یہ دو غلامین چھوڑ دو جو اللہ کو بالکل بھی پسند نہیں ہے۔“

”میں نے کون سا دو غلامین کیا؟“ وہ مارے غصے کے سرخ ہو کر گویا ہوئیں۔

دل کی دھڑکنوں میں اضطراب پیدا کر لگتی تھی۔

یہ کیسی محبت تھی؟

یہ کیسا جذبہ تھا؟

یہ کیسا احساس تھا؟

جو چند دنوں کا شناسا تھا مگر..... صدیوں کی واقفیت محسوس ہونے لگی تھی۔ اس سے ملنے کی چاہ دل میں بھٹکنے لگی تھی۔ ایک طرف دل کے تقاضے تھے تو دوسری جانب ایک مسئلہ درپیش تھا۔ وہ انھیں سامنے والی بڑوں کی پراسرار سی حرکتیں تھیں۔ اس کے کمرے کے سامنے والی دیوار میں اوپری حصے میں شیشے کی کھڑکی تھی جس کے پتہ نہ تھے صرف سفید شیشہ لگا تھا کیوں کہ اس کا کمر اس طرز پر تعمیر ہوا تھا کہ گھر کے آخری حصے میں تھا۔ اس وجہ سے وہاں دن میں بھی نیم اندھیرا رہتا تھا اور روشنی اس شیشے والے حصے سے اندر آ کر کمر روشن کر دیتی تھی۔ انہیں یہاں رہتے ہوئے برسوں گزر گئے تھے۔ پہلے دادا پھر اس کے ابو کی نماز و پرہیز گاری، شرافت و نیک نامی کے باعث سب محلے کے لوگ ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ کسی کی جرأت نہ تھی کہ ان کے گھر کی طرف کوئی میلی نگاہ سے دیکھ سکے۔ اس سامنے والے دو منزلہ گھر میں بھی سیکڑوں کرائے دار آئے اور گھر کے کسی نے بھی اس طرف کھلنے والی کھڑکی یا بالکونی استعمال نہ کی تھی۔ وہ عورت جو محلے میں اچھی نگاہ سے نہ دیکھی جا رہی تھی کہ جو جس قدر حسین بھی اتنا ہی مکروہ اس کا کردار ہاتھا۔ محلے کی کوئی عورت اس سے دوستی کرنے کی خواہاں نہ تھی تو مرد بھی مجبور اس لیے اس کو برداشت کر رہے تھے کہ مالک مکان بنا اطلاع دیے ملک سے باہر چاچا کا تھا اور اس کی آمد تک سب کو اس عورت کو برداشت کرنا تھا اور اس عورت کا اپنی ذات میں دلچسپی لینا اس کو فکر میں مبتلا کر گیا تھا۔ وہ اکثر بالکونی میں کھڑی ہو کر اس کے کمرے میں جھانکتی رہتی یا کھڑکی میں اسے گھورا کرتی تھی۔ اس کی نگاہیں اسے کوئی پیغام دیتی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ پیغام کیا تھا.....؟ اور وہ اس سے کیا چاہتی تھی؟ اس کے لیے سمجھنا ناممکن تھا۔ وردہ ابھی آئی تھی اور آتے ہی اس نے سنی کی باتیں شروع کر دی تھیں تب اس نے اسے اپنی اس نئی پریشانی سے آگاہ کر کے مشورہ مانگا۔

”واہ! وہ تمہیں دیکھتی ہے؟ دنیا اسے دیکھنے کے لیے ترستی ہے مائی ڈیر۔“ وہ کھلکھلا کر اس سے کہہ اٹھی۔

”تم جانتی ہو وہ کس قسم کی عورت ہے پھر بھی تمہیں مذاق سو بھر رہا ہے۔“ وردہ کو اس کے چہرے پر چھائی خوف کی زردی نے سنجیدہ کر دیا تھا۔

”تم اتنا سنجیدگی سے کیوں لے رہی؟ وہ تمہیں یوں ہی دیکھ رہی ہوگی۔“

”نہیں۔ وہ نامعلوم کس طرح مجھے دیکھتی ہے کہ..... مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے کچھ ہو جائے گا۔“ بڑی پراسرار نگاہیں ہوتی ہیں اس کی۔ ”رہاؤ کے کچھ میں ابھی بھی خوف کی حکمرانی تھی۔“

”تم نے اپنی امی ابو کو بتایا ہے سب.....؟“

”نہیں.....“ اس نے آنہستی سے کہا۔

”کیوں.....؟ تمہیں ان کو فوراً بتانا چاہیے۔“

”وہ کہیں گے بدگمانی گناہ ہے، میری بات کو بدگمانی پر محمول کریں گے۔“

”تم اپنی امی کو اس وقت بتاؤ جب وہ تمہیں دیکھ رہی ہو تو.....“

”یہی تو مسئلہ ہے وہ کسی کی موجودگی میں نہیں دیکھتی ہے۔“

”فکر نہ کرو تم۔ یہ مسئلہ سنی ہی حل کر سکتا ہے۔ وہ ایسے لوگوں کو بالکل پسند نہیں کرتا جو اچھے کردار کے نہ ہوں۔ اب تم کو یہی پرالیم سنی کو بتانی ہوگی۔ میں جانتی ہوں تم کو بھی ”تمہارا اس سے ملنا ناممکن ہے۔“ رجا کو لب و لہجہ کرتے دیکھ کر وردہ جتانے والے انداز میں کہہ رہی تھی۔

”یہ میری مجبوری ہے، سمجھنے کی کوشش کرو وردہ!“

”نہیں سنی ہو..... فون پر تو بات کر سکتی ہو۔“ وردہ نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا تو رجا عمو بخاشامی لہجے میں بولی۔

”تم خود ہی بتاؤ کس طرح ممکن ہے؟ سارے دن امی گھر میں موجود رہتی ہیں۔ رات کو ابولاؤنچ کے ساتھ والے کمرے میں دروازہ داکر کے سوتے ہیں پھر.....“

”ٹھیک ہے، میں تمہاری پرابلیم سنی کو پہنچا دوں گی۔“ وہ کہہ کر چلی گئی تھی۔ دوسرے دن اس کے مسئلہ کا حل موجود تھا۔

سنی نے اسے ”بلک بیری“ گفت کیا تھا۔ وردہ اسے پکڑا کر فوراً ہی چلی گئی تھی۔

”وہ قیمتی سیل فون دیکھ کر ساکت رہ گئی تھی۔“



”طغزل بھائی! دل لگ گیا آپ کا یہاں.....؟“ عازرہ اس سے مخاطب ہوئی۔ وہ ٹی وی لاؤنچ میں صوفے پر بیٹھا ایک ناک شود دیکھ رہا تھا۔

”دل.....!“ اس نے چونک کر استفسار کیا پھر مسکرا کر بولا۔ ”میں یہاں دل لگانے نہیں آیا۔ آپ سب سے ملنے آیا ہوں۔“

”کیوں..... دل وہیں چھوڑ آئے گوری میموں کے لیے؟“ ناخنوں پر کیونکس لگاتی عادلہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

”ہاں سمجھ سکتی ہو۔“ اس نے اس کی طرف دیکھے بنا اطمینان سے کہا۔

”یہاں کیا آپ کو دل دینے والیوں کی کمی تھی طغزل بھائی!“ عادلہ سخت بد مزہ ہوئی منہ بنا کر بولی۔

”یہ کیا دل و دماغ کی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو۔ کوئی اچھی سی بات کرو یا را!“ اس نے ٹی وی بند کر کے بیزار لہجے میں کہا۔

”کیا اچھی بات کریں؟ ہمیں تو گھر ہی میں رہنا ہوتا ہے، دادی کو تفریح پسند ہے نہ پکنک اور نہ ہی کوئی بلہ گلہ۔“

”اوہ بہت افسوس ہوا۔ لیکن فکر مت کرو بہنو جب تک میں یہاں ہوں آپ کو تفریح پر لے جاتا

”وہ ایسی ہی ہے سہیل مزاج، مجال ہے جو کسی کو برداشت کرے، ہر ایک سے لڑنے جھگڑنے والی، بدترین و بد مزاج لڑکی ہے وہ۔“

”وہ ابھی تک ایسی ہی ہے جنگلی لمبی کی طرح غرانے والی، نوپنے والی..... میں سمجھا تھا وقت نے اسے بدل دیا ہوگا۔“

”کچھ لوگ ہوتے ہیں ایسے جن کو وقت بھی بدل نہیں سکتا۔ آپ کے آنے سے کچھ عرصہ قبل تک وہ دادی جان سے لڑتی رہی تھی۔“

”دادی جان سے.....! مگر کیوں؟“ اس کے انداز میں ناگواری درآئی تھی۔

”کمرے کی وجہ سے.....“ عادلہ نے بھولپن کی اداکاری شروع کر دی۔

”کیا کمرے کی وجہ سے..... یہ کیا بات ہوئی؟“

”دراصل جو کمر آپ کو دیا گیا ہے وہ پری کا کمر ہے، وہ اپنے کمرے میں کسی کو برداشت نہیں کرتی۔ میں نے بہت چاہا وہ اپنا کمر اس کی طرح مجھے دے دے چند دنوں کے لیے مگر اس نے انکار کر دیا۔ پھر آپ کے آنے کا ہوا تو دادی نے لکھا وہ کمر آپ کے لیے خالی کر دے اور یہیں سے وہ دادی کی دشمن بن گئی۔ نامعلوم کس طرح وہ کمر خالی کرنے پر آمادہ ہوئی ہے۔“ عادلہ نے مہارت سے اس کو معلومات بہم پہنچائی تھیں۔

”اوہ! سمجھا، میں تو کہیں بھی ٹھہر جاتا یہاں اور بھی کمرے ہیں۔ دادی نے خواہو اس کی منتیں کیں۔“ وہ تنجیدگی سے گویا ہوا۔

”کمرے تو بہت ہیں مگر پری کے کمرے جیسا کوئی نہیں۔ وہ اپنے کمرے کی بہت حفاظت کرتی ہے اس لیے اس کا کمر اسب سے زیادہ صاف و خوب صورت ہے۔“

”اس کو تو شوق ہے صفائی کا۔ اب دادی کے کمرے میں رہ رہی ہے تو وہاں کی ماسی بنی رہتی ہے۔“

عادلہ کی ہنسی استہزائیہ تھی۔



وہ عشاء کی نماز ادا کرنے کے لیے وضو کر کے واش روم سے باہر آئی تو پایا کو دادی کے پاس بیٹھے دیکھ کر وہیں رک گئی وہ ماں بیٹے اپنی گفتگو میں مگن تھے اس کی موجودگی ان کے لیے ایسی اہمیت نہ رکھتی تھی کہ وہ نگاہ اٹھا کر دیکھتے۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

اس کی نگاہیں باپ کے چہرے پر تھیں، سفید رنگت..... عمدہ نقوش! ان کے چہرے پر بے حد وقار و بردباری تھی۔ درمیانی عمر میں بھی ان کی شخصیت بے حد جاذب نظر تھی۔ اس نے بھی اپنے باپ کو بہتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ابھی کبھار وہ مسکراتے تھے تو ان کی آنکھیں اس مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دیتی تھیں۔ اس نے ان کی آنکھوں میں حزن و ملال دیکھا تھا۔ کسی کو کھونے کا دکھ دیکھا تھا..... ایسا دکھ جو بچپن سے اس کے اندر بھی پروان چڑھتا رہا تھا۔

”ارے تم وہاں کیوں دیوار سے چھپکی کی طرح چپکی کھڑی ہو۔ یہاں آؤ۔“ دادی کی اس کی طرف نگاہ

رہوں گا۔“

”ارے واقعی! پھر تو بہت مزا آئے گا۔ خوب مزے کریں گے ہم۔“ وہ دونوں ہی بے تحاشا خوش ہو گئیں۔ سیر و تفریح کی وہ دلدادہ تھیں لیکن ایساں جان کی طرف سے عائد پابندیوں کے باعث شتر بے مہار نہ بن سکتی تھیں۔ صباحت اتنی فرماں بردار نہ تھیں جو ساس کی باتوں پر من و عنق مثل پیرا ہوتیں یا بچپن کو یہ سعادت مندی سکھاتیں۔ وہ اماں جان کی لاعلمی میں ہر وہ کام کرتی تھیں جو رو بردار کرنے سے گریز کیا جاتا تھا۔ کیونکہ صباحت نے بھی ساس کو وہ عزت رتبہ نہ دیا تھا جس کی وہ حق دار تھیں بظاہر تو وہ بڑی خوش اخلاقی و ادب کا مظاہرہ کیا کرتی تھیں مگر حقیقتاً وہ انہیں پسند نہ کرتی تھیں۔ سخت بدظن تھیں اور یہی منافقانہ انداز ان کی تربیت کے ذریعہ عادلہ و عازرہ میں سرایت کر گیا تھا۔ وہ باپ سے زیادہ ماں کے قریب تھیں اور ماں کی آنکھوں سے دیکھنے اور ان کے ذہن سے سونے کی عادی تھیں۔

”دادی جان سے اجازت آپ لیا کریں گے باہر جانے کی، وہ تو ہمیں کبھی بھی اجازت نہیں دیں گی۔“

عادلہ نے جتنی انداز میں کہا۔

جی ہاں! اور دادی کو غلطی سے بھی یہ نہ بتائیے گا کہ یہ ہماری خواہش ہے۔“ عازرہ نے بھی عادلہ کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

”میرے خیال سے تو دادی جان بے حد نرم مزاج اور محبت کرنے والی ہیں۔“ فطعل کی بات پر عادلہ نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ سفید و سرخ رنگت، مردانہ نقوش خوب صورت تھے۔ آنکھیں اعتماد کی چمک سے روشن تھیں۔ ایک بے نامی جنوں خیزی و سرکشی اس کی ذات میں نہاں تھی۔ ایک ایسی کشش جو دیکھنے والی آنکھ کو متحیر کرتی تھی۔ عادلہ کا دل چاہا وہ چپکے سے اسی کا ہو جائے۔ کوئی دوسری نگاہ اس کی طرف اٹھے ہی نا اور وہ کسی جگہ کی طرح اس کو دل کی کھٹی میں قید کر لے۔ یہ حقیقت تھی فطعل کو جب سے اس نے دیکھا تھا تب سے ہی اس کے دل کی دنیا بدلی بدلی تھی۔ وہ اس کے قریب کے مواقع تلاش کرتی تھی۔

”دادی جان! صرف اس گھر میں ایک ہی ہستی سے پیار کرتی ہیں اور وہ ہستی ہے ان کی لاڈلی چیت پری کی..... جو ان کے حواسوں پر ہر وقت چھائی رہتی ہے ہمیں تو وہ اس قابل سمجھتی نہیں کہ محبت کریں۔“ عازرہ جو عادلہ کی کیفیت سے بے خبر تھی، منہ بسور کر بولی۔

پری کے نام پر وہ چونکا تھا اسے یہاں آئے ایک ہفتے سے زائد ہو چکا تھا اور اس عرصے میں وہ ایک بار بھی اس سے نہیں ملی تھی۔ پہلے تو اس نے خود ہی اس کو نظر انداز کیا تھا لیکن اس وقت اس کا نام سن کر اس سے ملنے کی خواہش انکڑائی لے کر بیدار ہوئی تھی۔ وہ پوچھ بیٹھا۔

”وہ محترمہ کہاں پائی جاتی ہیں؟ ابھی تک ان سے میرا ٹکراؤ نہیں ہوا ہے۔ کیا پری کہیں گئی ہوئی ہے؟“

اس نے عادلہ سے استفسار کیا تھا۔

”وہ کہاں جائے گی.....؟ یہیں گھر میں ہوتی ہے ہر وقت۔“

”حیرت! کہاں ہوتی ہے، مجھے کہیں دکھائی نہیں دی ابھی تک.....؟“ اس کے انداز میں حیرانی تھی۔

عادلہ کو جلن سی محسوس ہونے لگی تھی۔



# خواتین کے لئے قابل شائع ہو گئے ہیں

**شیشہ کر**  
قیمت 500/- روپے

**شہر چار گراں**  
مصنفہ سعدیہ اہل کاشف  
قیمت 500/- روپے

**تتلی اڑان**  
قیمت 300/- روپے  
**پتہ کا گز**  
قیمت 300/- روپے  
مصنفہ: عالیہ بخاری

**ذرا ٹھہر جا اسی موڑ پر**  
مصنفہ: محبت بیا  
قیمت 200/- روپے

**دکھ دریا کے بیچ**  
قیمت 300/- روپے

کتابیں خوب صورت اور دلکش کے ساتھ معیاری شائع ہو گئی ہیں

سرکروڈ چوک اردو بازار لاہور  
فون: 37668958, 37652546 (042)

اٹھی تو وہ گویا ہو گئیں۔ وہ خاموشی سے ان کے نزدیک آ کر بیٹھ گئی تھی۔

”تم نے شاپنگ کی تھی؟ میں نے کہا تھا مزید رقم کی ضرورت ہو تو کال کر لینا۔“ فیاض صاحب نے اپنی بیوی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے کہا۔

”وقت کہاں ملا بچی کو شاپنگ کا.....؟ دوسرے دن یہ جاتی اور اس رات کو بہو اور طغرل بنا اطلاع کے آگئے تب سے اب تک مہمانوں کی آمد و رفت ختم نہیں ہو رہی ہے۔ عادلہ اور عازنہ کو تو کام کے ذکر سے ہی گھبراہٹ ہونے لگتی ہے اور وہیں تمہاری تنگم صاحبہ، تو ان کو بس ہدایتیں دینی آتی ہیں، کام واپس نہیں ہوتا ان سے پھر ظاہر یوں کرتی ہیں گویا سارے گھر کے کام وہ ہی سمیٹ رہی ہیں۔ شامیت آئی ہے تو اس بچی کی تم نے شاپنگ کے لیے جو رقم دی تھی وہ میرے پاس ہے۔ پری نے مجھے دے دی تھی۔“ انہوں نے بہو اور پوتیوں کے رویے کا بھانڈا پھوڑا تھا۔

”اماں جان! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ایک اور ملازم رکھوا دوں گا۔“  
”ارے یہ ملازم بڑے بد ذات ہوتے ہیں۔ کتنا ہی اچھا کام کرنے والے کیوں نہ ہوں کام میں ڈنڈی مارنا پنا حق سمجھتے ہیں۔ نامراد۔“

”ٹھیک ہے، میں صباحت کو سمجھاتا ہوں، اس کو اپنے فرائض ذمہ داری سے ادا کرنے ہوں گے۔“ وہ اماں سے اجازت لے کر چلے گئے۔

”اب دیکھنا صباحت کو کس طرح بے عزت کرتا ہے فیاض، ساری اڑن نکل جائے گی بیگم صاحبہ کی، بڑی مہارانی بنتی ہے خود کو۔“

”دادی جان! آپ کو پاپا سے ماما کی شکایت نہیں کرنی چاہیے تھی اب خواخوہ ان میں لڑائی ہوگی۔“ پری آہستگی سے بولی۔

”ارے خواخوہ کیوں..... میں نے سچ کہا ہے۔ صباحت خود کو نا معلوم کیا سمجھنے لگی ہے۔ سیدھے منہ بات ہی نہیں کر رہی ہے۔ عورت مرد کے پیر کی جوتی ہے۔ اس کو اس کی جگہ پر ہی رکھنا مناسب ہے۔ پھر فیاض اچھی طرح جانتا ہے سر کی جگہ کس کے لیے ہے اور پاؤں کی کس کے لیے.....“ وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم رک گئیں۔ پری نے محسوس کیا پھر چپ رہی۔

”بڑی بہو چند دنوں کے لیے اپنے ماموں کے پاس مری گئی ہیں۔ اب مہمان نہیں آئیں گے۔ تم ایک آدھ دن اپنی نانو کے گز اڑ کر آ جاؤ۔ کل بھی تم کہہ رہی تھیں کہ فون آیا تھا ان کا۔ بہت یاد کر رہی ہیں تمہیں۔“  
”آپ کو چھوڑ کر کیسے جاؤں؟ آج کل آپ کے جوڑوں میں درد بھی زیادہ ہے۔“

”تمہارا دل چاہ رہا ہے جانے کو.....؟“ ٹینک درست کر کے انہوں نے اس کی طرف کھوجتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں دادی! اس کی زبان و سرائکار میں ساتھ ملے تھے۔“

”ٹھیک ہے..... ورنہ میں سوچ رہی تھی اگر تم چلی گئیں تو پریشانی ہو جائے گی۔ طغرل میری محبت میں اپنی ماں کے ساتھ مری نہیں گیا۔ تمہارے جانے کے بعد میں کس طرح بچے کا خیال رکھتی۔ اسے کھانے

”اچھا! ابھی ابھی آپ کہہ رہی تھیں میں نانو کے جا کر رہ آؤں تو وہ جھوٹ تھا؟“

”میں آپ کے اس لاڈلے کی ملازم نہیں ہوں جو آپ مجھے سمجھ رہی ہیں۔“ وہ نماز کی چادر باندھتے ہوئے بدھ مزاجی سے گویا ہوئی تھی۔

دادی جانِ جو اس کا گریز و اجتناب بد دلی سے برداشت کر رہی تھیں، کہہ اٹھیں۔

”آؤ، آؤ، آؤ! کیا بات ہے ابھی تک سوئے نہیں؟“ طفل کو دیکھ کر داوی کے چہرے پر مسکراہٹ  
روشنی بن کر پھیل گئی تھی۔

”میں اپنے بچے کے آنے سے پریشان کیوں ہوں گی۔ آؤ آرام سے بیٹھ جاؤ۔“ انہوں نے مجھے کھٹک کر اسے حیدر جگہ دی، وے سے تو اس ڈبل بندر خاصہ جگہ تھی۔ وہ آرام سے بیٹھ گیا، نہیں اسے بھی سوتا

”اتنے بڑے بیڑ پر آپ تنہا سوئی ہیں وادی جان!“ وہ ان سے مخاطب ہوا مگر اس کی متلاشی نظریں کمرے کا حائرہ لے رہی تھیں۔

”مری؟ کون سی مری..... لال مری، سبز مری یا کالی مری.....؟“

”سنا ہے پارس جس کو چھو جائے وہ سونے کا ہو جاتا ہے لیکن یہاں

”بال کی کھال نکالنا کہاں سے سیکھ لیا تم نے؟“ وہ متعجب ہوئیں۔

”میں کیا جانوں؟ میں نے اپنے بیڑوں سے سناٹھا پارس پھر ہوتا ہے اور جو اسے چھو لے وہ سولے کا بن

”اے اے بڑوں سے سنا اور یسین کر لیا اور سیدان سر مہ نے ہی آپ ہی کی ساری پڑیاں کر لیں۔“

”کمسنہ! دل تو کر رہا ہے منہ توڑ کر ماتھ میں دے دوں اس کا۔“ وہ جو نماز پڑھ کر اس کے جانے کے

”ارے بچے! تو ابھی بھی نہیں سدھرا؟ پری سے ابھی بھی تیری چھٹھر خانی ایسی ہی جاری ہے، کیا اب بھی

”یونہیہ! کتے کی دم بھی کبھی سیدھی ہوئی ہے جو یہ سدھرے گا؟“ وہ جو اس کی باتیں سن رہی تھی

”نہیں..... نہیں..... میری ایسی جرأت کہاں کہ میں پری کی شان میں کستاچی کر سکوں؟“ اس نے

داوی ہس پڑی تھیں جبکہ مارے ضبط پری کا برا حال ہو رہا تھا۔ وہ جھجھکی سی وہ یہ سب یوں اس لیے کر رہا

”کے نام سے بہت سے لوگ مر رہے ہیں۔“ دادی کو معلوم تھا وہ کسی طرح اندر ہی اندر سلگ

”میں تو کما کو رشتا نہیں کر رہا پھر کمرے میں آؤ اور میرے علاوہ کوئی تیسرا شخص نہیں ہے۔“ وہ بھی

”پری گیلری میں نماز پڑھ رہی ہے۔“ وہ اس کو بتا کر پری سے کہنے لگیں۔

|    |    |      |
|----|----|------|
| 93 | آب | ۱۱۰۰ |
|----|----|------|

”مجھے لگتا ہے دادی جان! شاید ہزار رکعت کی نیت باندھ لی ہے۔“ طفل کو نامعلوم کیوں بہت لطف محسوس ہو رہا تھا۔

”ہیں، میں طفل! یہ چلبلا میں کہاں سے سیکھ لیا ہے!“

”جب وقت بھاری پڑتا ہے تو سب سکھا دیتا ہے۔“ وہ شرارتی انداز میں بولا۔

”اللہ نہ کرے، جو تم پر وقت بھاری پڑے..... کیوں اول نفل بک رہے ہو.....؟ چلو جا کر سوؤ۔ زیادہ جاگنے سے دماغ چل گیا ہے تمہارا۔“ وہ تکیہ درست کر کے لیٹتے ہوئے گویا ہوئیں۔

”نیند نہیں آ رہی دادی جان! آج ساری رات میں آپ سے باتیں کروں گا۔“ وہ قریب ہی نیم دراز ہو کر بولا۔

”اب میں سوؤں گی اور جاگی تو تہجد کے لیے آنکھ نہیں کھلے گی۔“ انہیں پری پر غصے کے ساتھ ترس بھی آنے لگا تھا۔ بلاوجہ ہند میں طفل سے چھپ رہی تھی اور جو بات بلا سبب ہو وہ تکلیف کا باعث ہوتی ہے جیسے وہ اس وقت چھوٹی سی گیلری میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی عادت تھی عشاء کی نماز پڑھتے ہی سونے کی اور اسے نماز ادا کیے خاصا وقت گزر گیا تھا۔ نیند سے اس کی حالت بری ہو رہی تھی۔

”اچھا..... کسی اور کی خاطر مجھے آپ بھگا رہی ہیں؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”ارے نہیں میرے بچے! ایسا نہیں ہے، بس مجھ سے اب جا گائیں جاتا ہے۔“ دادی نے جھٹ پٹ اس کی پیشانی چوم کر وضاحت کی تھی۔ اس کو بھی احساس ہوا کہ مذاق ہی مذاق میں وہ اب زیادتی کا مرتکب ہو رہا ہے تو وہ فوراً ہی معذرت کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔



وہ ساری رات، سارا دن ایک آزمائش و کشمکش میں بسر ہوا تھا۔ سیل فون اس نے بند کر کے اپنے لمبوسات میں چھپا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے اندر جنگ چھڑ گئی تھی۔ ایک طرف اس کی نوزائیدہ محبت تھی تو دوسری جانب ماں باپ کا اعتماد و تربیت..... بچپن سے اسے حالات کی اونچ نیچ سکھائی گئی تھی کہ کسی راہ پر قدم ڈلگام میں نا اور وہ راستہ بھٹک کر منزل نہ کھو بیٹھے۔

”میں اپنی رجا کو اعلیٰ تعلیم دلاؤں گی۔ ہمارے مذہب میں تعلیم حاصل کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ماں کی گود سے قبر کی آغوش تک علم حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تعلیم برائیوں سے بچائی ہے، اچھائیاں سکھاتی ہے۔“ امی کی پریقین آواز اس کی سماعتوں میں گونجنے لگتی تو کبھی ابو کا پر اعتماد لہجہ اس کے ارادوں کو ڈانواں ڈول کر رہا تھا۔

”رجاء بیٹی! جوان بیٹی جب گھر سے باہر جاتی ہے تو اس کے سر پر والدین کی محبت، اعتماد و عزت کا تاج ہوتا ہے جس کی ہر قدم پر، ہر نظر پر حفاظت کرنی پڑتی ہے، یہ تاج کالج سے بھی زیادہ نازک اور ہیرے سے بھی بڑھ کر قیمتی و نایاب ہوتا ہے کہ ذرا سی لغزش، معمولی سی لڑکھڑاہٹ سے گر کر چٹنا پٹو رہو جاتا ہے اور کالج ٹوٹ کر جڑے نہیں ہیں اب یہ ہماری عزت و دیان کا تاج تمہارے ہاتھوں میں ہے۔“

کالج کا وہ پہلا دن تھا وہ گھر سے نکلنے والی تھی جب ابواس سے مخاطب ہوئے تھے۔ اس وقت اس نے

کہا تھا کہ وہ جان دے دے گی مگر اس تاج کو ٹھوکر بھی نہ لگنے دے گی۔  
آج دو سالوں میں ہی وہ سارے عہد بھول گئی تھی۔ ماں باپ کی برسوں کی محبت، سنی کی نوزائیدہ محبت اس محبت پر بازی لے جانا چاہتی تھی۔

”سنی کی محبت کو مت آزمانا سنی..... وہ بے حد جذباتی ہے، تم نے ذرا بھی اس کے جذبول کو کچلنے کی کوشش کی تو وہ خود کو نقصان پہنچا لے گا۔ وہ محبت کا ترس ہوا ہے۔ وہ تم میں اپنی دنیا دیکھتا ہے۔“ وردہ نے گلوگیر لہجے میں کہا تھا۔

یہ سب آوازیں روتی، چلاتی، مسکراتی، گنگنائی ہوئی آوازیں جو کسی آسیب کی طرح اس کے اندر حشر برپا کر رہی تھیں اور وہ سوچتی سیل فون وردہ کو واپس کر دے اور صاف کہہ دے کہ وہ اس ٹائپ کی لڑکی نہیں ہے جو اپنے والدین کے اعتماد و عزت کا خون کر کے اپنے لیے خوشیاں خریدے۔ وہ کسی سے منسوب ہو چکی ہے اور اسے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی کے ساتھ محبت کی پینٹیں بڑھائے۔ اس جیسی مذہبی گھرانے کی لڑکی کو یہ زیب نہیں دیتا۔ لیکن پھر اسے یاد آتا کہ سنی نے اگر خود کو کوئی نقصان پہنچا لیا۔ اس کی مجبور یوں کو اس نے بے وفائی سمجھا تو وہ کس طرح خود کو معاف کر سکیگی.....؟ ایک طرف والدین کے اعتماد و عزت کا خون ہونے سے بچائی تو دوسری طرف سنی اپنی بے وفائی کے خون میں لب پت دکھائی دیتا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کوئی ایسی ترکیب مل جائے جس سے نہ تو والدین کا اعتماد و روح بچو اور نہ ہی سنی سے جدا ہو سکے۔ ابھی وہ اسی آؤ ہٹز بن میں تھی کہ فون کی آوازیں کر کر کے کی طرف بھاگی تھی۔



دادی جان کو زلزلہ اور کھانسی ہو گئی تھی۔ وہ ان کے لیے قبوہ بنانے کچن میں آئی اور قبوہ مگ میں ڈالنا چاہتی تھی کہ خوش بو کے زبردست جھونکے نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ قدموں کی آہٹیں بھی اس طرف آ رہی تھیں۔

”اف خدا! یہ یہاں کیوں آ رہا ہے؟“ اس نے گھبراہٹ میں مگ کاؤنٹر پر رکھا اور خود کاؤنٹر کے دوسری طرف بیٹھ گئی تھی۔ اسی وقت طفل کچن میں داخل ہوا تھا۔

”اوہ.....! ابھی تو محسوس ہو رہا تھا یہاں کوئی ہے۔“ وہ کچن میں نگاہیں دوڑاتا دیکھنے لہجے میں بولا تھا۔ مگر یہاں تو کوئی نہیں ہے، چلتا چاہیے۔“ وہ خود کھامی میں کہہ رہا تھا۔ دوسرے لمحے اس کے جاتے قدموں کی آوازیں دور ہوئیں تو یہ یقین کرنے کے بعد کہ وہ چلا گیا ہے، پری کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل آئی تھی۔ وہ سوجھ بوجھ گئی تھی وہ اسے تنگ کرنے کے لیے ایسی حرکتیں کر رہا ہے مگر وہ ہار ماننے والی نہیں تھی۔ وہ سوچتی ہوئی آگے بڑھی تھی پھر حیرت سے وہ ساکت رہ گئی۔ طفل سینے پر بازو لیٹے اطمینان سے کھڑا تھا کچن کے درمیان میں۔

(باقی آئندہ ماہ انشا اللہ)





# مجھے دیرپا رہے

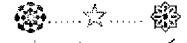
ایم جے صدا

محبت میں کوئی صدمہ اٹھانا چاہیے تھا  
بھلایا تھا جسے وہ یاد آنا چاہیے تھا  
میری اور اس کی آرزو میں فرق یہ تھا  
مجھے بس وہ اسے سارا زمانہ چاہیے تھا

باہر بہت شدید بارش ہو رہی تھی۔ زمین پہ گرتے بارش کے ہر قطرے کے ساتھ ساتھ اس کے خیالات اور سوچوں میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ شاہ میر اب تک گھر نہیں لوٹا تھا رات ڈیڑھ بجے کا وقت ہو چلا تھا۔ اس کا سیل فون بھی سلسل آف جا رہا تھا اور اس پر طوفانی بارش.....  
”نہیں! شاید کہیں رک گئے ہوں گے۔ بارش ختم ہونے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔“ اس نے دوسو سو میں گھرے دل کو تسلی دی۔ ”کہاں جاؤں کس سے معلوم کروں کسی کو جانتی بھی تو نہیں یہاں۔ یا خدا میرے میر کو صحت سلامت گھر پہنچا دے۔“ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ عجیب سی خاموشی نے پورے گھر کا احاطہ کر رکھا تھا۔ اس بیت ناک خاموشی میں ذرا سی آہٹ بھی اسے ہلا دینے کو کافی تھی۔ بار بار نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ذہن میں ایک ہی خیال آ رہا تھا۔ ”کہیں یہ خاموشی آنے والے کسی طوفان کا پیش خیمہ تو نہیں..... نہیں نہیں میں خودخواہ ہی وہم پال رہی ہوں جائیں گے کہاں ابھی

آج جائیں گے۔“ اس نے ذہن میں اٹھنے والے تمام خیالات کو جھٹکا اور وہ بیان بانٹنے کی غرض سے اپنا نامکمل ناول سنبھال لیا۔ اس کے ناول کی آخری قطرہ لگی تھی۔ جس کے مکمل ہو جانے کا شاہ میر کو بھی بے صبری سے انتظار تھا۔ اس خیال سے وہ اسٹڈی کی طرف بڑھ گئی۔ اسے پیاس محسوس ہوئی اس لیے پہلے پین کا رخ کیا۔ فریج سے پانی نکال کر دروازہ بند کیا۔ تو نظر دروازے پر لگی تصویر پر پڑ گئی۔ شاہ میر اور اس کے ہنسی مون کی تصویر بھی کتنا خوش دکھائی دے رہا تھا شاہ میر اور اس پر اس کی ہمیشہ سے چمکتی شوخ آنکھیں..... شادی کو ڈھائی ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا مگر اب تک وہ شاہ میر کی آنکھوں میں جھانک کر نہ دیکھ پائی تھی۔ کتنا دل چاہتا تھا اس کا کہ شاہ میر کی آنکھوں کو بغور دیکھے اور ڈوب جائے مگر اس کی آنکھوں کی چمک اور شوخی ہر بار اس کا ارادہ بدل دیتی تھی۔  
وہ ناول مکمل کرنے کا ارادہ ترک کر کے وہیں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی اچانک ہی میر کی بے انتہا ہواستانے لگی تھی حالانکہ وہ تو ہر دم اس کے پاس تھا مگر پھر بھی اس

وقت اس کا شدت سے دل چاہا کہ شاہ میر کی مضبوط بانہوں میں جا چپے اور پھر کبھی اس کو خود سے جدا نہ ہونے دے۔ ابھی چھ ماہ پہلے کی ہی تو بات ہے جب وہ شاہ میر پر نگاہ ڈالنا بھی پسند نہیں کرتی تھی اور اب یہ عالم تھا کہ جب تک اسے دیکھ نہ لے۔ اس کے دل کو چین نہیں آتا تھا۔ یونہی میر کو یاد کرتے کرتے وہ زندگی کے چھ ماہ اور تیرہ دن پیچھے لوٹ گئی۔



”اوہ! آج بھی انٹرویو کے لیے لیٹ ہو جاؤں گی۔“ اس نے جلدی سے بینڈ بیگ اٹھایا اور چادر درست کرتے باہر کی طرف قدم بڑھادیے۔  
”ارے ایمان بیٹا! ناشتا تو کرتی جاؤ۔“ ماما جان نے اسے پکارا۔  
”نہیں ماما جان! پہلے ہی بہت لیٹ ہو گئی ہوں بس آپ دعا کیجئے گا۔“

”ہاں بیٹا پر خالی پیٹ تو نہ جاؤ تا کہم از کم دودھ تو پی لو۔“ ماما جان جلدی سے گلاس میں دودھ ڈال کر لے آئیں اور وہ جلدی سے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر کے انہیں تھما لی یہ جاوہ جا۔  
”یا اللہ میری بچی کو کامیاب کرنا۔“ انہوں نے صدقہ دل سے دعا دی۔  
بس اسٹینڈ تک تو وہ پہنچ گئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ بس تک پہنچتی بس چل پڑی۔ اس نے اشارہ بھی کیا مگر بے سود۔

”یا اللہ! اب کیا کروں۔ پہلے ہی بہت لیٹ ہو چکی ہوں۔ ٹیکسی کرنی ہوں مگر ٹیکسی کا کرایہ؟ خیر ایک بار جاب لگ جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ یہی سوچ کر وہ ٹیکسی روکنے کے ارادے سے آگے بڑھی ابھی وہ قدم ہی چلی تھی کہ وہی سیاہ کار اسے نظر آئی جو پچھلے دو دن سے ٹکڑے بس اسٹینڈ تک اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

پچھلے دو دن سے تو وہ نظر انداز ہی کر رہی تھی مگر اب اسے پریشانی نے گھیر لیا۔ شیشے کالے ہونے کی وجہ سے یہ بھی نہ جان سکتی تھی کہ چلانے والا کون ہے؟ گاڑی اب مبین اس کے برابر آن رکی۔ شیشہ نیچے کیا گیا اندر جو کوئی بھی تھا بغیر اس کی جانب دیکھے اس سے مخاطب ہوا۔  
”آئیے محترمہ آپ کو جہاں جانا ہے میں چھوڑ دوں گا۔“

ایمان چند لمحوں کے لیے اجنبی کی ہمت پر سہکتا رہ گئی۔ اس کے لہجے میں لفت کی آفرم اور جیسے کا حکم زیادہ تھا۔  
”نوشہکنس! میں خود چلی جاؤں گی۔“ وہ مختصر سا جواب دے کر آگے بڑھ گئی اور اس کے ساتھ ہی گاڑی بھی ہوا ہو گئی۔



”السلام علیکم ای!۔“  
”وعلیکم السلام بیٹا! تم چلو بیٹھو میں تمہارے لیے کھانا لگا دیتی ہوں۔“  
”نہیں ای! مجھے بھوک نہیں ہے۔“  
”کیوں بھوک نہیں ہے؟ صبح بھی تم ایسے ہی نکل گئی تھیں صحت دیکھی ہے اپنی روز روز انٹرویو کے چکر میں صحت تباہ کر لی ہے اپنی۔“  
”فکر نہ کریں ای! اب مزید کوئی چکر نہیں لگے گا۔“ اس کی آواز میں اداسی اور مایوسی نمایاں تھی۔  
”تو کیا جاب پکی ہو گئی ہے۔“

”نہیں ای!۔۔۔۔۔ یہاں کون دے گا مجھے جاب بغیر سفارش کے میری ڈگریاں تو دلانے سے رہیں مجھے تو کری۔ جہاں بھی جاؤ ایک ہی جواب سننے کو ملتا ہے۔“  
”سفارش ہے آپ کے پاس؟“ پھر آپ جابیے ہم آپ کو کال کر کے بتا دیں گے۔ اور آج تک ایک بھی کال نہیں آئی۔ بس اب میں تھک گئی ہوں ای! کچھ

نہیں بین سکتا میرا۔“ اس نے سر کرسی کی پشت گاہ سے نکال دیا۔  
”مایوسی کی باتیں نہ کیا کرو بیٹا! کیوں اداس ہوتی ہو؟ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ تمہارے اور میرے علاوہ ہے ہی کون اس گھر میں۔ تمہارے بابا کے بعد کچھ کچھ نہیں کیا میں نے۔ آج تو تمہیں کھلا سکتی ہوں لیکن کل کے لیے تمہیں خود کو شش کرنی ہوگی۔“  
”ای! ایسی باتیں نہ کریں۔“ اس نے ان کے کندھے سے مڑ کر لایا۔

”بیٹا! یہ باتیں نہیں حقیقت ہے۔ موت تو برحق ہے اور ایک ذابک دن آتی ہے میں چاہتی ہوں بُرے اور مشکل وقت کے لیے تم پہلے سے اپنے آپ کو تیار کر لو۔ آج کل کوئی کسی کا نہیں ہے اور مجھے کسی پر بھروسہ بھی نہیں ہے۔ جن رشتہ داروں نے تمہارے بابا کے چلے جانے کے بعد ہم سے رشتہ توڑ لیا ہے ہو سکتا ہے میرے چلے جانے کے بعد یہ تمہارے طرف لوٹیں مگر وہ ان کی محبت اور بھداری نہیں بلکہ خود غرضی ہوگی اور میں تمہیں کسی بھی مشکل میں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی بلکہ میری تو مالک سے دعا ہے کہ میری حیات ہی میں تمہیں کوئی اچھا اور نیک جیون سا مل جائے تاکہ مجھے سکون سے موت آجائے۔“

وہ ایسی اور بابا دونوں کی لاڈلی تھی مگر بابا کے چلے جانے کے بعد وہ انہیں پہلے سے بھی زیادہ عزیز ہو گئی تھی اور اب وہ اس کے معاملے میں پہلے سے زیادہ حساس ہو گئی تھیں۔

”چلو تم ہاتھ منہ دھو لو میں کھانا لگا دیتی ہوں اور یاد رکھو چاہے جیسا بھی کڑا وقت آجائے، کبھی بھی خدا کی رحمت سے مایوس مت ہونا۔ وہ دے گا اور ضرور دے گا ان شاء اللہ۔“

”سوری ماما جان! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“

ان کے کچن میں چلے جانے کے بعد وہ وہی بیٹھی رہی اور اب وہ اسی گاڑی والے کے بارے میں سوچنے لگی۔

”کون ہے وہ اور اس طرح پیچھے آنے کا مقصد اور پھر آج والا واقعہ۔“ کوئی سراسر اس کے ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی زندگی میں ہونے والا یہ پہلا واقعہ نہیں تھا بلکہ جب سے اس نے جوانی کی سیڑھی پر قدم رکھا تھا آتے دن اسے اس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا۔ اللہ تعالیٰ نے دل کھول کر اسے حسن سے نوازا تھا اور اس پر اس کی چمکیلی سیاہ آنکھیں کسی کو بھی ہوش سے بیگانہ کرنے کے لیے کافی تھیں۔ ماما جان نے اسے شروع سے ہی ایسے حالات کا سامنا کرنا سکھایا تھا۔ وہ ڈرنے والوں میں سے نہیں تھی مگر کبھی کبھی اس کی جذباتی طبیعت اس پر غالب آ جاتی۔ ”جو بھی ہو، مجھے اس سے کیا۔“ تمام خیالوں کو جھٹک کر وہ منہ ہاتھ دھوئے اٹھ گئی۔



آج بھی اسے ایک فرم میں انٹرویو کے لیے جانا تھا اور اس بار اسے پورا یقین تھا کہ یہ جاب اسے ضرور ملے گی۔ اسے بس اسٹینڈ پر کھڑے کچھ دیر ہونی تھی۔ جب اسے اپنے سائینڈ میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا برقیوم کی مسکور گن خوشبو اور کلائی پر بندھی قیمتی گھڑی انٹرسی کی امارت کا پتا دے رہی تھی۔ اس نے ضروری نہیں سمجھا کہ نظر اٹھا کر اس سستی کو دیکھا جائے اور پھر وہ اس کے کتنے قریب کھڑا تھا۔ اسے عجیب سا محسوس ہوا اس لیے خاموشی سے پانچ چھ قدم ہٹ کے کھڑی ہو گئی۔ ایک منٹ بھی پورا نہیں گزرا ہوگا کہ پھر وہی خوشبو۔ لیکن اس بار بھی اس نے نظر اٹھا کر دیکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ دوپل بھی نہ گزرے اور کہیں کسی سنی سی باز عبا وازا بھری۔

”سینے محترمہ! نام کیا ہوا ہے؟“







زبان نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ پھر سے ہمت  
مجمع کی لیکن اس بار بھی اسے کہنے کا موقع نہیں مل پایا۔  
اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس کے دوست اسد میر کو ہی اس کا ہمبند  
تھا اس کی ٹرانسفر کے بعد اسد میر کو ہی اس کا ہمبند  
سنجھانا تھا۔ دونوں میں بہت اچھی دوستی تھی۔ اسد میر  
کیبن میں کچھ تبدیلی کروانا چاہ رہا تھا اور اسی کے لیے  
اس نے شاہ میر کو فون کیا تھا کیونکہ ابھی کیبن میں سے  
اسے اپنا کچھ سامان اٹھانا پڑ رہا تھا۔

بات کے اختتام پر وہ مسکرا رہا تھا مگر جیسے ہی وہ سیل  
فون بند کر کے پلٹا تو ایمان حیدر کی غیر موجودگی نے اس  
کی مسکراہٹ چھین لی۔ ایک دم ہی اس کا موز آف  
ہو گیا اور اسی موز کے ساتھ وہ آفس روانہ ہو گیا۔

”السلام علیکم۔“  
”علیکم السلام۔“ یار میرے، کدھر تھے؟ بڑی دیر  
لگادی آئے میں۔“  
”کچھ خاص نہیں بس ٹریفک بہت تھی اس  
لیے۔“ صوفے پر بیٹھتے ہوئے شاہ میر نے  
جواب دیا۔

”کیا بات ہے جان جگر۔۔۔۔۔ آج کل بہار کی آمد آمد  
ہے تو پھر یہ یار کے چہرے پر خزاں کیوں لہرا رہی  
ہے؟“ اسد میر نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔  
”ایسی کوئی بات نہیں ہے یار۔۔۔۔۔ بس ایسے ہی  
تھکن ہے۔“ شاہ میر نے ساتھ پڑا میگزین اٹھاتے  
ہوئے کہا۔

”اچھا تو پھر اس تھکن کی وجہ بھی بتا دے جو  
درحقیقت تو اداسی ہے مگر تو اسے تھکن کا نام دے رہا  
ہے۔“ اس نے پہلے سے انداز میں پوچھا۔ شاہ میر نے  
بیار بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ ہمیشہ  
سے ہی ایسا تھا۔ فوراً جان جاتا کہ اسے کوئی پریشانی  
ہے۔ بھی تو چار سال پہلے ہونے والی اس دوستی نے

بیٹھنے دیا جائے۔“  
اس بار شاہ میر نے اسے رسید کرنے کے لیے  
پیپر ویٹ اٹھا لیا جسے دیکھتے ہی اسد نے ہاتھ جوڑ لیے۔  
”او بھائی میرے۔۔۔۔۔ رحم کر۔۔۔۔۔ آج نہیں پھر  
سبھی یہ حسرت پوری کر لیتا۔۔۔۔۔ آج تو ہم شان دار  
جاری کے ساتھ شہادت کی پہلی میز سی پہ قدم رکھنے  
جارے ہیں۔“

”مطلب؟“ شاہ میر نے پیپر ویٹ رکھتے ہوئے  
پوچھا۔

”مطلب یہ کہ خاکسار کے لیے بھابی کی لندن  
پلٹ بہن کو پسند کر لیا گیا ہے اور آج بابدولت انہیں اپنی  
پسند کی سند بخشے جارہے ہیں۔“

”تو پھر؟“ شاہ میر نے پوچھا۔

”تو پھر چٹ مٹھنی اور پٹ پیاد۔“ اسد نے چٹکی  
بجاتے ہوئے شوخی سے جواب دیا۔۔۔۔۔ اور ساری بات  
شاہ میر کی سمجھ میں آ گئی۔

”اچھا تو اب موصوف یہ چاہتے ہیں کہ باہر جو  
فہرست کی صورت آفتیں موجود ہیں، انہیں میں  
پنڈل کروں؟“

”ارے واہ‘ قربان جاؤں۔۔۔۔۔ اسے کہتے  
ہیں دوست۔ سچا دوست‘ تو کس قدر عظیم ہے  
میرے یار۔۔۔۔۔!“

”محترم اسد میر صاحب! براہ مہربانی آپ اپنا یہ  
مکھن اپنے سرال والوں کے لیے بچا کر رکھیے، ہم پر  
اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور ویسے بھی کالی دن ہو گئے بابا  
کی طرف چکر نہیں لگایا۔ بس میں نکلنے لگا ہوں۔“ شاہ  
میر نے اسے ستانا چاہا۔

”اے یار۔۔۔۔۔ مجھنے کی کوشش کر۔۔۔۔۔ میرے  
مستقبل کا۔۔۔۔۔ میرا مطلب میری شادی شدہ زندگی  
کے مستقبل کا سوال ہے۔۔۔۔۔ سب کیا سوچیں گے کہ

ہوئے والا دہلہا ہے کآ کر ہی نہیں دے رہا۔۔۔۔۔ بھابی  
کا فون بھی آچکا ہے۔ پوزیشن کو کھجور یار۔۔۔۔۔ تجھے تیری  
ایمان حیدر کی تحریروں کا واسطہ۔“ اور ایمان حیدر کی  
تحریروں کا واسطہ اسد کا آخری حرم ہوتا۔

”اچھا ٹھیک ہے اب اتنی مسکینیت بکھیرنے کی  
ضرورت نہیں ہے۔ تو جا، ہو جائے گا تیرا کام۔“  
”یہ ہوئی نیا یاروں والی بات بھٹکس آلات۔“

”اچھا سن! اپنی نیم پلیٹ میں‘ میں نے تھوڑی سی  
تبدیلی کر دالی ہے تھوڑی دیر میں دلاو لے کر آئے گا۔“

اس کی پے منٹ گردینا میں تجھ سے رات کو ملتا ہوں۔“  
اسد نے باہر نکلتے نکلتے تاکید کی۔  
”نہ فکر ہو کر جا۔ سب ہو جائے گا۔“

شاہ میر نے بیون سے پانی منگوا اور پانچ منٹ  
بعد پہلی امیدوار کو اندر بھیجے کو کہا۔

ایک کے بعد ایک امیدوار آتی رہی اور جاتی رہی مگر  
کوئی شاہ میر کو اسد کے معیار کے مطابق نہیں لگی۔ بے  
شک خود وہ ذرا من چلی اور شوخ طبیعت کا مالک تھا مگر

کام کے معاملے میں غفلت بالکل بھی برداشت نہیں کر  
سکتا تھا۔ اسے لگا پرسل اسٹنٹ کے انٹرویو کے لیے  
آنے والی تمام لڑکیاں محض ”پرسل“ کو ذہن میں رکھ کر

آئی ہیں۔ کسی کی بھی اداسی اسٹنٹ بننے کے حق  
میں نہیں تھیں۔ اسی لیے اب اسے آکٹا ہٹ ہونے لگی  
اور اس نے ارادہ کر لیا کہ بس یہ آخری امیدوار ہوگی۔

اس کے بعد وہ یہاں سے چلا جائے گا۔  
آخری امیدوار کا کہہ کر اس نے فائل ٹرے میں  
رکھ دی۔

چند سیکنڈز بعد اس نے دوبارہ نظر اٹھا کر دیکھا اور  
اس بار نظریں واپس پلٹتا بھول گئیں۔ سامنے وہی  
موجود تھی۔ ایمان حیدر۔۔۔۔۔

ایمان حیدر نے فائل آگے کی۔ جسے اس نے لے

کر سائیڈ پر رکھ دیا۔ اسے بیٹھنے کو کہا اور ایک بار پھر نظریں جھکائیں اور اب وہ سوچ رہا تھا، آج کے دن اس سے کون سی ایسی شے ہوگی جس کا صلہ اسے یوں اس کی دعاؤں کی قبولیت کی صورت میں ملا ہے۔ کچھ دیر کے لیے وہ بالکل ہی بھول گیا کہ وہ یہاں کیوں بیٹھا ہے اور پھر ذہن میں ایک خیال آیا اور انٹرویو کی نوعیت سے ہٹ کر سوال پوچھا حالانکہ وہ جانتا تھا اس سوال کا جواب اسے معلوم ہوگا۔

”سوس ایمان! بتائیے کہ جب صفین میں کتنے عراقی اور کتنے شامی کام آئے؟“

ایمان حیدر کے جواب سے اسے اس کے لمحے میں پہلی سی سختی محسوس نہیں ہوئی زار دیر کو تو اس کے دل میں خیال آیا کہ اسے سانسے پیٹھی نازک سی لڑکی سے ہر بات صاف صاف کہہ دے۔ بتا دے اسے کہ نازک سی نظر آنے والی اس لڑکی نے کیسے ایک مضبوط شخص کے دل کی اس کے احساسات کی اس کے خیالات کی دنیا تہ و بالا کر کے رکھ دی۔ بتا دے اس کے سانسے موجود یہ ہستی کیسے اسے فقط ایک ہی لمحے میں دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہو گئی ہے۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

اس کے اگلے سوال پر ایمان حیدر نے جس بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا تھا۔ اس کا دل چاہا دنیا کی تمام چیزوں میں بے یقینی کا رنگ اتر آئے۔ وہ ایک لمحہ جب ایمان حیدر نے بے یقینی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا اسے لگا اس کی تمام تر تحریروں کے ساتھ ساتھ ایمان حیدر نے اسے اس لمحے کا بھی قرض وار بنادیا ہو۔

ایمانت لیٹر کو تین چار مرتبہ پڑھ لینے کے بعد بھی اسے یقین نہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ اسے اس جاب کے

لیے اپنا کٹ کر لیا گیا ہے۔ ”ضرور کہیں غلطی ہو گئی ہے“ اس نے بے یقینی کی سی کیفیت میں ان سے کہا تو وہ مسکرائیں۔

”کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے کسی نے یہ بالکل صحیح جگہ آیا ہے اور صرف اور صرف ایمان حیدر کے لیے ہے۔“ ماما جان نے اس کے ہاتھ سے لیٹر لے کے لفافے میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”مجھے تو ابھی بھی یقین نہیں ہو رہا ماما جان! ایک سے ایک اسٹیکش اور اس جاب کے لیے موزوں لڑکی موجود بھی۔۔۔۔۔ پھر بھی۔۔۔۔۔؟“

”بعض اوقات ایسا ہوتا ہے بیٹا! جیسا ہم سمجھ رہے ہوتے ہیں اکثر حالات اس سے ہٹ کر ہوتے ہیں اور اب تم زیادہ سوچو نہیں جلدی سے شکرانے کے نوافل ادا کر لو میں چائے رکھ دیتی ہوں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھپتھا کر اٹھ کر بچن کی طرف چل دیں اور وہ وضو کرنے چل پڑی۔

☆

اس دن اس کا آفس میں پہلا دن تھا اپنے فلور تک پہنچتے پہنچتے اسے بہت سی بے یقینی سے لگی نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا جو اسے بہت کچھ باور کر رہی تھیں۔ جس کی وجہ سے اس کا سلیقہ سے اوڑھا گیا دوپٹہ اور سر پر بندھا اے کارف تھا۔ سب کی نظروں اور تحیروں کو نظر انداز کرتی وہ چپ چاپ اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔ اسے بیٹھے چند منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ اندر سے اس کا بلاوا آ گیا اور وہ یہ سوچ کر کہ پھر سے اس کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تھوڑی سی بد مزہ ہو گئی۔

دروازہ ناک کر کے وہ اندر داخل ہو گئی مگر جیسے ہی اندر گئی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی کیوں کہ نہ صرف ایمان کی حالت بلکہ وہاں موجود آدمی بھی بدلا ہوا تھا۔

”لیس مس ایمان حیدر کم ان۔“

”تھینک یوسر۔“

”تشریف رکھیے۔“ سامنے بیٹھے شخص نے اپنے مقابل کر سکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تھینک یوسر۔“ وہ سیدھی اس کرسی پر جا بیٹھی جس کے برابر میں پہلے کوئی خاتون براجمان تھی۔

”مس ایمان! یہ مسز فاروقی ہیں! اگلے ہفتے تک

یہ آپ کے کام میں مدد کریں گی۔ اپنے کام سے متعلق ساری باتیں آپ ان سے معلوم کر سکتی ہیں۔“ انہوں نے سامنے بیٹھی خاتون کی جانب دیکھتے ہوئے بتایا۔

”جی سر۔۔۔۔۔“ مختصر سا جواب دے کر اس نے ایک کھوجتی ہوئی نگاہ ٹیبل پر ڈالی۔ نیم پلیٹ پہ نگاہ روک کر نام پڑھا۔

”اسد میر شاہ مینجنگ ڈائریکٹر۔“

اس کے لیے آنے والا ہر لمحہ اپنے اندر حیرتوں سموئے ہوئے تھا۔

”یہ کیا معاملہ ہے۔۔۔۔۔ وہ ساگی کہاں گیا؟“ اس نے سوچا۔ یمن سے باہر آ کر مسز فاروقی نے اسے اس کے کام کی تفصیلات بتائیں اور اسے ایک لیٹر تیار کرنے کو کہا اور ساتھ میں یہ بھی تاکید کی کہ جیسے ہی لیٹر تیار کر کے پرنٹ آؤٹ نکال کر سر کو جا کر دے۔

☆

شاہ میر بابا جان سے ملنے کے لیے گیا۔ واپسی پر اس نے اسد کے آفس کے رخ کیا۔

”بتائیے ایم ڈی صاحب! کیسے رہے حالات؟“ شاہ میر نے بڑی گرم جوشی سے سوال کیا۔

”حالات۔۔۔۔۔ بھی حالات تو کچھ زیادہ ہی با

حیال ہے۔“

”اب جناب اپنے الفاظ کی تشریح بھی فرمادیتے۔“ شاہ میر کچھ سمجھتے ہوئے بولا تو اسد مسکرا دیا۔

”جیسی آپ کی ایمان حیدر کی آنکھوں کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے کیا یا پھر جن سے وہ ہم کلام ہوتی ہیں، ان کے چہرے انہیں سامنے کے بجائے زمین میں نظر آتے ہیں؟“ اسد نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

”تشریح ہوگی، اب ذرا تفصیل کی طرف آجائیے اور صاف صاف بتائیے۔“

”ارے صاف صاف بات بھی بتا دیں گے۔ ایسی بھی کیا بات ہے پہلے ذرا۔۔۔۔۔ دروازے پر ہونے والی دستک سے اسد کا جملہ ادھر ادھر کیا اور وہ اٹھ کر اپنی کرسی پہ جا بیٹھا۔

”لیس کم ان۔“

اس بار بھی داخل ہوتے ہی حیرانی نے اس کا استقبال کیا ایمان نے بس ایک ہلکی سی نظر شاہ میر پہ ڈالی اور پھر جھکالی۔

”سر یہ لیٹر۔“ اس نے لیٹر اسد کی طرف بڑھا دیا۔ شاہ میر پر ابھی نگاہ سے لے کر واپسی تک اس کی نگاہیں جھکی رہیں جنہیں شاہ میر کی نظروں نے اس کی موجودگی تک اپنے حصار میں لیے رکھا۔ اس کے باہر جاتے ہی اسد شاہ میر کی طرف متوجہ ہوا۔

”اب سمجھ میں آیا؟“ اس کے جواب میں وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ بھلا وہ اس کی اس عادت سے انجان رہ سکتا تھا؟ اس نے تو اسے اس کی تحریروں سے ہی جان لیا تھا۔ جب جب بھی وہ اس کی جھکی نظروں کو دیکھتا اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھنے کی خواہش مزید جڑ پکڑ لیتی اور وہ ایک ہی بات سوچتا۔

”دیکھو گا۔۔۔۔۔ ضرور دیکھوں گا، اس جمیل کی گہرائی۔۔۔۔۔ مگر حق سے۔“

☆

ایمان حیدر کو جو اس کے ہفتہ ہو چلا تھا۔ اس نے اس دن کے بعد دوبارہ شاہ میر کو آفس میں نہیں دیکھا۔



اس دن وہ معمول کے مطابق گھر لوٹی تو ایک تبدیلی اس کی نظر پڑی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے گھر کی فضا میں تبدیلی محسوس کی حالانکہ اس کے اور ماما جان کے علاوہ کوئی نہ رہتا تھا گھر میں مگر اسے احساس ہوا کہ کچھ تو ہوا ہے جو معمول سے ہٹ کر ہے اور اس کی وجہ جاننے کے لیے اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کھانے کے دوران ہی ماما جان نے باتوں باتوں میں اس سے پوچھا۔

”بیٹا! تم شاہ میر کو کب سے جانتی ہو؟“

ایمان حیدر کا منہ میں نوالے جاتا ہوا رہ گیا۔

”ماما میں اس کے نام کے علاوہ کچھ نہیں جانتی۔“

اس نے ایمان داری سے جواب دیا۔ ”کیا بات ہوئی ہے ماما جان؟“

”بیٹا! آج شاہ میر اور رحمن صاحب (بابا جان) آئے تھے تمہارا رشتہ لے کر ایمان کو اپنی ساستوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔“

”لیکن ماما جان! میں تو اسے جانتی تک نہیں۔“

ایمان نے کھانے کی پلیٹ پرے کرتے ہوئے کہا۔

”میں جانتی ہوں بیٹا! اس بات کا اعتراف خود شاہ میر نے بھی کیا ہے۔“ ماما جان نے اسے ان کے اور اسے مامین ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا اور شاہ میر کے متعلق جو بابا جان نے انہیں بتایا تھا سب اس کے گوش گزار کیا۔ بابا جان کی اور ان کی واقفیت اسے وقفیت ایمان کے والد کے حوالے سے تھی۔ اس کے والد کے گزر جانے کے بعد بابا جان باقاعدگی سے ان دونوں کی خیریت معلوم کرتے رہے۔ ایک دو بار جب ایمان کے لیے رشتے کا ذکر چلا تو بابا جان نے شاہ میر کا نام پیش کیا تھا مگر شاہ میر سے براہ راست وہ آج لی تھیں۔

”دیکھو بیٹا! مجھے رشتہ ہر لحاظ سے موزوں لگا ہے اور پھر یہ رحمن صاحب کے توسط سے آیا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن بیٹا! زندگی تمہیں گزارنی ہے اور اس معاملے میں فیصلہ کرنے کا تمہیں مکمل حق ہے اور مجھے یقین ہے تم سوچ سمجھ کر درست فیصلہ کرو گی۔ مجھے شاہ میر میں کوئی خالی نہیں نظر آتی بلکہ اس کی آنکھوں میں نہیں نے وہ بات محسوس کی ہے جو تمہیں ہر مرد و گرم سے بچا کر رکھ سکتی ہے اور یہ بات میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ رہی ہوں۔“

انہوں نے ذرا دیر تک کر ایمان کی جانب دیکھا، وہ مسلسل گلاس کے کناروں پر انگلی پھیر رہی تھی اور اس کی نظر گلاس میں موجود پانی پر لگی تھی۔

”تم جو بھی فیصلہ کرو مجھے بتا دینا لیکن ذرا جلدی۔ انہوں نے مکمل تک جواب مانگا ہے کیوں کہ شاہ میر کو چار روز بعد کینیڈا روانہ ہونا ہے۔“

ماما جان اسے تاکید کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں اور وہ فقط نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔

مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر وہ سیدھی کچن کی طرف چلی گئی۔ جہاں ماما جان رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اس نے چپ چاپ ماما جان کے ہاتھ سے سبزی لے لی اور اسے دھو کر کاٹنے پیٹھ گئی۔ دراصل وہ ماما جان کا اپنا فیصلہ سنانے آئی تھی اس لیے تھوڑی دیر کے توقف کے بعد اس نے بات شروع کی۔

”ماما جان! میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“

”کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”مجھے شاہ میر سے شادی نہیں کرنی۔“

”اس کی وجہ جان سکتی ہو؟“ ماما جان نے پوچھا۔

”مجھے وہ پسند نہیں ہے۔“

”یہ تو کوئی وجہ نہ ہوئی انکار کی۔ ہاں اگر تمہیں اس

میں کوئی برائی نظر آئی ہے تو بتاؤ۔“

”ماما جان! جب میں اسے ٹھیک سے جانتی ہی نہیں تو اس کی اچھائی یا برائی کے متعلق کیسے جانوں گی؟“

”تو پھر تم نے درست فیصلہ نہیں کیا۔ کسی کو بتانا جانے محض اس سے ناپسندیدگی کی بنا پر تم انکار نہیں کر سکتیں اور ویسے بھی شاہ میر اپنی عمر کے لڑکوں سے مختلف طبیعت کا مالک ہے۔ جس طرح آج کل.....“

”کوئی مختلف نہیں ہے ماما جان! بلکہ وہ تو ان سے بھی آگے ہے آپ کو علم ہے ماما جان وہ کتنے دنوں تک لگا تار میرے تعاقب میں رہا ہے کیا مقصد تھا اس کا یہ سب کرنے کا؟ کیا جانا چاہتا تھا وہ؟ میں کس کردار کی مالک ہوں؟ کہاں آتی جاتی ہوں؟ کیا کرتی ہوں؟ پوری تعقیب کر لینے کے بعد اس نے رشتہ بھیجا ہے؟“

اس نے ماما جان کی بات کاٹ کر کہا۔

”بیٹا! یہ محض تمہاری غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔ حقیقت جانے بنا کسی کے بارے میں یوں رائے قائم کرنا کوئی سمجھ داری نہیں۔“ انہوں نے اسے سمجھانا چاہا۔

”نہیں ماما جان! مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے اور آپ پلیز انہیں جواب دے دیں۔“

”بیٹا! میں جانتی ہوں تم ایک بار پھر ذرا سکون سے اس بارے میں سوچو۔“

”ماما جان! میں اچھی طرح سوچ چکی ہوں اور ہزار مرتبہ سوچ لینے کے بعد بھی میرا فیصلہ نہیں بدلے گا۔ بس مجھے اس شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزارنی۔ اس کے علاوہ آپ جہاں چاہیں گی میں آپ کو ماپوں نہیں کروں گی۔“ وہ اپنا فیصلہ سنا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کئی ہوئی سبزی کی ٹوکری اٹھا کر نل کے نیچے لے گئی۔

رات کو دیر تک جاگنے کے باعث صبح اس کی آنکھ ذرا تاخیر سے کھلی۔ آفس سے لیٹ ہو جانے کی فکر میں ناشتا کیے بغیر ہی نکلی گئی۔ حالانکہ اسے خاصی بھوک لگی

تھی اور وہ من ہی من اپنے آپ کو کوس رہی تھی کہ کیا ضرورت تھی رات دیر تک اس ساکھی کے بارے میں سوچنے کی۔

آفس پہنچ جانے کے کافی دیر بعد بھی اس پر جھنجھلاہٹ طاری رہی۔ اسی دوران اس کی ٹیبل پر رکھا فون بجا۔

”لیس؟“ اس نے فون اٹھا کر کان سے لگایا۔

”مس ایمان! پلیز اندر آئیں فوراً۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ وہ خاموشی سے فون رکھ کر اسد کے کیمین کی جانب بڑھ گئی۔ یہ جانے بنا کہ فون یہ آواز کس کی تھی۔ دروازہ ناک کر کے وہ اندر داخل ہوئی اور حسب معمول خاموشی سے ڈکٹیشن لینے کے لیے سامنے کرسی پہ جا بیٹھی۔ رائٹنگ پیڈ کا نیا صفحہ کھولا اور بدستور لکھا جھکائے بیٹھی رہی۔

”لیس سر!“

”مس ایمان! اپنے انکار کی وجہ ذرا تفصیل سے بیان کر دیجئے۔“

”یہ اسد سر تو نہیں اور پھر؟“ اس نے سینڈ کی تاخیر کے بغیر نظریں اٹھا کر سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”پلیز مس ایمان! مجھے میرے سوال کا جواب چاہیے۔ اپنے انکار کی کوئی ایک قابل قبول وجہ بتا دیجئے۔ اس کے بعد وعدہ میں آپ کو پریشان نہیں کروں گا۔“ شاہ میر کے لہجے میں ملن سی بے چینی پا کر ایمان نے رخ موڑ لیا۔

”آئی ایم سوری میں آپ کے کسی بھی سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں اور نہ میں آپ کو وجہ بتانا ضروری سمجھتی ہوں۔“

”یہ نا انصافی ہے ایمان حیدر۔“ وہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

”دیکھئے مسٹر! زندگی میری ہے اور میں فیصلہ کر چکی ہوں۔“

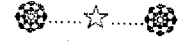
”تو بدل دو یہ فیصلہ۔“ اس بار بھی شاہ میر کے لہجے میں التجا، کم اور حکم زیادہ تھا اور یہی لہجہ ایمان کو تپا گیا۔

”ایمان حیدر اپنے فیصلے نہیں بدلا کرتی اور نہ کوئی مجھے اس کے لیے مجبور کر سکتا ہے۔“ وہ حتیٰ لہجے میں کہتی دروازے کی جانب چل دی۔

”سنو ایمان.....“ شاہ میر نے دل سے پکارا۔ وہ بنا رخ موڑے رک گئی اور وہ ایک بار پھر چل کے اس کے مقابل آ رکا۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پہ باندھ لیے اور نظروں کو اس کی آنکھوں میں آزاد چھوڑ دیا۔

”اس وقت خدا کو حاضر ناظر جان کر میں تمہارے سامنے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں ایمان حیدر..... مجھے تم سے دل کی تمام تر گہرائیوں سے محبت ہے اور بے انتہا محبت ہے۔ پلینز بدل دو اپنا فیصلہ۔“

اس نے ذرا دیر کو نظر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں سچائیوں کے دیپ اپنی پوری آب و تاب سے جل رہے تھے مگر ان کی تپش مقابل کے دل کو نہیں پکھلا سکی۔ وہ بنا کچھ کہے کمرے سے نکل گئی اور شاہ میر نے بھی ایک فیصلہ کر لیا۔



اسد کی منگیت عریشہ بہت خوش اخلاق اور شوخ لڑکی تھی۔ شاہ میر کی اس سے منگنی پر ملاقات ہوئی تھی۔ اسد نے شاہ میر کے ترقی کے متعلق بھی بتایا اسی لیے اس نے مطالبہ کیا کہ جانے سے پہلے ٹریٹ دے کر جائے۔ کینیڈا جانے سے دو روز قبل وہ اسد اور عریشہ کو ان کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے لے گیا۔

تھوڑی دیر قبل ویٹران کے سامنے جوس کے گلاس رکھ کے گیا اور اب عریشہ نے بات چیت کے دوران اسد کی شکایت پیش کی کہ وہ اسے بالکل بھی وقت نہیں

دیتا ہے۔ جب کہ وہ اسے ٹھیک سے جانا چاہتی ہے سمجھنا چاہتی ہے اور اس کے لیے وقت تو درکار ہوگا ہی۔

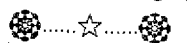
”جب بھی فون کرو۔ بڑی ہوں صبح کو فون کرو بڑی رات میں فون کرو بڑی ہر وقت بڑی بڑی بڑی..... آخر ایسی بھی کیا بیزیت۔“

عریشہ کے آخری لفظ ”بیزیت“ پر اسد کو ہنسی آ گئی۔

”شاہ میر نے اسے ہنسائے کی خاطر اسد کے یونیورسٹی کے ناکام عشق کا ذکر چھیڑ دیا۔ جسے سن کر وہ جی بھر کے ہنسی تھی۔ آخر کو اب اس کے ہاتھ بھی اسد کو تنگ کرنے لیے جواز آ گیا تھا۔

آفس سے آف ہونے کے باعث ایمان نے ارادہ کیا کہ آج بازار جا کر اپنے لیے دو تین سوٹ لے آئے اب چونکہ وہ جاب کرنے لگی تھی اس حساب سے اسے مناسب کپڑوں کی بھی ضرورت تھی۔ اپنا مطلوبہ سامان لینے کے بعد اب وہ گھر جانے کے لیے رشک کی منتظر تھی۔ رشک روکنے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ نظر سامنے موجود فاسٹ فوڈ ریسٹورانٹ میں کھٹکھٹاتی لڑکی پر جا پڑی اور اس کے ساتھ بیٹھا شخص بے شک شاہ میر ہی تھا اسے یوں کسی لڑکی کے ساتھ دیکھ کر اس کی ناپسندیدگی کی جگہ نفرت نے لے لی تھی۔

”اچھا تو یہ ہے تمہاری بے انتہا محبت..... جو اور پتا نہیں کس کس کے حصے میں جاگئی۔ ایک طرف تو شرافت کا لبادہ اوڑھ کر رشتا بھیجا اور دوسری طرف جناب ہو ملک فرما رہے ہیں۔“ تمام راستے وہ سوچ سوچ کر گزرتی رہی۔



حسب معمول ایمان آفس کے لیے نکلی۔ مختصر فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ شاہ میر پر نظر پڑی۔ وہ گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا، اسے دیکھتے ہی اس کی جانب بڑھ گیا۔ اسے اپنی جانب آتا دیکھ کر ایمان کے

قدموں میں تیزی آگئی مگر اس کی رفتار اس کا ساتھ نہیں دے سکی۔ شاہ میر نے اس کے قریب پہنچ کر سختی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”پلو میرے ساتھ۔“

”کک..... کہاں؟“ ہاتھ چھڑانے کی سعی میں یہ مشکل اس کے حلق سے الفاظ نکلے۔ اس نے نظر گھا کر آس پاس دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ مارے خوف کے اس کی گلابی رنگت سفید پڑ گئی۔ ایک دم سے ہی اس کے حواسوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اسے لگا وہ بس گر پڑے گی۔ شاہ میر نے اسے لے جا کر گاڑی میں بٹھا دیا اور وہ کسی روبروٹ کے مانند چلتی ہوئی گاڑی تک پہنچی مگر گاڑی میں بیٹھے تک وہ ہوش سے بے گانی ہو چکی تھی۔

شاہ میر نے پانی کی چھٹیں ڈال کر اسے ہوش میں لانا چاہا ہوش میں آتے ہی وہ چیخ پڑی۔ اس نے آس پاس کا جائزہ لیا وہ شہر سے دور کسی انجان سمنان علاقے میں تھی۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولنا چاہا مگر گاڑی آٹومیٹک لاکڈ تھی۔

شاہ میر خاموشی سے اس کی کارروائی دیکھتا رہا۔ کافی کوششوں کے بعد وہ دروازے کے ساتھ لگ کے بیٹھ گئی۔ اس پر خوف غالب آنے لگا۔

”ک..... ک..... کیا چاہتے ہو؟ کیوں لائے ہو مجھے یہاں؟“

”زندگی..... تمہیں چاہتا ہوں میں اور یہاں تمہیں اپنا بنانے لایا ہوں۔“ شاہ میر نے اطمینان سے جواب دیا۔

”ک..... کیا مطلب؟ کیا کرنا چاہتے ہو تم؟“

”ذرو نہیں۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ بس ان کاغذات پر سائن کرو۔“ شاہ میر نے ڈیش بورڈ سے کچھ پیرز نکالے۔

”کیسے کاغذ؟“

”نکاح کے۔“

”کیا.....؟“

”ہاں! نکاح کے کاغذات پر سائن کرو و پھر میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔“

”نہیں کبھی نہیں۔“

”ٹھیک سے مرضی ہے تمہاری۔ میرا تو کوئی نہیں ہے تمہارے تو گھر پر کوئی ہے جسے تمہارے گھر پہنچنے کا انتظار رہتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

”ماما جان.....“ ماما جان کا خیال آتے ہی وہ ضرور پریشان ہو گئی۔

”پلینز تمہیں خدا کا واسطہ۔ مجھے گھر چھوڑ آؤ۔“

ساتھ ہی آنکھوں سے موتی جھرنے لگے۔ شاہ میر کا دل کٹ گیا مگر اس نے خود اسے مجبور کیا تھا ایسا قدم اٹھانے کے لیے۔

”تم میری بات مان لو میں تمہاری بات مان لوں گا۔“

”تم زبردستی نہیں کر سکتے۔“

”بالکل کر سکتا ہوں۔ جو محبت کرتے ہیں وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ معلوم تو ہوگا ہی تمہیں، محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے کاغذ اور قلم اس کی جانب بڑھائے۔ جنہیں اس نے سختی سے جھٹک دیا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم کہو تو ساری زندگی تمہارے ساتھ اس گاڑی میں گزار دوں لیکن اس سے پہلے اپنے بارے میں سوچنا۔ صرف آج کی رات تم گھر نہیں پہنچیں تو کیا ہو سکتا ہے؟ بلکہ کیا کیا نہیں ہو سکتا۔“ اس نے اسے ڈرانا چاہا اور کچھ بھی ہو وہ اپنی عزت پر کوئی حرف کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ شاہ میر نے ایک بار پھر کاغذات آگے کیے۔ اس بار اس نے



قارئین کی کئی نسلوں کو متاثر کرنے والا پاکستان کا واحد صاف ستھرا اور تفریحی جریڈہ وقت کے ساتھ ساتھ نئے آجنگ نئے رنگ اور نئے انداز میں قدیم اور جدید ادب کا استخراج لئے ہر ماہ آپ کی دہلیز پر

قارئین کی دلچسپی کیلئے خصوصی صورت سلسلے

برخیز شعور شاعری کا منفرد سلسلہ خوشبو بخشنے والی نظمیں ذوق انگیز اقتباسات اقوال بڑی احادیث وغیرہ

بہترین طرز کی خدمت کے لئے بلا کر 1/2 3562077

دب کی ٹو کچھ زیادہ ہی تیز تھی۔ وہ بدستور دروازہ کھائے اسے بے یقینی سے دیکھتی رہی اور ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں حسین سابع یقینی کا رنگ دیکھ کر وہ شوق ہوا۔

”نظر لگانے کا ارادہ ہے کیا؟“

”جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔“

”اوہ واقعی ارادہ ہے۔“

”جی نہیں۔۔۔۔۔ اس کی بوکھلاہٹ سے وہ جی بھر کے مظلوظ ہوا۔

”کون ہے ایمان؟“ اما جان لاؤنج میں چلی۔

آئیں۔ ”ارے شاہ میر۔“

”السلام علیکم تھی۔“

”وعلیکم السلام بیٹا! جیتے رہو خوش رہو۔ تم

کب آئے؟“

”آئی! اکل رات ہی آیا ہوں۔“

”آؤ بیٹھو۔۔۔۔۔ جاؤ ایمان چائے لے کر آؤ۔“

”نہیں آئی، آج نہیں مجھے ذرا جلدی ہے۔

دراصل میرے دوست اسد کا ولیمہ ہے۔ میں بس یہ ڈیزائن دکھانے آیا تھا۔“ اس نے ایک فائل ان کی جانب بڑھائی۔ ”آپ پلیئر شادی کارڈ کا ڈیزائن پسند کر لیجئے، میں جاتے ہوئے پرنٹنگ کے لیے دیتا جاؤں گا۔“

”لیکن بیٹا اتنی جلدی۔“

”آئی آپ کو یاد ہوگا میں جانے سے پہلے آپ کو آگاہ کر کے گیا تھا میں محض دس روز کی اجازت چھٹی پر آیا ہوں۔“

”ٹھیک ہے بیٹا! جیسے تمہاری مرضی ویسے ہماری تیاری بھی مکمل ہے۔ لو ایمان اس میں سے کارڈ پسند کر لو انہوں نے فائل ایمان کی طرف بڑھائی۔

”اما جان! آپ خود پسند کر لیجئے۔“ کہہ کر وہ اندر

چاہتی ہیں تو میں دینے کے لیے تیار ہوں۔“

”لیکن اس طرح اچانک تم دونوں نے نکاح کیسے کر لیا؟“ اما جان مزید پریشان دکھائی دیے لگیں۔

”آئی! میں ایسا ہرگز کرنے کا ارادہ نہ کرتا اگر ایمان نے رشتے سے انکار نہ کیا ہوتا۔ بے شک میرا طریقہ غلط تھا مگر میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔“

اما جان نکاح کے کاغذات دیکھنے لگیں۔ شاہ میر نے ایک نظر سر جھکے کھوئی کھوئی سی بیٹھی ایمان پر ڈالی اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔



وقت کا کام ہے گزرتا اور اپنی رفتار سے گزر رہا تھا۔ شاہ میر کو گئے ایک ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اما جان نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر شادی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ ایمان اس معاملے میں بالکل خاموش تھی بلکہ جب بھی اما جان کچھ خریدنے سے پہلے اس کی پسند چنانچا تیس تو وہ ہنسی کی سی ہنس دیتی۔

”اما جان! وہ نہیں آئے گا۔۔۔۔۔ یہ سب ساری تیاریاں دھری کی دھری رہ جائے گی۔“

اس کے جواب میں اما جان خاموشی اختیار کر لیتی۔

”جس نے جا کر خبر تک نہیں لی وہ بھلا کیوں واپس آئے گا۔“ اس کی ہر بات کا اختتام اسی جملے پر ہوتا۔

سر میں شدید درد ہونے کے باعث ایمان نے آفس سے چھٹی لے لی تھی۔ اما جان کچن میں موجود اس کے لیے قہوہ تیار کر رہی تھیں اور وہ لاؤنج میں دھرے صوفے پر سینے تک چادر تان کر لیٹی ہوئی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ اما جان اندر مصروف ہوں گی، اس خیال سے وہ اٹھ کر دروازہ کھولنے چل دی۔ دروازہ کھولتے ہی اس پر حیرتوں اور بے یقینی کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ سامنے شاہ میر موجود تھا۔ ہمیشہ کی طرح آنکھوں میں محبتوں کے دب چلائے مگر آج اس

خاموشی سے دستخط کر دیئے۔

”گڈ۔۔۔۔۔ اب تم پر صرف میرا حق ہے۔“ کہہ کر اس نے گاڑی اشارت کر دی۔

دروازے پر ہونے والی دستک سے اما جان نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ ایمان کی واپسی میں ابھی دوڑھائی گئے باقی تھے۔

”شاہد جمن بھائی ہوں گے۔“ سوچ کر انہوں نے دروازہ کھولا مگر سامنے شاہ میر اور ایمان کو اس کی آڑی ہوئی رنگت کے ساتھ دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

”بیٹا تم! اس وقت۔۔۔۔۔؟ خیریت تو ہے۔۔۔۔۔؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟“ اما جان اس کا ہاتھ پکڑ کے اندر لے گئیں۔

”آئی! شاہ میر کے پکارنے پر انہوں نے مڑ کر دیکھا۔

”بیٹا! کیا بات ہوئی ہے تم ہی بتاؤ۔“

”آئی! آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہے یہ میرے ساتھ تھیں۔“

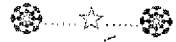
”تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔؟“

”جی۔۔۔۔۔“ کچھ دیر توقف کے بعد وہ پھر گویا ہوا۔

”آئی! آپ کی بیٹی جیسی تھی ویسی ہی صحیح سلامت آپ کے سامنے ہے مگر اب یہ میری امانت ہے کل صبح میں یہاں سے روانہ ہوا ہوں اور میں آپ سے عہد چاہتا ہوں کہ میری واپسی تک آپ اسے فقط میری امانت سمجھ کر خیال رکھیں۔ ٹھیک دو ماہ بعد میں اسے اپنے آؤں گا۔ اس درمیان آپ اپنی مرضی سے شادی کی تیاری کر سکتی ہیں لیکن میرے آنے تک آپ کو مکمل تیاری کر لینی ہوگی کیونکہ میرے لیے فقط چھ سات روز کے لیے آنا ممکن ہو پائے گا۔ یہ رہے نکاح کے کاغذات۔ ہم دونوں کے علاوہ گواہوں کے دستخط بھی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ کوئی تحریری ثبوت



کمرے میں چلی گئی۔



کمرے میں جا بجا بکھرے پیلے اور سرخ گلابوں سے یوں محسوس ہوتا تھا جسے بہاریں صرف اسی ایک کمرے میں اتری ہوں۔ جملہ عسروں کی ایسی ج دج دیکھ کر کوئی بھی لڑکی اپنی قسمت پر ناز کر سکتی تھی مگر وہ..... خوشی کی ایک رقم بھی عیاں نہ تھی اس کے چہرے پر نہ کسی کی ہو جانے کا احساس، نہ کسی کی آہٹ کا انتظار نہ ہی دل کی دھڑکنوں میں کوئی انتشار۔

وہ خاموشی سے بیڈ سے اتر کر سنگھار میز کے سامنے جاڑکی کی خالی خالی نگاہوں سے اپنا جائزہ لیا اور پھر ایک ایک کر کے اپنے زیورات اتارنے لگی۔ اسی لمحے شاہ میر کمرے میں داخل ہوا۔ شیشے میں دیکھ لینے کے باوجود بھی اس نے اس کے آنے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ خاموشی سے اپنا کام جاری رکھا۔ شاہ میر بھی چپ چاپ کھڑا اس کا خاموش احتجاج دیکھتا رہا۔ شاہ میر نے اس کے قریب جا کر اسے اس کے شانوں سے تھام۔ وہ کسی زخمی شیر کی طرح مڑی۔

”ہاتھ مت لگانا مجھے..... دور ہو مجھ سے۔“ شاہ میر کو اس سے اسی قسم کے روپے کی توقع تھی۔ اس نے مزید اس سے کچھ نہ کہا خاموشی سے کوٹ کی جیب سے جھلم کی ڈبیا نکال کر اس کی جانب بڑھادی۔

”یہ تمہارے لیے ہے اسے قبول کرلو۔ میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں تمہاری مرضی کے بغیر چھوڑنے کی گستاخی کبھی نہیں کروں گا۔“ وہ اس کی بات آن سنی کر کے واش روم میں گھس گئی۔ شاہ میر نے ڈبیا ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی اور خود کمرے سے باہر نکل گیا۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے اپنا آپ جنت میں محسوس ہوا۔ کمرہ ابھی تک گلابوں کی خوشبو سے مہک

رہا تھا۔ وہ ایک دم سے اٹھ بیٹھی۔ اسے عجیب سے احساس نے گھیر لیا کچھ دیر وہ کھل اوڑھے بیٹھی رہی پھر ہاتھ بڑھا کر اس نے پیلے گلابوں کی ایک لڑی تھام لی۔ اس نے گجرات کی طرح اسے کلائی پہ لپیٹ لیا۔ ٹھیک اسی وقت شاہ میر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا دشمن جاں پر نظر پڑی تو گزری رات کی نامکمل آرزوؤں نے انگڑائی لی..... مگر ضبط کی ڈور تھا سے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا رکھا۔ بالوں میں برش کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

”فریش ہو جاؤ جلدی سے“ ماما جان کا فون آیا تھا، وہ آدھے گھنٹے تک بیٹھ رہی ہیں۔ ناشتا لے کر ان کے ساتھ گھر جا کر اپنا کچھ سامان لینا جا ہوتو لے آنا لیکن شام تک پیکنگ مکمل کر لینا ہمیں آج رات کو ہی نکلنا ہے۔“

”کہاں.....؟“ ایمان نے پوچھا۔ شاہ میر برش رکھ کر اس کے قریب آن رکا وہ غیر محسوس طریقے سے سمٹ کر بیٹھ گئی۔

”اے گھر.....“ اس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا اور مسکرا کر باہر نکل گیا۔ ماما جان ناشتالے کر بیٹھ چکی تھیں اس نے فون کر کے اسد کو بھی بلا لیا تھا اور اب سب ساتھ ناشتہ کر رہے تھے۔ عربیہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے منے میں تھی اسی لیے اسد کے ساتھ نہیں آسکی۔

”تو پھر کہاں گھمانے لے جا رہا ہے بھابی کو؟“ اسد کے سوال پر دھیسے سے تبسم نے شاہ میر کے ہونٹوں کو چھوا۔ جب کہ ایمان بدستور خاموش رہی۔

”ترکی جائیں گے۔“

”ترکی..... تجھے اور کوئی جگہ نہیں ملی ہنی مومن منانے کے لیے؟“

”کیوں اس میں کیا برائی ہے؟“

”لیکن ترکی ہی کیوں؟“

”وہ تو نہیں سمجھ گا۔“ شاہ میر نے ایمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا جس کے چہرے پر ترکی کا نام نہ کر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا بہترین کالم نگار کی حیثیت سے مقامی میگزین میں اس کا انٹرویو چھپا تھا۔ جس میں اس سے سوال کیا گیا تھا کہ اگر بطور تھم اسے کسی ملک کی سیاحت کا موقع ملے تو وہ کہاں جانا پسند کرے گی۔ جس کے جواب میں اس نے ترکی جانے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن وہ یہ سوچ کر حیران تھی کہ اس بات کا علم شاہ میر کو کیسے ہوا؟

ماما جان اور اسد نے ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ انہیں ائر پورٹ سے رخصت کیا۔ ماما جان سے جدا ہوتے وقت ایک عجیب سے احساس سے اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ اسے بار بار رونا آ رہا تھا۔

”جاؤ بیٹا! خدا تمہارا حامی و ناصر ہے خدا تمہیں ساری زندگی تمہارے ساتھی کے ساتھ خوش رکھے۔“ ماما جان نے دل کی گہرائیوں سے دعا دی۔

شاہ میر کی ارجنٹ چھٹی کی وجہ سے انہیں اپنا بیٹی مومن فقط تین روز تک محدود رکھنا پڑا۔

اسلام آباد پہنچ کر ایمان عجیب سے احساس کا شکار تھی۔ اپنے اس احساس کو وہ کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔ وہ احساس جو کسی خواہش کی تکمیل سے انسان کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔

شاہ میر نے محسوس کیا کہ وہ اس کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی اس کے ساتھ موجود نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس کی اس کیفیت کی وجہ اس کی موجودگی ہے۔ اسی لیے اس نے غیر محسوس طریقے سے ہر ممکن کوشش کی کہ خود کو اس سے دور رکھے تاکہ وہ اکیلے میں جس طرح چاہے جی بھر کے انجوائے کر سکے۔

اب انہیں کینیڈا پہنچے سات آٹھ روز بیت چکے

تھے۔ شاہ میر نے آفس جوائن کر لیا تھا۔ زندگی ڈگر پہ چلنے لگی تھی۔ وہ دن رات خاموشی سے اس شخص کے ساتھ گزار رہی تھی۔ وہ شاہ میر کے لیے کھانا بناتی اس کے کپڑے پر لیس کرتی۔ اس کے جوتے پالش کرتی۔ ایک روز شاہ میر نے حلیم کی فرمائش کی جب کہ شاہ میر کو حلیم بالکل بھی پسند نہ تھا اور اس بات سے ایمان بھی واقف تھی وہ بچن میں مسالا تیار کر رہی تھی۔ جب شاہ میر کچن میں چلا آیا۔ وہ جانا چاہتا تھا وہ یہ سب کیوں کر رہی ہے۔ ایک طرف تو مجھ سے ٹھیک سے بات تک نہیں کرتی دوسری طرف میرے کہنے کی دیر ہوئی ہے فوراً ٹیکسٹل ہو جاتی ہے۔ وہ آج ملکی کر کے مڑی تو وہ سامنے تھا اس نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”سنو زندگی..... اب بس کر دو نا۔ کب تک آزماتی رہو گی؟“

”کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ اس نے ہاتھ چھڑا لیے۔ ”تمہیں اچھی طرح علم ہے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔“

اس کی بات کے جواب میں اس نے خاموشی سے منہ پھیر لیا۔

”آخر کیا مسئلہ ہے یار، کب تک یہ ناراضی رہے گی؟“

”ناراض نہیں ہوں میں۔“

”تو پھر کیا وجہ ہے؟“

”کچھ نہیں۔“

”کچھ تو ہے۔“ اس نے شانوں سے پکڑ کر رخ اپنی جانب کیا۔ ”بتاؤ کیا بات ہے؟“

”بس آپ مجھے پسند نہیں۔“ غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکل گیا۔

”تو پھر یہ بھاگ بھاگ کر کام کرنے کی وجہ؟“

”بیوی ہوں اس لیے فرض ہے۔“

Courtesy [www.pdfbooksfree.pk](http://www.pdfbooksfree.pk)

کرنے سے پہلے اس نے اپنے ہمی مون کی ایک تصویر نکالی اور اسے نوٹو فریم میں لگا کر فریج پر لگا دی۔

ایک دم سب کچھ صاف شفاف سا ہو گیا تھا جیسے برسات کے بعد کائنات کا ذرہ ذرہ کھڑا تھا۔ بیدروم میں آ کر اس نے شاہ میر کو فون کرنے کے خیال سے موبائل اٹھایا مگر پھر یہ سوچ کر کہ کہیں وہ مصروف نہ ہوں، واپس رکھ دیا۔ اب وقت کا ٹائماں کے لیے دو بھر ہو گیا تھا۔ ہر لمحہ سال برابر لگ رہا تھا۔ اس نے جی لگا کر پورے گھر کی صفائی کی۔ رات کا کھانا تیار کیا پھر سارے کاموں سے فارغ ہو کر وہ نہانے چلی گئی۔ شاہ میر کی گفت کی ہوئی ساڑھی پہنی اور بڑے ہی دل سے تیار ہوئی۔ آئینے میں بال سکھاتے ہوئے اس نے عقب میں شاہ میر کی موجودگی کو محسوس کیا۔ اس کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت اب بھی اسے اپنے کندھے پر محسوس ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ پھر وہ خود ہی اپنی حرکت پر جھنجھپ گئی۔

جیسے جیسے گھڑی کی سوئی دس کے ہندے کی طرف بڑھتی جا رہی تھیں، ویسے ویسے اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جیسے ہی گھڑی پانچ دس بجائے اس کے دل کی دھڑکنیں منشر ہو گئیں۔ اس نے جلدی سے کھانا گرم کیا۔ ڈانگ ٹیبل پر موم بتیاں جلائیں اور اب فقط شاہ میر کے آنے کا انتظار تھا۔

دس..... ساڑھے دس..... گیارہ..... ساڑھے گیارہ..... وقت گزرتا جا رہا تھا مگر شاہ میر کا کہیں پتا نہیں تھا۔ اس نے دوبارہ سیل فون بھی ٹرائی کیا مگر آف جا رہا تھا۔ باہر ہونے والی بادلوں کی گرج سے اس کا دل دہل گیا۔ اب اسے فکر ہونے لگی تھی آفس کے نمبر پہ بھی کوئی اینڈ نہیں کر رہا تھا۔ اس نے شاہ بھائی سے بات کرنے کا سوچا مگر پھر گھڑی میں ایک بجے کا وقت دیکھ کر رک گئی۔ شاہ صاحب کچھ دن ہی ہوئے تھے ان کے سامنے

والے فلیٹ میں مع فیملی شفٹ ہوئے تھے، ہم دن ہونے کے ناتے اچھی سلام دعا کی۔

”کس سے معلوم کروں..... کہاں چلے گئے ہیں.....“ وہ بے حد پریشان تھی۔ اس پر شدید بارش..... انجانے خوف نے اسے ڈسنا شروع کر دیا تھا۔

☆

ڈور نیل مسلسل بج رہی تھی۔ نیل کی آواز سے وہ خیالات کی دنیا سے واپس لوٹ آئی..... اس نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ تین بج رہے تھے۔

”شاید میر آ گئے ہیں۔“ وہ سوچ کر دروازہ کھولنے چل دی۔ دروازہ کھولا گیا..... وہ شاید کوئی ریسکوپوٹیم تھی اور دو تین پولیس والے بھی اور ان کے ہمراہ شاہ صاحب۔

”شاہ بھائی آپ..... اس وقت؟ اور یہ سب..... سب خیریت تو ہے نا؟“

لفظ بہ مشکل اس کے ہونٹوں سے ادا ہوئے۔ دل اس قدر زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ ابھی پسلیاں توڑ کر سینے کی قید سے آزاد ہو جائے گا۔

شاہ صاحب نے قریب جا کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

”سک..... کیا ہوا؟ شاہ بھائی؟“ خشک حلق سے یہ مشکل آواز نکلی اور ساتھ ہی نظر دروازے کی جانب گئی۔ جہاں ریسکوپوٹیم کے دو ممبران اسٹریچر اٹھائے گھر کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ اسٹریچر نیچے رکھ کر انہوں نے نعش کے منہ سے کپڑا ہٹایا..... اس کے ساتھ ہی آفیسر نے اسے آ کر بتایا۔

”ہمیں آفسوں سے کہنا پڑ رہا ہے آپ کے شوہر جاں بحق ہو گئے ہیں۔“

اسے لگا کسی نے اس کے کانوں میں گرم گرم سیسہ

اُٹیل دیا ہو..... وہ دوڑ کر اسٹریچر کے قریب گئی اور آہستہ آہستہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ سامنے وہی موجود تھا..... اس کا شاہ میر..... خون میں لت پت چہرہ اور اس کی وہ آنکھیں..... جن میں ہمہ وقت چاہتوں کے دیپ جلتے تھے۔ آج وہ تمام دیے بجھ گئے تھے۔ اس کے ہونٹ جن پر شوخ سا تمسمہ اسے سب سے جدا اور حسین رکھتا تھا۔

”آپ کے شوہر کی کار کا نمبر برسٹ ہو جانے کے باعث برج سے نیچے جا گری۔ آپ کے شوہر موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے تھے۔ جائے حادثہ سے ہم نے آپ کے شوہر کی باڈی کے پاس سے یہ چیزیں برآمد کی ہیں۔“ آفیسر نے ایک پیکٹ اس کی جانب بڑھایا مگر وہ جوں کی توں بیٹھی رہی۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے.....؟ وہ کیسے جاسکتا تھا..... ابھی تو اس نے اس کی محبت کو پہچانا تھا..... ابھی تو اس کے سنگ سفر کا آغاز ہوا تھا اور وہ اسے آغاز سفر میں ہی کیسے چھوڑ سکتا ہے..... اس کے ذہن میں شاہ میر کے الفاظ کی باز گشت ہونے لگی جو اس نے اس کے آخری کالم کے ساتھ درج کیے ہوئے تھے۔

”وہ اکثر مجھے بے یقینی سے دیکھتی ہے اور اس کی بے یقینی سے مکتی آنکھیں میرا ایمان ڈگمگا دیتی ہیں۔ شاید اسے مجھ پر یقین نہیں ہے۔ ہو جائے گا، میں دلاؤں گا اسے یقین..... پھر چاہے اس یقین کی قیمت میری جان ہی کیوں نہ ہو۔“

اور آج جب اسے یقین ہو چلا تھا تو وہ ہی نہیں تھا۔ شاہ میر نے اس کی قیمت ادا کی تھی۔

آج ایک مرتبہ پھر وہ اسے بے یقینی سے دیکھ رہی تھی..... لیکن اس بار اسے یقین کرنا پڑا کیوں کہ اب اسے یقین دلانے کے لیے کوئی شاہ میر نہیں بچا تھا..... اس نے ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے اس کی بند

آنکھوں کو چھوا..... جواب ہمیشہ ہمیش کے لیے دیران ہو چکی تھیں۔

”شاہ میر.....“ اس نے جلا کر اسے پکارا..... اس کی پکار سے نہ صرف پاس کھڑے نفوس کے دل بلکہ درو دیوار بھی لرز اُٹھے۔

☆

آج وہ عمر کے اس دور میں تھی جہاں اک بار پھر ساقھی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

”کچھ بھی ہو جائے، تم لکھنا مت چھوڑنا۔“ اس نے اپنی تمام عمر فقط شاہ میر کے اس جملے کے نام کر دی تھی۔

جب بھی اس کی کوئی نئی تحریر یا ناول شائع ہوتا تو وہ سب سے پہلے اسے شاہ میر کی تصویر کے پاس جا کر رکھتی۔

”لو میر پڑھ لو.....“ وہ اس سے یوں گویا ہوتی جیسے وہ اس کے سامنے بیٹھا ہو۔

آج اس کا شمار ملک کے بہترین مصنفین میں ہوتا ہے..... لوگوں کا ماننا ہے کہ اس کے لفظوں میں جادو ہے، ایک سحر ہے جو پڑھنے والوں کو مدہوش کر دیتا ہے..... پروہ یہ نہیں جانتے کہ اس جادو کا جادوگر اس کا قلم نہیں بلکہ اس شخص کی محبت کا احساس ہے جو اپنی تمام تر چاہتیں سوئپ کر سوائے ہونوں کی گمری میں جا بسا ہے۔ بظاہر آباؤ نظر آتی ان آنکھوں کو برسوں پہلے ہی کوئی دیران کر گیا..... ہونٹوں پہ ہمہ وقت سجایہ تم دکھ کی شدت کے باعث قائم رہتا ہے..... بظاہر زندگی روشن نظر آتی ہے..... ورنہ اس کی حسرتوں اُمنگلوں محبتوں چاہتوں کا دیا تو کب سے بچھ چکا ہے۔





# اوپر کچھ حوالہ

عشنا کوثر سردار

تلی کا رنگ ٹھہر گیا تھا، مٹھی کھلنے سے پہلے  
خواب لہو میں اتر گیا تھا، آنکھ کھلنے سے پہلے  
ویران کھنڈروں میں اب کیا ڈھونڈنے آئے ہو  
کتنا شور اٹھا تھا، دل کی بستی اجڑنے سے پہلے

ایسا کیا تھا اس کی نظروں میں..... انا یا ملک سمجھ نہیں پاتی تھی۔ وہ کیا جتنا چاہ رہا تھا؟

وہ محبت تو نہیں تھی

نہ کوئی لگاؤ نہ تھی

نہ عشق تھا نا پاگل پن..... نہ کوئی جنون تھا

نہ عقل و خرد سے بیگانہ تھا وہ

تو کیا تھا ان آنکھوں میں پھر.....

وہ اسے اس طرح کھونا نہیں چاہتا تھا تو پھر کیا.....

اتنی نا سمجھ تو نہیں تھی کہ وہ حلاوت نہ سمجھ سکتی تو یہ اس کی صرف غلط فہمی تھی کیا وہ محبت تھی، جس کے بل

بوتے پر وہ اسے اس راہ پر لاسکا؟

”کیا ہوا سزا انیا تعلق! اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟“ وہ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتا ہوا اسے متوجہ

کرتا ہوا بولا۔ اس نے خاموشی سے سرانکڑیں ہلا دیا تھا۔

”کوئی راز ہے جو چھپا رہی ہو سزا تعلق!“ معارج تعلق اس کی ناک کو ہلکے سے دباتے ہوئے

مسکرایا۔ وہ جوں کی توں بدستور پیلا دوپٹا اوڑھے ہوئے کھڑی تھی۔ پیلے رنگ کے اچالے میں وہ چہرہ

اس طرح کھل رہا تھا جیسے چاند کے گرد ہالہ.....! کوئی روشنی سی آنکھوں سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ اس کے

چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔

”مجھے بڑا عجیب لگا۔“ اس نے بولنے کا آغاز کیا تھا۔

”کس بات کو لے کر؟“ وہ چونکی۔

”تمہیں اپنی بیوی کہہ کر بلانا۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔ ”سچ میں نے نہیں سوچا تھا اس چائی کو اس طرح قبول کروں گا۔ ان پیکروں میں پڑنے کا قائل نہیں تھا۔ مجھے شادی وادی کرنا ہی نہیں تھی مگر جب ہوگی تو یقین نہیں ہوا کیسے ہوئی مگر کل بے ارادہ..... بے اختیاری میں تمہیں ڈھونڈنے کے جتن کرتے ہوئے تمہیں اپنے سے متناسب رشتے سے بلایا تو کچھ حیرت ہوئی۔“ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے پھر گویا ہوا۔ ”یہ سب کیا ہے میں نہیں جانتا مگر کبھی بھی رشتے حیرت میں ضرور ڈال دیتے ہیں۔“ معارج تعلق بولا۔

”کیونکہ انہیں عجیب انداز سے بنایا جاتا ہے۔“ وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی تھی۔ جیسے اپنے ساتھ ہونے والے سانحے کا حساب چاہتی ہو۔

”شاید..... مگر میں نے کہا نا میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔

”پھر ارادہ کس بات کا تھا؟“ وہ مکمل اعتماد سے سر اٹھا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ معارج تعلق نے لمحہ بھر کو خاموش ہو کر اسے دیکھا تھا پھر مسکرا دیا۔

”بڑی تجسس ہیں آپ یہ جاننے کے لیے.....؟“

”تم نے میرے ساتھ اتنا کچھ کیا تو کیا میں اس کا جواز بھی مانگ نہیں سکتی؟“ انانیا ملک نے کہا۔

”مانگ سکتی ہو جو چاہو مانگ سکتی ہو مگر یہ مجھ پر منحصر ہے کہ میں دینا چاہتا ہوں یا نہیں..... چاہے وہ کسی سوال کا جواب ہو یا جواز!“ وہ بات کو مذاق میں اڑا دینا چاہتا تھا شاید وہ بغور اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی جیسے ہر جھجکاؤ کا پتا چاہتی ہو۔ ”یہ پلاؤ پلاؤ پلاؤ ہے تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو انانیا تعلق! مگر دلہن اتنی دیدہ دلیری سے اپنے دو لہکے کو دیکھتی اچھی نہیں لگتی۔“ وہ مسکرایا۔

”تم جانتے ہو معارج تعلق! یہ شادی کیا معنی رکھتی ہے؟ شاید میں کسی سازش کا شکار ہوئی ہوں اور سازش کا شکار ہونے والی لڑکی کو ”کوئٹہ“ کہتے ہیں دلہن نہیں.....! مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیسے پیش آنا چاہیے۔ میری تو جیسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سلب ہو گئی ہے۔ میں اس سارے ڈرامے کا حصہ ایسے ہوں جیسے میں کوئی جیتا جاگتا وجود نہیں، کوئی مجسمہ ہوں۔ میرے ساتھ یہ کھیل کھیل کر تمہیں کیا مل رہا ہے معارج تعلق!“ انانیا ملک کا لہجہ مضبوط تھا۔

”کوئی کھیل نہیں کھیل رہا تمہارے ساتھ انانیا ملک! عزت دے رہا ہوں میرے گھر میں میری بیوی کی حیثیت سے جگہ رہی ہو تم۔ میرے رشتے تمہیں مان دے رہے ہیں پیار سے اپنا رہے ہیں اور کیا درکار ہے تمہیں؟ وہ مسکرایا۔ ”مجھے تو جملہ ہوتی ہے کہ تم مجھ سے میرا ہر رشتہ چھین رہی ہو۔“ وہ مذاق کر رہا تھا، سنجیدہ نہ تھا جیسے مگر وہ خاموش رہی تھی۔

”کیا ہے یہ سب معارج تعلق!“ قدرے توقف سے وہ بولی۔

”یہ آج تمہیں اچانک دھیان کیسے آگیا پوچھنے کا..... کیوں پوچھ رہی ہو تم یہ سب؟“

”اچانک سے نہیں آیا دھیان معارج تعلق! میں کوئی بات بھولی نہیں ہوں مگر..... یہ عشق تو نہیں نہ کوئی جنون ہے؟“ انانیا ملک نے مدعا چھیڑا تو وہ مسکرا دیا تھا جیسے اس کی بات سے محفوظ ہوا ہو۔

”کیا ہوا؟“ یہ چہرہ اتنا بے رنگ کیوں لگ رہا ہے؟“ پارسا نے پوچھا۔

”کچھ نہیں، تم نے ایکسل کو دیکھا؟“

”نہیں، میں نے نہیں دیکھا۔ کیوں کیا ہوا؟“ پارسا نے پوچھا۔

”دامیان تم سے کچھ کہہ رہا تھا؟“ پارسا غائبانہ دامیان کے ساتھ کھڑا کچھ بچی تھی۔

”کچھ خاص نہیں، تمہارا پروجیکٹ کیسا جارہا ہے؟“ اس نے پارسا سے پوچھا تھا۔  
”ٹھیک! مگر فی الحال مکمل ہونے میں دیر لگے گی۔ مجھے مٹرل کو منتخب کرنے میں کچھ پرالیم ہو رہی ہے۔“ پارسا نے کہا۔

”مجھے بھی یہی پرالیم پیش آرہی ہے دوسرے فی الحال امن کی کیفیت نہیں۔ کچھ عجیب شور سا ہے۔ میں یکنو نہیں ہو پارہی۔“ وہ تھکے ہوئے سے انداز میں وہیں بیٹھوں پر اس کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ پارسا نے اسے بغور دیکھا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو؟“

”ہاں!“ اس نے سر ہلادیا۔

”اناہٹا! اگر طبیعت ٹھیک نہیں تو گھر میں رہو آرام کرو۔ میں تمہارا پروجیکٹ مکمل کروں گی۔“ پارسا نے پیشکش کی تھی۔

”نہیں! شکریہ! میں ٹھیک ہوں۔“ اناہٹا بیگ نے سہولت سے منع کر دیا۔

”تمہیں کوئی کام تو نہیں؟“

”کیوں گھر جانا ہے؟“ پارسا نے پوچھا۔

”ہاں! گرمی بہت ہو رہی ہے اگر تم نے کام ختم کر لیا ہے تو گھر چلتے ہیں۔“ اناہٹا نے کہا۔

”ہاں کام تو کچھ زیادہ نہیں مگر مجھے بلماز کمال سے ملنا تھا شام کو اس کا فون آیا ہے اس نے کہا تھا اماں کا کوئی پیغام ہے۔ سو میں یہاں اس کا انتظار کروں۔“ پارسا نے بتایا۔ اناہٹا نے اسے بغور دیکھا تھا۔ پارسا شاید دانستہ اس کی سمت سے چہرے کا رخ پھیر کر دیکھنے لگی تھی۔ کیا اسے کوئی خوف تھا کہ وہ اس کے چہرے پر لکھی کوئی تحریر پڑھ نہ لے۔

”پارسا! میں نے تمہیں گھر بات کرتے نہیں دیکھا۔ کوئی بات ہے جو تم مجھ سے بانٹ نہیں سکیں یا بائٹا نہیں چاہتیں؟“ اناہٹا نے اس کے ہمیشہ کے گریز کو توڑنا چاہا تھا۔

”وہ..... میں.....!“ پارسا سے جیسے کوئی بات بن نہیں پارہی تھی۔

”کوئی بات نہیں! اگر تم نہیں بتانا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے۔“ اناہٹا نے اس کی احتیاط کے پیش نظر کہا۔ اگر وہ بتانا نہیں چاہتی تھی تو وہ بھی اس پر کوئی دباؤ ڈال کر اگلوں انہیں چاہتی تھی یہ ٹھیک نہیں تھا کہ اس پر زبردستی کرتی، اگر وہ مائل نہیں تھی۔

”میرے براہ راست بات نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔“ پارسا نے اپنے طور پر جیسے صفائی دینا چاہی۔ ”میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتی مگر.....“ وہ بولتے بولتے رکی تھی۔

”کوئی بات نہیں پارسا! تم اگر نہیں بتانا چاہتی ہو تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی۔“ اناہٹا بیگ نے ملامت سے کہا۔ مگر پارسا کو شاید احساس جرم محسوس ہوا تھا۔ وہ اس کی قریبی دوست ہے اور اس کی ہمیشہ مدد کرتی رہی تھی اگر وہ اس سے ہی اپنے دل کی بات کہہ نہیں سکتی تو اس کا مطلب تھا وہ اس پر

اعتبار نہیں کرتی۔

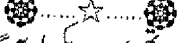
”ایسا نہیں ہے کہ میں تم پر اعتبار نہیں کرتی اناہٹا بیگ! مگر بعض باتوں کے نہ کہنے کے کچھ جواز ہوتے ہیں۔“ پارسا سر جھکا کر بولی۔

”میں سمجھتی ہوں پارسا! تمہیں کسی بات کو لے کر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہ قطعاً نہیں سوچ رہی کہ تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتی ہو۔“ اناہٹا بیگ نے اسے نرمی سے مسکراتے ہوئے دیکھا۔

”تم میری بہت اچھی دوست ہو! ابھی اس بے گانے شہر میں تم نے مجھے ہمیشہ ہر طرح سے مدد دی ہے اور میرے ساتھ رہی ہو۔“

”جانے بھی دو پارسا! چھوڑو نا..... اچھا بتاؤ! آکس کریم کھاؤ گی؟“ اناہٹا نے موضوع بدل دیا تھا۔ اس کا انداز بہت دوستانہ تھا۔ پارسا کو اپنے طور پر کسی قدر شرمندگی ہوئی تھی۔ اناہٹا بیگ نے اس کا ہاتھ تھاما اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چلو آکس کریم کھانے چلتے ہیں۔ آج گرمی بہت زیادہ ہے نا!“ پارسا کے پاس اٹھ جانے کے علاوہ جیسے کوئی چارہ نہیں تھا۔



وہ شام میں لان میں بیٹھی چائے پی رہی تھی جب ایکسل آ گیا تھا چونکہ دامیان نے بتایا تھا کہ وہ اس سے کوئی بات کرنا چاہتا تھا تو اس لیے اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی اس کی آمد پر۔

”آؤ ایکسل بیٹھو۔ چائے پیو گے؟“ اناہٹا نے پوچھا۔

”ہاں چائے پیوں گا اور ساتھ کچھ کھاؤں گا بھی۔“ ایکسل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ کھانے کے لیے ہر لمحہ تیار رہتا تھا اناہٹا اس کا مزاج جانتی تھی بھی مسکراتی۔

”ٹھیک ہے! مگر اتنی جلدی میں کیوں ہو..... ٹرین چھوٹ رہی ہے کیا.....“ اناہٹا نے پوچھا۔

”نہیں ٹرین تو نہیں چھوٹ رہی مگر باہر دامیان سواری گاڑی میں بیٹھا ہے۔“

”اوہ!“ اناہٹا بیگ جانتی تھی اپنی اس روز کی بے عزتی کے باعث وہ اندر نہیں آنا چاہے گا، تبھی اس کا ذکر سن کر بات بدل دی تھی۔

”تم کچھ کہنا چاہتے تھے؟“ اس نے نوکر کو بلا کر چائے اور سموسوں کا کہا۔

”ہاں کہنا تو چاہتا تھا مگر مجھے یہ اچھا نہیں لگ رہا۔“ ایکسل نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔

”کیا اچھا نہیں لگ رہا؟“ اناہٹا نے پوچھا۔

”تم دونوں اچھے دوست ہو اور یہ فاصلے.....؟ دوستی میں چھوٹے موٹے اختلافات ہوتے رہتے ہیں، جھگڑے بھی ہوتے ہیں مگر اس طرح نہیں ہوتا۔“ ایکسل نے کہا۔

”تم سے کس نے کہا کہ ہم میں کوئی جھگڑا ہوا ہے یا کوئی فاصلہ ہے؟“ اناہٹا چوکی تھی۔ ”اور تم کیا یہاں یہی بات کرنے آئے ہو؟“

”نہیں! اس بارے میں بات کرنے یا تمہیں سمجھانے نہیں آیا مگر وہ اس طرح باہر گاڑی میں بیٹھا ہے



”آئی! آپ کے ہاتھ کے سموں کا جواب نہیں..... اگر اتنے پیار سے کھلائیں گی تو میں روز آ جایا کروں گا۔“ ایکسل سموں سے انصاف کرتا ہوا مسکرایا۔

”تمہارا اپنا گھر ہے بیٹا! جب دل چاہے آؤ۔ میرے لیے تم انا یا عدن سے کم نہیں ہو۔“ می مسکرائیں۔

”واہ آئی جی! ماں ہو تو آپ جیسی! کیا شیر جیسا دل ہے۔ آپ تو سونے کا نوالہ بھی کھلاتی ہیں اور شیر کی نظر سے بھی دیکھتیں۔ مگر اتنا کچھ اور اتنے پیار سے کھلائیں گی تو میں موٹا ہو جاؤں گا۔“ ایکسل مسکرایا۔

”ایکسل! کچھ نیا نہیں ہوگا۔ تم پہلے بھی گمزدور نہیں ہو۔“ دامیان سوری نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا تھا۔ انہیں بیگ اس سارے ماحول سے اجنبی سی بنی بیٹھی تھی۔ اس کا کپ غالباً خالی ہو چکا تھا مگر وہ بھرم رکھنے کو اور غالباً تو جہ بنانے کو اب تک کپ ہاتھ میں تھامے ہوئے تھی۔

”تم چائے اور لے لو انہیں! تمہارا کپ خالی ہے غالباً۔“ ایکسل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ انہیں دانستہ نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا۔ اس کی چوری پکڑے جانے پر عجیب کیفیت ہوئی تھی۔ دامیان سوری اس کی جانب متوجہ تھا۔ اس سے ملنے پر وہ نگاہ کا زراویہ بدل کر ایکسل کی طرف دیکھنے لگی۔

”تم کچھ لو نا دامیان بیٹا!“ می نے پلیٹ آگے بڑھائی تھی۔

”نہیں می! میں صرف چائے لوں گا۔ میں نے کھانا دیر سے کھایا تھا، بھوک نہیں ہے۔“ اس نے سہولت سے منع کیا۔

”می بھی کہتے ہو اور میرے ہاتھ کا بنا پیکھو گے بھی نہیں.....؟“ می مسکرائی تھیں۔ ان کا نرم انداز دیکھ کر جانے کیوں وہ انہیں کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے وہ اس کے اور می کے مزاج کا موازنہ کر رہا تھا۔ انہیں نے توجہ نہ کرتے ہوئے اپنے لیے چائے اٹھ لی تھی۔

”آپ کے ہاتھ کے بنے کھانوں کا جواب نہیں ہے می! مگر اس وقت بھوک نہیں ہے لیکن آپ کہتی ہیں تو کچھ لیتا ہوں۔“ اس نے تھوڑا سا سموں توڑ کر منہ میں رکھا تھا شاید می سمجھ رہی تھیں کہ وہ اس دن کے بعد اس گھر میں قدم رکھنے میں کتنی جھجک محسوس کر رہا تھا۔ دامیان آتو گیا تھا مگر کچھ زیادہ بول نہیں رہا تھا۔

چپ چاپ چائے کے گھونٹ لے رہا تھا۔

”آئی! یہ میرے بھائی کی شادی کا دعوت نامہ ہے اور آپ سب کو اس شادی میں ضرور آتا ہے۔ یہ دعوت نامہ تو یوں آپ کو دے رہا ہوں تاکہ آپ یہ نہ کہیں کہ صرف انہیں کو مدعو کیا ہے۔“ ایکسل نے کہا تو می مسکرا دی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ ضرور شرکت کریں۔“

”انہیں! تم بھی ضرور آنا۔“ ایکسل اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

”پروجیکٹ کا کافی کام باقی ہے مگر میں کوشش کروں گی۔“ وہ عجیب سرد لہجے میں بولی تو دامیان نے اسے بغور دیکھا تھا۔ وہ ایسی تو نہیں تھی۔ کیا ہو گیا تھا اسے..... کیا صرف ایک چھوٹی سی بات سے کوئی یوں بدل سکتا ہے؟ وہ سوچ کر رہ گیا تھا۔

گا تو اچھا نہیں لگے گا۔“ ایکسل بولا۔

”تم چاہتے ہو میں اسے اندر بلاؤں؟“

”وہ تمہارے گھر کے باہر کھڑا ہے انہیں بیگ! کسی کے گھر کوئی آئے اور اندر قدم نہ رکھے یہ اچھی بات نہیں ہے۔ دشمنی کے بھی کوئی اصول ہوتے ہیں۔ اپنے گھر دشمن بھی چل کر آ جائے تو اسے اندر داخل ہونے کو کہہ دیتے ہیں۔“ ایکسل نے سمجھایا۔

”تم اسے اگر اندر بلانا چاہتے ہو تو کہہ سکتے ہو۔ میں اسے اندر بلوانے سے منع نہیں کر رہی۔ وہ اندر آ سکتا ہے۔“ وہ قدرے بے گامگی سے بولی تھی۔ اندازاً لعلق تھا جیسے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو۔

”ایسے نہیں ہوتا انہیں! یہ ٹھیک نہیں ہے۔“ ایکسل نے پھر افسوس بھرے انداز میں کہا۔ انہیں خاموش ہو گئی تھی۔

”انہیں! تمہیں دامیان کو اندر بلانا چاہیے۔“ ایکسل نے اسے کہا تھا مگر وہ سر جھکائے لعلق انداز میں بیٹھی رہی تھی۔

”انہیں! دامیان اتنا بڑا دشمن نہیں ہے۔ ہم سب دوست ہیں! چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھول جانا مناسب ہوتا ہے۔“

”ہم میں کوئی دشمنی نہیں ہے ایکسل! تم غلط سمجھ رہے ہو اور بلا وجہ اس کی حمایت کر رہے ہو۔“

انہیں بولی۔

”میں حمایت نہیں کر رہا مگر یہ اچھا نہیں لگتا، وہ گھر کے باہر گاڑی میں بیٹھا ہے۔“

”تو اسے اندر بلاؤ۔“ انہیں نے لعلق سے کہا۔

”کسے اندر بلاؤ؟“ می جو چائے لے کر آئی تھیں اس کی بات سن کر پوچھنے لگیں۔

”آئی وہ.....!“ اس نے انہیں کی طرف دیکھا تھا پھر دانستہ چپ ہو گیا۔

”کیا ہوا ایکسل! کوئی پریشانی ہے؟“ می نے دریافت کیا۔

”نہیں آئی! پریشانی تو کوئی نہیں۔ میں بھائی کی شادی کا دعوت نامہ دینے آیا تھا اور میرے ساتھ دامیان بھی ہے۔“

”دامیان بھی ہے؟..... کہاں ہے وہ.....؟“ می نے پوچھا۔

”وہ باہر گاڑی میں ہے۔“

”اوہ!“ می نے انہیں کی طرف دیکھا اور پھر چائے کی ٹرے میز پر رکھ کر صدر دروازہ کی طرف بڑھ گئیں۔ جانے انہوں نے کیا کہا تھا کہ دامیان کچھ ہی دیر میں اندر آتا دکھائی دیا۔ انہیں نے اسے اندر آتے اور ان کی طرف بڑھتے دیکھا تھا مگر وہ ہر طرح سے اپنے احساسات کو چھپا کر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی، بھی اس کی جانب متوجہ نہیں ہوئی تھی اور چائے کے گھونٹ لینے لگی تھی۔ دامیان اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تو می نے اسے چائے پیش کی، ساتھ ہی پلیٹ میں لوازمات رکھ کر دیئے تھے۔

انہیں ایسے بیٹھی تھی جیسے اس ماحول کا حصہ نہ ہو۔

ایکسل اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دامیان نے بھی تھلید کی تھی۔  
 ”ٹھیک ہے! اتنی بہت شکر ہے جانے اور سوسوں کے لیے ہم چلتے ہیں اب۔“ ایکسل نے کہا۔  
 ”اوکے می! شکر ہے! آپ کو دیکھ کر ہمیشہ لگتا ہے کہ ساری مائیں شاید اتنی ہی نرم اور محبت کرنے والی ہوتی ہیں۔ آپ کے ساتھ اس دن کھانا پکانے کا بہت اچھا تجربہ رہا تھا۔ آپ بہت اچھی ہیں۔“ وہ ملاحت سے مسکراتے ہوئے بولا تو مٹی مسکرا دی تھیں۔  
 ”تم جب چاہو! کروہ تجربہ بڑھاسکتے ہو۔ بیٹے کو ماں سے گھر آنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی نا تمہیں بھی جھک محسوس نہیں ہونی چاہیے۔“ مٹی نے اسے اپنائیت کا احساس دلایا۔  
 دامیان سو رہی جانے گیوں انا پتا بیگ کی سمت دیکھنے لگا تھا۔ وہ بھی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ نگاہ پل بھر کو مٹی بھی پھر وہ پلانا تھا اور دروازے کی سمت بڑھنے لگا۔ وہ دانستہ اس جانب سے نگاہ ہٹا گئی۔ مٹی نے اس کی سمت دیکھا۔ اسے لگا تھا کوئی سرزنش ہوگی یا پھر کوئی نصیحت مگر مٹی خاموشی سے پلٹ کر اندر کی جانب بڑھ گئی تھیں۔

”میرے سوچنے کی فکر آپ کو کب سے ہونے لگی؟“ وہ چوکی۔  
 ”تمہاری فکر نہیں ہوگی تو پھر کس کی فکر ہوگی۔ بیوی ہو میری!“ وہ مسکرایا۔ وہ اس کی فطرت جانتی تھی تبھی کوئی تاثر نہیں دیا تھا۔  
 ”تم جواب دیا کرو مسرت غفلت! خاموش رہتی ہو تو کچھ دور جاتی لگتی ہو۔“ وہ غالباً اسے چھیڑ کر لطف محسوس کر رہا تھا۔  
 ”مجھے اس سارے ڈرامے کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی معارج غفلت!“ وہ تپ کر بولی۔  
 ”کس ڈرامے کی وجہ مسرت غفلت!“ وہ جیسے اس کی کیفیت سے منظور ہو رہا تھا۔  
 ”تم سب شہد سے زیادہ پیٹھا ہونے کی کوشش کیوں کرتے ہو؟“ وہ برحسب سے بولا۔  
 ”تمہیں پیٹھا زیادہ پسند نہیں ہے کیا.....؟“ وہ برحسب سے بولا۔  
 ”معارج غفلت! کوئی طریقہ نہیں ہے۔ ہر ایک کی اپنی زندگی ہوتی ہے اور.....“ معارج غفلت نے کچھ کہنے سے قبل ہی اس کے لبوں پر انگلی رکھ دی تھی۔ وہ ابھی نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔  
 ”نئی دلہن اپنے دوہلا سے اس طرح بحث نہیں کرتی۔“ معارج غفلت نے اسے جیسے گر کی بات سمجھائی تھی مگر اس کی نگاہوں میں ہزار ہا الجھنوں کا ڈیرہ تھا۔  
 ”تمہیں الجھن کس بات کی ہے؟ سنا ہے لڑکیوں کے ساتھ ایک بات عام ہے کہ شادی کے دنوں میں انہیں ایک عجیب سی افسردگی ہو جاتی ہے۔ کہیں تمہارے ساتھ بھی ایسا تو نہیں کہ گھر میں شادی کی چہل پہل دیکھ کر تمہیں بھی ایسی ہی کیفیت گھیر رہی ہے؟“ وہ جیسے اسے سمجھنے کی بھرپور سعی کر رہا تھا۔ کیا وہ اس میں اتنی دلچسپی رکھتا تھا.....؟ انا نیا ملک نے بہت آہستگی سے اس کا اس کے لبوں پر رکھا ہوا ہاتھ ہٹا دیا تھا۔  
 ”مجھے کوئی افسردگی نہیں ہے نہ ہی کوئی پریشانی..... مجھے یہ ڈرامے بازی الجھن دے رہی ہے۔ اگر میرے گھر سے ہندو کے زور پر بیاہ ہی لائے تھے تو مزید کسی ڈرامے کی کیا ضرورت باقی بچتی تھی؟“ وہ عجیب الجھی ہوئی لگ رہی تھی۔  
 ”اوہ! تو تمہیں اس سے کوئی خوشی نہیں؟ میں تو سمجھا تھا بہت خوش ہوگی کہ سسرال میں خوب آؤ بھگت ہو رہی ہے اور سسرال انھوں پر بٹھایا جا رہا ہے۔ باقاعدہ ریسیں کی جا رہی ہیں اور اس شادی کو باقاعدہ یادگار بنایا جا رہا ہے۔“  
 وہ اس کی ہر بات کو مسکرا کر کیوں ٹال رہا تھا وہ چوناک پر کبھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا اس سارے معاملے کو لے کر اتنا منظور کیوں ہو رہا تھا.....؟ اس کی الجھن کڑوا کیلا کہنے کے باوجود وہ اتنا خوشی مزاج شہد جیسا بیٹھا کیوں ہو رہا تھا..... یہ کون سا روپ تھا اس کا..... وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ معارج غفلت نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ اس حرکت پر حیران رہ گئی تھی مگر معارج غفلت کو جیسے پروا نہیں تھی۔  
 ”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ اس کی نظریں اپنے چہرے پر گڑی دیکھ کر وہ نگاہ چراتی ہوئی ڈپٹ کر بولی۔  
 اس کا انداز ہنوز لاچار اور ناگوار تھا۔ عجیب شخص تھا وہ۔ جانے کیا تھا اس کے من میں۔

انا نیا ملک مٹی کی طرف جانے کے لیے نکل رہی تھی جب معارج غفلت کہیں سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔  
 ”کہاں جا رہی ہو تم.....؟“ دریافت کیا گیا۔  
 ”مٹی کی طرف.....!“ اس نے جواب دیا۔  
 ”آج کے لیے جانا ملتوی کر دو۔“ حکم صادر ہوا۔  
 ”کیوں.....؟“ وہ چوکی۔  
 ”میں تمہیں خود لے جاؤں گا“ مٹی کی طرف۔ مگر آج کے لیے غالباً اشاع کے پاس تمہارے لیے کوئی منصوبہ ہے۔“  
 ”آج کے لیے..... کیا مطلب.....؟“ انا نیا لکھے ہوئے انداز میں بولی۔  
 ”اس میں اتنا الجھنے والی کون سی بات ہے مٹی کے گھر کسی اور وقت بھی تو جایا جاسکتا ہے نا!“ وہ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے بولا۔  
 ”مٹی کان سے تیل فون لگائے کسی سے بات کرتی ان کی طرف آتی اشاع دکھائی دی۔“  
 ”بھائی! نہیں چاہیے گامت..... ذرا انتظار کریں میں آتی ہوں۔“ اسے ایک مردت بھری مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتی ہوئی اشاع دوسری طرف نکل گئی۔  
 اس گھر کے مکینوں کو شاید رواداری نہ تھا۔ قتل بھی کرتے تو بڑے قرینے اور سلیقے سے کرتے تھے کہ بندہ جان بھی دے دے اور افسوس بھی نہ ہو۔ اس نے تھک کر صوفے پر بیگ رکھا اور پھر اس کی جانب متوجہ ہوئی تھی جو اسے جانے کیوں بغور دیکھ رہا تھا۔  
 ”کیا سوچ رہی ہو تم؟“

”زیادہ مت سوچا کرو۔ سوچنے سے لڑکیاں جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ مجھے گرے بالوں والی اور چہرے کی جھریوں والی انا ناپا تعلق کچھ خاص بُری تو نہیں لگے گی مگر کچھ خاص اچھی بھی نہیں لگے گی پھر باہر تانکا جھانکا کروں گا تو شکوہ بھی تم ہی کرو گی نا!“ وہ سرگوشی کرتا ہوا مسکرایا انداز شرارت بھرا تھا۔ ”تمہیں کسی نے نہیں بتایا کہ شوہر کا دل جیتنا کتنا ضروری ہوتا ہے! حق ہو تم! ایک دم کوری تمہیں کسی نے نہیں بتایا اور تم خود بھی نہیں جانتیں کہ شوہر کو پلو سے کس طرح باندھا جاتا ہے۔ یہاں میں اپنا آپ خود تمہارے پتو میں باندھتا ہوں تو تم احمق بن کر پلو کھولنے کے جتن کرنے لگتی ہو، کوئی تدبیر کارگر کیسے ہو؟“ وہ بہت مدہم سرگوشی میں بول رہا تھا۔ اس کا چہرہ جیسے جلنے لگا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکالنے کی سعی کی تھی مگر اس کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ ”ویسے تمہیں جہاں بہت سی باتیں ابھن میں بتانا کر رہی ہیں“ وہاں شاید ایک بات کچھ طمانیت بھی دے کہ اس سارے پچھل والے محرکے کے بعد ایک مرحلہ سکون کا بھی ہے جس میں ہم یہاں سے دور چلے جائیں گے ان سب سے۔ پُر فضا مقام پر۔ تمہیں ہنی مون کے لیے کوئی جگہ پسند ہو تو بتا دو ورنہ میں نے طے کر لیا تو پھر شکوہ مت کرنا۔“ وہ شرارت سے مسکرایا۔

وہ اس کی جانب نہیں دیکھ رہی تھی مگر اس کا چہرہ سرخ تھا۔ عارض دھک رہے تھے۔ اس کی جھکی پلکوں پر کوئی خوش کن کہانی رقم نہیں تھی مگر وہ نگاہ اُٹھی تھی تو وہ ایک بل میں زیر ہوا تھا۔ سارا کچھ دھراہ گیا تھا۔ ایک نگاہ نے جیسے سب زیور زبرد کر دیا تھا۔ بہت آہستگی سے اس کے ہاتھ پر معارج تعلق کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو وہ اس سے اپنے ہاتھ جھڑا کر چند قدم دور ہوئی اور وہ پلٹ کر جیسے وہاں سے ہٹ جانے کو تھی۔

جب معارج تعلق نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے رکارا تھا۔

”مسز تعلق!“ وہ رک گئی تھی مگر اس کی جانب دیکھنے سے مکمل گریز کیا۔

”کیا تھا اس لمحے میں..... جو معارج تعلق نے پہلے محسوس نہیں کیا تھا، کیا تھا ان آنکھوں میں..... جو معارج تعلق نے پہلے نہیں دیکھا تھا یا نہیں جانتا تھا.....!“

”تم ایثار کی بات سن لو پھر مجھے کہیں لے کر جانا ہے۔“ کہہ کر وہ پلٹ گیا تھا۔ انا یا ملک نے اس لمحے جانے کیوں اسے جاتا ہوا تادیر دیکھا تھا۔ وہ لمبا چوڑا شخص اس لمحے کس رعب سے زمین پر قدم رکھتا ہے لے لے ڈگ بھرتا اس سے دور نکل رہا تھا۔

☆.....☆

”مجھے تقریبات میں جانے کا کوئی خاص تجربہ نہیں ہے اور میرے پاس اس مناسبت سے کوئی لباس بھی نہیں..... ایٹلسل نے بلایا تو ہے مگر مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ اب میں کیا کروں؟ جاؤں یا نہیں؟“ وہ لپ ٹاپ سامنے رکھتے پروجیکٹ پر کام کر رہی تھی جب پارسا چوہدری کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

”مسئلہ کیا ہے؟“ اس نے تیزی سے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے سر اٹھائے بنا پوچھا۔

”مسئلہ تو کوئی نہیں مگر ایک لمبا چوڑا خرچہ ہے یا! اشادیوں پر یہ روزمرہ والے لباس تو پہنے نہیں جاسکتے اور فنی قسم کے لباس میرے پاس ہیں نہیں۔ پھر لباس لے بھی لو تو ساتھ ساتھ کتنی اور چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔ اوپنچی ایڑی والی سینڈل لینا پڑی گی۔ میں نے تو کئی عرصے سے فلیٹ سینڈل کے علاوہ کچھ

پہنا ہی نہیں۔“ وہ پہلی بار پارسا چوہدری کے منہ سے عام لڑکیوں کی طرح ان سب چیزوں کے نام کیے دیکھ رہی تھی، کچھ شاید مسکرائی تھی۔ ”تم مسکرا کیوں رہی ہو؟ تم سوچ رہی ہو میں اوپنچی ایڑی پہن کر چلنا ضرور بھول چکی ہوں کی ہے نا!“ پارسا نے اسے شام کی نظروں سے دیکھا تھا۔

”تمہیں میں ایسا نہیں سوچ رہی۔ تم یقیناً اوپنچی ایڑی پہن کر چل سکو گی مگر تم جس طرح پریشان ہو رہی ہو میں اس پر مسکرا رہی ہوں۔ ہم شام میں چلیں گے، تم شاپنگ کر لینا۔“ انا چیتا بیگ نے کہا تھا۔

”میں شاپنگ کر لوں؟“ اور تم.....! تم نہیں شاپنگ کرو گی؟“ پارسا نے اس کی پیشکش پر چوکلتے ہوئے اسے بتایا۔

”تمہیں.....!“ اس کا جواب رسائیت سے بھر پور تھا۔

”کیا؟“ پارسا چوکی۔ ”تم شادی میں شرکت نہیں کر رہی؟“

”پتا نہیں! مجھے پروجیکٹ پر ابھی بہت سا کام کرنا ہے اور اگر جانا بھی پڑا تو میں چلی جاؤں گی۔ میرے لیے یہ سب اتنا مسئلہ نہیں ہے۔“ اس نے بے نیازی سے کہا۔

”تم شادی میں جینزنی شرٹ پہن کر شرکت کرو گی؟“ پارسا نے اسے گھورا تھا۔

”ہاں تو کیا حرج ہے؟“ وہ بے نیازی سے کہہ رہی تھی۔ ”مجھے نہیں لگتا کہ میں جا پاؤں گی لیکن اگر جانا اتنا ہی ضروری ہوا تو پھر یوں ہی چلی جاؤں گی، تم شام میں تیار رہنا، ہم شاپنگ کرنے چلیں گے۔“ انا چیتا بیگ نے کہا۔

”تمہیں مجھے بھی اس کی ضرورت نہیں۔ اگر جانا اتنا ہی ضروری ہوا تو میں بھی بڑے آرام سے اوپنچی ایڑی پہنے بنا شرکت کر سکتی ہوں۔ یوں بھی میں فلیٹ سینڈل میں خود کو زیادہ دیر سکون محسوس کرتی ہوں۔“

پارسا چوہدری مسکرائی۔ انا چیتا نے اسے نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا اور وہ بھی مسکرا دی۔

”ایٹلسل نے اور کسے مدعو کیا ہے؟ میرا مطلب ہے ہماری کلاس میں سے؟“ انا چیتا نے کہا تھا۔

”پتا نہیں! شاید سچی کو!“ پارسا لالچی سے بولی۔

”اور یلماز کمال!“ انا چیتا بیگ بے ساختہ بولی تو پارسا چوہدری ساکت سی رہ گئی۔ انا چیتا کو اندازہ ہوا تھا کچھ نگاہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

”میں نے تو یہی پوچھا تھا۔ انا چیتا کو اسے اس طرح پریشان ہونا دیکھ کر اچھا نہیں لگتا اور یلماز کمال کے متعلق اس نے دانستہ نہیں پوچھا تھا۔

”یلماز کمال کو ہماری پوری کلاس میں کوئی پسند نہیں کرتا نا!“ پارسا چوہدری نے دریافت کیا۔ انا چیتا بیگ کے کی بورڈ پر چلتے ہاتھ رک گئے تھے۔

”ہاں مگر اس کی وجہ تم بھی جانتی ہو شاید.....!“ انا چیتا نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا۔

”ہاں جانتی ہوں۔ تم نے ایک بار بتایا تھا اس کے کئی اسکینڈلز بنے۔ وہ سب سے بہت دور رہتا ہے شاید اسی لیے ہٹلانا نہیں۔“ پارسا جیسے خود کلامی کر رہی تھی۔

”لیکن تمہیں اس سے ڈر نہیں لگتا نا!“ انا چیتا بیگ نے پوچھا۔



کی آپ جانتے ہیں بدل کا دن کون کا ہے  
جسے اللہ تعالیٰ نے پیمانہ فرمایا؟  
قیامت کی نشا و نیاز کیا ہیں؟ وہ حال کون ہے؟ عیسیٰ ولیہ السلام  
کا نزول کب ہو گا؟ ان سب کا جواب  
مستشرقین و ان بلک کے مطابق  
مستشرقین کی روشنی کی روشنی

ملکِ یوم الدین  
شانِ لغوی ہے

یہ کتاب ان تمام لوگوں کیلئے ہے جو کسی وجہ سے قرآن حکیم کی  
مکمل تفسیر نہیں پڑھ سکے۔ قیامت کے حوالے سے انسانی ذہن میں  
ابھرنے والے ہر سوال کا مفصل جواب آپ کو اس کتاب میں ملے گا

اسلامی کتب خانہ الحمد مارکیٹ غزنوی روڈ لاہور فون: 042-37116257  
نئے افق گروپ آف پبلیکیشنز 7 فرید چیمبر عبداللہ ہاؤس روڈ کراچی فون: 021-35620771/2

”مجھے کسی سے بھی ڈر نہیں لگتا۔“ اس کا انداز عجیب ہے جس تھا۔  
”ہم سب نے کئی بار اسے تمہارے ساتھ دیکھا ہے اور.....!“ انہیابیگ نے بولتے بولتے اس کی  
جانب دیکھا تو پارسا چوہدری سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ”تم اس سے کل ملنے والی تھیں! کوئی پیغام ملنا تھا  
تمہیں اپنی فیملی کی طرف سے؟“ انہیابیگ نے پوچھا۔  
”ہاں.....! مگر ہم نہیں ملے۔“ پارسا چوہدری کا انداز ٹھہرا ہوا تھا۔  
”اوہ!“ انہیابیگ کوئی تاثر نہ دے پائی تاہی وہ دینا چاہتی تھی۔ وہ اسے ایک پرسکون ماحول دینا  
چاہتی تھی۔ جہاں وہ اپنے آپ کو بہت آرام دہ محسوس کرتی ایک ساتھ ایک ہی چھت تلے اور ایک گھر میں  
رہنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اس کی زندگی میں یا ذاتیات میں مداخلت کرتی۔  
”میں معذرت خواہ ہوں پارسا! میرا مقصد یہ موضوع پھینکنا یا ایما ز کمال کے بارے میں بات کرنے  
کا نہیں تھا۔ میں تمہاری ذاتیات یا زندگی میں مداخلت نہیں کرنا چاہتی۔“ انہیابیگ نے کہا۔  
”انہیابیگ! تم میری دوست ہو۔ کوئی بات نہیں۔“ پارسا نگاہ ملائے بنا بولی۔  
”پھر ہم شام میں شاپنگ کے لیے چل رہے ہیں نا! تیار رہنا۔“ انہیابیگ نے مسکراتے ہوئے  
موضوع بدل دیا۔  
”دیکھیں گے!“ پارسا کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر کمرے سے نکل گئی تھی۔ انہیابیگ نے اپنی  
دوست کو خاموشی سے دیکھا تھا۔

☆.....☆.....☆  
تم زیادہ جلدی میں تو نہیں ہو.....؟“ للی میک نے پوچھا۔ وہ گاڑی کی چابی اٹھا تا چوٹکا۔  
”کوئی کام ہے کیا؟“ دامیان سوری نے پوچھا۔  
”ہاں اگر تم مجھے ڈراپ کر دیتے تو.....!“ للی میک نے کہا۔  
”تمہیں کہاں جاتا ہے؟“ دامیان سوری نے دریافت کیا۔

”مجھے زائرہ ملک کی طرف جانا ہے۔ بہت دنوں سے وقت نہیں ملا۔ آج صبح ان کا فون آیا تھا۔ مجھے  
اچھا نہیں لگا جب انہوں نے پوچھا کہ میں کتنے دنوں سے ان کی طرف کیوں نہیں آئی شاید ان کو کبھی مجھ  
سے کچھ اُنسیت ہو گئی ہے۔ ایک نامعلوم سارشتہ جانے کیا اسرار رکھتا ہے شاید میں سمجھ نہیں پاری۔“  
”للی! کبھی کبھی چیزوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا مناسب ہوتا ہے۔ رشتے اپنی ہیئت خود بنا لیتے ہیں  
تمہیں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تمہیں وہاں جانا اور ان سے ملنا اچھا لگتا ہے تو تمہیں وہاں جانا  
چاہیے۔“ دامیان سوری نے کہا۔

”میں نہیں جانتی مجھے ان سے ملنا خوشی دیتا ہے کہ نہیں..... مگر مجھے چیزیں حیرت میں مبتلا کرتی ہیں۔  
میں رشتوں کی ہیئت سمجھ نہیں پاتی شاید رشتوں کو سمجھنا کچھ مشکل ہے۔“ للی نے صاف گوئی سے کہا۔  
”ہوسکتا ہے!“ دامیان سوری نے کہا پھر ہاتھ اس کی طرف بڑھایا وہ چونکتے ہوئے دیکھنے لگی۔  
”تمہیں جانا نہیں ہے؟“ وہ بولا تھا۔ للی نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ ”جلدی آ جاؤ۔“ مجھے ایکسل کی طرف

بھی جانا ہے، ہمیں چھوڑ کر اس کی طرف نکل جاؤں گا۔“ اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو اس نے تھاما تھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم اندر نہیں چلو گے؟“

”کیاں.....؟ آئی سے ملنے؟“ دامیان نے کہا۔

”ہاں!“ للی میک نے کہا۔

”تم جانتی ہو میں تمہارے ساتھ ان کے گھر جاؤں اور ملوں؟“ دامیان نے پوچھا۔

”تم نہیں چاہتے؟“ للی نے التماساں داغ دیا۔

”میں نے ایسا سوچا نہیں تھا۔“ دامیان سوری نے صاف گوئی سے کہا اور گاڑی کا دروازہ اس کے لیے کھولا تو للی اگلی نشست پر بٹھ گئی پھر اس نے گاڑی کا دروازہ بند کیا اور گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔

”دامیان! ایک بات پوچھوں؟“

”ہاں پوچھو!“ دامیان نے سرسری انداز میں کہا۔

”ہمیں مجھ سے محبت ہے؟“ للی میک نے کچھ بھی سوچے سمجھے بنا کہا۔ دامیان سوری کسی قدر حیرت سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

”یہ کیسا سوال ہے؟“

”ہمیں پسند نہیں آیا؟“ للی نے آنکھوں پر سیاہ گلاسز چڑھا کر جیسے اپنے احساسات کو چھپایا تھا۔

”یہ میری پسند ناپسندی بات نہیں ہے للی! میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم نے ایسا کیوں پوچھا؟“

”اور میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ تمہارا جواب کیا ہے؟“ للی بڑھکتی سے بولی۔

”میرا جواب کیا ہونا چاہیے للی؟“ دامیان سوری کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ الجھنوں میں گھر چکا ہے۔

”میں تمہارا جواب جانتی تو تم سے پوچھتی کیوں دامیان سوری؟“ للی کو شاید اس کے سوال سے اس کی بے وقوفی کا اندازہ ہوا تھا۔ دامیان سوری جب سادہ گیا تھا۔ للی کو اسے الجھا دیکھ کر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ گاڑی میں خاموشی بہت بڑھ گئی تھی بھی للی میک نے پلیر آ کر دیا۔

گو نجاسا ہے کوئی اکتارا

گو نجاسا ہے کوئی اکتارا

اورے منو اتو بانورا ہے

ٹو ہی جانے ٹو کیا سوچتا ہے

ٹو ہی جانے ٹو کیا سوچا ہے بانورے

ایک روح کو چھوٹی دھن اطراف میں پھیل تھی۔

کیوں دکھائے سینے ٹو سوتے جا گئے

جو برسیں سننے بوند بوند

میںوں کو موند موند

جو برسیں سننے بوند بوند

کیسے میں چلوں؟

دیکھ نہ سکوں

انجانے راستے.....

للی میک کی نگاہیں دامیان سوری کے چہرے کو کھوج رہی تھیں جیسے..... مگر وہ اس کی جانب دانستہ

ایک نگاہ بھی نہیں ڈال رہا تھا۔

”للی میک!“ جانے کس لمحے جیسی آواز ابھری تھی۔

سن رہی ہوں سدھ بدھ کھوکھ

کوئی میں کہانی.....

پوری کہانی ہے کیا کسے ہے پتا

رت ہے جو پل کی یار ہے گی سدا

کسے ہے پتا.....!

”للی میک! تم میرے لیے بہت اہم ہو۔ میری زندگی میں تمہاری اہمیت ہے مگر.....!“ وہ اس کی

جانب دیکھے بنا بولا۔ للی میک پوری توجہ سے اسے دیکھتی ہوئی سن رہی تھی۔ وہ نظریں جو دامیان سوری کو

بغور دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی درخواست تھی ان میں..... مگر دامیان سوری جیسے جانتا نہیں چاہتا تھا۔ ”یہ محبت

ہے یا نہیں..... میں نہیں جانتا۔“ ایک بے پروا جملہ تھا اور للی میک کی ساکت نظریں اس جملے میں کہیں گم

ہو گئی تھیں۔ ”یہ محبت نہیں ہے شاید.....!“ بے یقین..... اور للی میک جیسے اس سے آگے کچھ سن ہی نہیں

سکتی تھی۔

جو برسیں سننے بوند بوند

میںوں کو موند موند

کیسے میں چلوں

دیکھ نہ سکوں

انجانے راستے.....

للی میک کی سماعتوں میں بس وہی لفظ گونج رہے تھے اس سے آگے کی کہانی اس کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ تا

ہی وہ سن سکتی تھی۔

”للی میک! محبت کا تجربہ میں نے کبھی نہیں کیا۔ مجھے نہیں پتا محبت کیسی ہوتی ہے۔ میں ان احساسات

سے یکسر بے خبر ہوں اور انجان بھی..... مجھے محبت کی کچھ خبر نہیں اور.....“ دامیان سوری جیسے اسے جواز

دے رہا تھا مگر وہ صرف خاموشی سے اسے ساکت بیٹھی دیکھ رہی تھی۔

گو نجاسا ہے کوئی اکتارا اکتارا

دکھائی دو۔ جتنی کہ تمہیں لگتا چاہیے۔ میرے بھائی کو بس اپنے پلوں میں باندھ لو یہی حکم چاہتے ہیں اور اس سب کے لیے تمہارا ان کے دل میں گھر کرنا ضروری ہے نا! ایشاع شرارت سے مسکرائی تھی۔

”اف خدا یا! یہ سب کس دنیا میں رہتے ہیں؟“ انا یا ملک من ہی من میں بولی تھی اور پلٹ کر سیلون میں داخل ہو جانا زیادہ ضروری خیال کیا تھا۔ سارہ کو فون ملا یا اور ساری ضروری ہدایت دیں اور پھر کہا تھا کہ اگر وہ جلدی فارغ ہو گئی تو واپس آفس آئے گی۔ مگر اس کا موقع اسے نہیں ملے گا وہ نہیں جانتی تھی۔

جانے کتنے گھنٹے لگے تھے..... وہ صرف سونیاں دیکھتی رہی تھی اور جب اسے فارغ کیا گیا تھا تو بتایا گیا تھا کہ کوئی باہر اس کا منتظر ہے۔ وہ جانتی تھی ایشاع اسے لینے پہنچ چکی ہے۔ تو وہ ایک سکون کی گہری سانس خارج کرنی باہر آئی مگر اپنے سامنے معارج تعلق کو دیکھ کر وہ ادب گئی تھی۔

”اوہ! ایک نئی مصیبت.....“ وہ صرف سوچ سکی تھی کہ یہ نہیں پائی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھی تھی اور فوراً بولی تھی۔

”میں تھک گئی ہوں گھر چلو۔“ عجیب حکم صادر کرتا لہجہ تھا۔ معارج تعلق نے اسے دیکھا اور مسکرا دیا۔

”میں ڈرائیور نہیں شوہر ہوں کچھ تو زری سے بات کرو۔ تمہیں تو اپنی بات منوانے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا۔“ معارج تعلق نے اسے جیسے اسلوب سمجھائے تھے مگر وہ سیکھنے پر تیار نہیں تھی جیسے۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو..... گاڑی چلاؤ نا!“ وہ جیسے واقعی تھکی ہوئی تھی کہہ کر گاڑی کی سیٹ کے ساتھ سر نکادیا۔

”تمہارا چہرہ بہت چمک رہا تھا پارلو والوں کی محنت صاف دکھائی دی ہے۔ چہرے کی چمک دیکھ کر لگ رہا ہے کہ ان کا بل زیادہ نہیں اور کافی جائز ہے۔“ وہ اتنا اچھا حسیں مزاج کب سے رکھنے لگا تھا وہ یہ نہیں جانتی تھی۔ بس ایک نگاہ اس کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں موند لی تھیں۔

”مجھے تمہیں جیولری کی طرف لے کر جانا تھا۔ مئی کا حکم تھا مگر لگتا ہے اور ارادہ ملتوی کرنا پڑے گا۔“ وہ اس کے آرام کا اتنا خیال کرتا تھا.....! مگر وہ اس کے بارے میں زیادہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ آنکھیں موند لی تھیں۔ معارج تعلق نے گاڑی آگے بڑھادی تھی۔ یونہی آنکھیں موندے بیٹھی رہی تھی۔ معارج تعلق سے اب کوئی مزید ڈنڈ نہیں تھا کہ اس نے جو کیا تھا اب اس سے زیادہ کیا کر سکتا تھا۔ وہ کوئی اعتبار تھا یا بے پروائی کہ وہ آنکھیں موندے تک تک بیٹھی رہی تھی جب تک معارج تعلق نے اسے مخاطب نہیں کیا۔

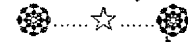
”مسز تعلق!“ وہ جیسے غنودگی میں جانے کو بھی جب اس کی آواز سامعتوں سے نکلرائی تو اس نے آنکھوں کو کھولا، ونڈا وند وند اسکرین سے باہر کے منظر کو دیکھا۔ وہ اسے گھر کی بجائے سی ویو لے آتا تھا۔ سمندر چپ چاپ اور پُر سکون سا تھا۔ لہریں سب کی ساحل سے نکل رہی تھیں۔ اسے وہ منظر بہت پُر سکون لگا تھا، ابھی شاید گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور ساحل کی گیلی ریت پر چلتے لگی تھی۔ معارج تعلق گاڑی سے باہر آ گیا تھا اور ٹیک لگا کر اسے ساحل کی لہروں کے ساتھ چلتے ہوئے دیکھنے لگا تھا۔ وہ بہت کم سن سی دکھائی دی تھی اس کے اندر جیسے کوئی سکون سہاوت کر رہا تھا اس کے اٹھے قدموں میں ایک ٹھہراؤ تھا جو معارج تعلق کو بتا رہا تھا کہ وہ اچھا محسوس کر رہی ہے۔ اسے پُر سکون اور اچھا محسوس کرنا دیکھ کر وہ خوش ہوا تھا.....

گو نچا سا ہے کوئی اکتارا اکتارا کہتا رہا ہے جو برس میں پہنے بوند بوند نینوں کو موند موند کیسے میں چلوں؟ دیکھ نہ سکوں انجانے راستے.....

دامیان سو ری اسے جیسے کسی طرح کی خوش فہمی یا خوش گمانی میں مبتلا رکھنا نہیں چاہتا تھا یا پھر وہ سچ کہہ رہا تھا کہ وہ محبت کے معنی جانتا ہی نہیں۔ وہ اس لمحے کچھ سخت دل بن رہا تھا یا محبت کی گلی سے اس کا گزر واقعی کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ سچ کہہ رہا تھا یا غلط..... کچھ بھی سی ایہ کہانی اپنی جگہ مگر اس گھڑی اسے لی میک کی آنکھوں کے تارے بہت بجھے بجھے لگے تھے۔

گو نچا سا ہے کوئی اکتارا اکتارا گو نچا سا ہے کوئی اکتارا ایک ضد تھی..... ایک تکرار.....! اگر لی میک اس کے گاڑی روکنے پر خاموشی سے اتر گئی تھی۔ نا اسے پلٹ کر دیکھا تھا نا اسے اندر آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ خاموشی سے اسے اندر جاتا دیکھتا رہا تھا پھر چپ چاپ گاڑی آگے بڑھادی تھی۔

کیا وہ واقعی جانتا تھا وہ کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے؟ وہ شاید اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔



ایشاع نے اسے آفس سے لیا اور پھر بیونی سیلون میں چھوڑ دیا تھا۔

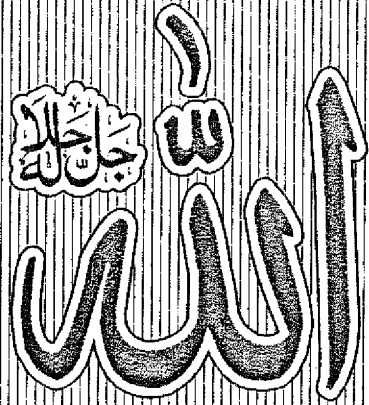
”میں کارڈز دینے جا رہی ہوں اور سب کو یہ دعوت ناے آج ہی دینے ہیں۔ تم اندر جاؤ اور جو جو ضروری کام ہیں انہیں نمٹانے دو بھائی ورنہ بھائی مجھ سے بہت شکوہ کریں گے۔ مجھے کوئی معذرت نہیں سنی سو پلیز کچھ کہنا مت..... ابھی جا کر مایوں کی تقریب کی سجاوٹ بھی دیکھنا ہے کہ سب ٹھیک سے ہوا بھی ہے کہ نہیں.....!“ ایشاع بہت مصروف لگ رہی تھی۔ وہ اسے آفس سے یہ بتا کر نہیں لائی تھی کہ اسے لینے کا مقصد کیا ہے۔ وہ اسے صرف یہ کہہ کر لائی تھی کہ اسے اس کے ساتھ سچ کرنا ہے۔ وہ آفس میں بتا کر نہیں آئی تھی اور کئی اہم امور نمٹانے تھے جس کی فکر اسے ہوئی تھی مگر معارج تعلق کی فیملی جیسے اپنی ہی من مانی کرنا جانتی تھی اور ”سننا“ جیسے سیکھا ہی نہیں تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو بھائی! اندر جاؤ! مقررہ وقت پر میں آ کر لے لوں گی اس کی فکر مت کرنا۔ میں نے بیونی سیلون کی مالکہ سے بات کر لی تھی کہ انہیں کیا کیا کرنا ہے۔ سو پلیز انہیں چپ چاپ کرنے دینا اور کوئی بحث یا احتجاج مت کرنا۔“ وہ جیسے انا یا ملک کی طبیعت سے واقف تھی کہ وہ واویلہ کرے گی۔ ”دہن کے لیے یہ موقع خاص اور ضروری ہوتا ہے تو میں پوری کوشش کر رہی ہوں کہ تم بہت خوب صورت



علم میں کی میراث ہے یہ جہاں سے علم اسے حاصل کرو (روایت)

تشکر و اعتراف کے مستحق ہر شخص کی  
حاجت ہے ایک اور شخص: ہزاروں آسان تحریک کے تحت



اللہ ان کے لئے ہے جو اپنے رب کے لئے شکر کریں  
بقول اکرم اللہ تعالیٰ علیہ وسلم: من شکر اللہ عظمیٰ  
ان لکنا لہ فی کتابہ منہ من اللہ ما یشاء  
چند مرتبہ پڑھو اور اللہ کی رحمت و کرم سے نوازا  
جائے گا کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے اجر عظیم دے گا

اسلامی کتب خانہ الحمد مارکیٹ غزنوی روڈ لاہور۔ فون: 042-37116257  
نئے انٹرنیٹ گروپ آف بک شئرز 7 فریدی چیمبر عبد اللہ ہاؤس روڈ کراچی 74400 فون: 021-35620771/2

کیا وہ اس کی اتنی پروا کر رہا تھا..... یہی سوال انا نیا ملک کے اندر بھی شاید کہیں اٹھا تھا شاید بھی اس نے  
پلٹ کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھیں اور اس روشنی کے  
رنگ جہاں آسمان پر جادو بکھیر رہے تھے وہیں وہ جادو اس ماحول کو بھی اپنے ساتھ باندھ رہا تھا۔ انا نیا  
ملک کا چہرہ ابھی معلوم ہو رہا تھا۔ کسی بھی میک اپ سے ماورا..... کسی بھی بناوٹ سے پکا وہ کوئی رد عمل  
بھی دیتی تھی تو آئینہ سی لگتی تھی..... جو اس کے اندر تھا وہی اس کے چہرے پر تھا شاید اس لڑکی کو اپنے  
احساسات چھپانے نہیں آتے تھے۔ اس لمحہ اسے اپنی جانب دیکھتا پانچواں کمرہ جان سکتا تھا کہ اس کی آنکھوں  
میں کیا سوال تھے۔ وہ جیسے پوچھ رہی تھی کہ وہ کیسے جان پایا کہ اسے یہ مقام سکون دے سکتا ہے..... وہ  
بہت دھیمے سے مسکرایا اور پھر قدم اس کی جانب بڑھا دیئے تھے۔ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اس کے  
پاس جاؤ گا اور پھر بہت ہستکی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”تم مجھے یاد کر رہی نہیں نا!“ معارج تعلق کی نظروں میں شراہت تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا  
بس خاموشی سے اسے دیکھا تھا۔ معارج تعلق کے ساتھ قدم قدم کیلی ریت پر لہروں کے سنگ چلنے لگا۔  
”آپ کو کیسے پتا چلا؟“ وہ یک دم بولی۔

”کیا..... یہی کہ تمہارا دل میرے ساتھ اس ساحل پر قدم قدم چلنے کو چاہ رہا ہے؟“ وہ مسکرایا۔  
”اوں ہوں!“ وہ انکاری ہوئی۔

”اچھا! پھر تم نے پلٹ کر کیوں دیکھا؟“ وہ جاننے پر بضد ہو گیا۔ ”مجھے لگا تمہاری نظریں کہہ رہی ہیں  
کہ کیا تم میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلو گے.....؟ تو میں نے آنے میں دیر نہیں کی۔“ وہ دھیمی سے  
اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اسے زچ کرنے میں جیسے اسے لطف آتا تھا۔

”ایسا کچھ نہیں تھا۔“ وہ اس پر سے نظریں ہٹا کر ڈوبتے سورج کو دیکھنے لگی۔  
”تو پھر.....؟“ معارج تعلق کا مزاج خاصا دوستانہ ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پاتی تھی اس کا اصل کیا تھا اور  
کیا وہ یہ سب صرف اسے تنگ کرنے اور چڑانے کو کرتا تھا۔ ”میں اس مقام پر لانے کے متعلق پوچھ رہی  
تھی کہ آپ کو یہ خبر کیسے ہوئی کہ میں یہاں آ کر سکون محسوس کروں گی؟“

”تمہاری آنکھوں نے کہا تھا!“ معارج تعلق نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔  
”تم اپنی آنکھیں پڑھنے کیوں نہیں دیتیں.....! نظریں کیوں چرا لیتی ہو؟ مجھ سے خوف زدہ ہو یا اپنے  
آپ سے؟“ جس طرح وہ اس کی بہت دیکھنے سے گریز کر رہی تھی وہ محفوظ ہوا تھا۔

وہ لمبا چوڑا مضبوط نظر آنے والا شخص جیسے اس کے ساتھ چلتا خود کو اس کا سب سے بڑا محافظ محسوس ہوا  
تھا۔ جسے وہ اسے ہر طرف سے محفوظ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو مگر کیا انا نیا ملک کو اس کے ساتھ قدم بہ قدم  
چلتا اچھا لگ رہا تھا.....؟

”میں کسی بات سے خوف زدہ نہیں معارج تعلق! مجھے تم سے کبھی ڈر نہیں لگا۔ میرے نانا کہتے ہیں  
جب اپنے اندر خوف بہت بڑھ جاتے ہیں تب ہم جی نہیں پاتے۔ میں کسی خوف کے زیر اثر جینا نہیں  
چاہتی۔ تم میرا جتنا بگاڑ سکتے تھے کر لیا۔ اب مزید کوئی پیش رفت مجھے اس سے زیادہ دیوار سے نہیں

لگا سکتی۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی تو وہ اس کے پر اعتماد انداز سے ہمیشہ متاثر ہوتا تھا۔ اس لئے بھی وہ اس کی سمت دیکھ کر مسکرا دیا۔ ایک بڑی لہرائی تھی اس سے پہلے کہ انا نیلک کا توازن بگڑتا، معارج تعلق نے اسے مضبوطی سے تھام لیا۔ انا نیلک اس اچانک اقدام پر بھونچکا رہ گئی تھی۔

”تم اس طرف چلو میرے اس طرف۔۔۔۔۔“ معارج تعلق نے اس کے سنبھل کر کھڑا ہونے پر رسائی سے کہا۔ کیسا تحفظ دیتا انداز تھا۔

کیا اسے انا نیلک کی اتنی پروا تھی؟

کیا وہ سچ میں اس کا محافظ بن رہا تھا؟

”میں جانتا ہوں تمہیں تیرا نہیں آتا۔ میں اچھا تیراک ہوں۔ میں لہروں سے کھیلنا جانتا ہوں۔“ وہ ملائمت سے مسکرایا۔ انا نیلک کی نظروں میں جیسے حیرت تھی۔ وہ سمجھ نہیں پاتی تھی وہ کیوں ایسا کر رہا تھا کیا وہ اسے واقعی اتنے اچھے سے جانتا تھا۔۔۔۔۔!

”آپ تو شاید زندہ گیوں سے کھیلنا بھی جانتے ہیں معارج تعلق!“ وہ کہہ کر دوسری سمت دیکھنے لگی تھی۔ اس کا لہجہ کڑوا تھا۔ کیسلا اور تلخ۔۔۔۔۔ مگر اس کی کڑواہٹ جیسے معارج تعلق کے مزاج پر الٹا اثر کر رہی تھی۔ وہ اتنا ہی خاموش طبع اور شہنشاہی مزاج کا مالک تھا جیسا کہ سکون انداز میں اسے سنتا تھا۔

کیا وہ اپنا قصور جانتا تھا اور غلطی تسلیم کرتا تھا؟

”مجھے غوطہ خوری کا جنون ہے۔ کسی دن اس کی مشق کریں گے۔ تم خوف زدہ تو نہیں ہوگی نا! مانی کے اندر سمندر کی آخری سطح تک چلے جانے کا اپنا ایک لطف ہے۔ مجھے معلوم ہے تم اسے انجوائے کرو گی۔“ وہ پروگرام بناتا ہوا بولا۔ انا نیلک نے کوئی عہدہ نہیں دیا تھا۔

”تمہیں گھر وند سے بنانے کا شوق کبھی نہیں رہا؟“ معارج تعلق نے پوچھا۔

”نہیں“ مجھے مٹی اور ریت کے گھر وند سے کبھی نہیں لگتے۔ ریت پر بنیاد مضبوط نہیں ہوتی۔ اس لیے گھر وند سے دیر پا نہیں ہوتے۔ میں جب چھوٹی تھی تو اکثر چڑھ جاتی تھی جب گھر وند کسی بڑی لہر کے آجانے کے باعث بہہ جاتا تھا تب میری ساری توجہ گھر وند بنانے سے ہٹ کر سیپاں چھٹنے میں اور جھوٹے جھوٹے کیڑے پکڑنے میں صرف ہونے لگتی تھی۔“ وہ صاف گوئی سے بولی۔

”اور اگر وہ ریت کے گھر وند سے اتنے کمزور نہ ہوتے اور کوئی بڑی لہر انہیں آکر بہا کر نہ لے جاتی تو تمہیں گھر وند بے بنانا آج بھی اتنا ہی اچھا لگتا؟“ وہ اسے بہت موڈ میں لگی تھی چھوٹی چھوٹی باتیں بانتی سنا۔ یہی وہ دلچسپی ظاہر کرتا بولا۔

”شاید۔۔۔۔۔ مگر میں حقیقت سے نظریں پڑا نہیں سکتی نا! گھر ریت پر بنانا بے وقوفی تو ہے، کمزور بنیاد رکھنا اور پھر آس لگانا مایوسی میں مبتلا کر سکتا ہے نا!“ معارج تعلق کو وہ کسی خوف زدہ بچی سی لگی۔ شاید وہ آج بھی کہیں وہیں تھی۔۔۔۔۔ اس چھوٹی سی عمر میں قید۔۔۔۔۔ گھر وند سے بنانے کا شوق رکھتی مگر اسی خوف میں مبتلا کہ وہ گھر ٹوٹ نہ جائے۔

”اور اگر میں تمہیں ایک ایسا گھر بنا کر دکھاؤں جو ریت پر سمندر کے قریب بنا ہو مگر اس کی بنیادوں

میں کمزوری نہ ہو تو؟“ کیا وہ اسے کوئی خواب دکھانا چاہتا تھا یا اسے اس خوف سے باہر نکالنے کے لیے جتن کر رہا تھا یا پھر لفظوں سے کھیلنے کا ہنر۔۔۔۔۔!

”تمہیں لگتا ہے میری یہ عمر خواب دیکھنے والی ہے معارج تعلق!“ سورج کی سنہری کرنوں سے اس کا چہرہ سنہری ہو رہا تھا۔ وہ اس کے پختہ انداز فکر پر مسکرا دیا تھا۔

”تمہارا یہی تو مسئلہ ہے انا نیلک تعلق! کہ تم خواب بھی دیکھنا نہیں چاہتیں۔“ اس نے اس کی سوچ پر افسوس کیا۔

”میں خواب واقعی نہیں دیکھنا چاہتی۔ چاہوں بھی تو نہیں رہ سکتی خوابوں میں۔۔۔۔۔ میں حقیقت پسند ہوں اور تمہارا مزاج کب سے خواب دکھانے والا ہو گیا۔۔۔۔۔ تم تو خوابوں کو ملیا میٹ کرنے والے ہو نا! احساسات سے ماورا جذبات سے بے پروا، بے حسی میں جیتے ہو۔ تمہیں گھر بنانے کی لگن کب سے ہونے لگی؟“ اس کا لہجہ تلخ تھا مگر وہ مسکرا دیا۔

”ہاں مجھے لطف آتا ہے یہ سب کر کے تم تو مجھے بہت اچھے سے سمجھنے لگی ہو نا۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ چلتے چلتے رک گئی تھی۔

”معارج تعلق! بہت کھوکھلے ہو گئے ہو تم اس طرح مسکراتے جیسے اس مسکراہٹ کی حقیقت کچھ نہ ہو اور تم بہت کم زور آدمی ہو اندر سے۔ صرف اپنے باہر کے خول کے ٹوٹنے سے خوف زدہ کہ تمہارا بھرم نہ ٹوٹ جائے اور سب کو تمہاری اصلیت نہ پتا چل جائے کہ تم اصل میں کتنے کمزور انسان ہو۔“ وہ اپنا غصہ اس پر نکال رہی تھی۔ مگر وہ بہت سکون سے سن رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر کوئی لکیر نہیں تھی۔ وہ اسے پرسکون سمندر جیسا لگا تھا جو شانت سا بہتا ہے اور کئی طوفان اپنے اندر مدغم رکھتا ہے۔

تو کیا وہ اسے ضرب لگانا چاہتی تھی۔

معارج تعلق نے اس کی کلائی کو مضبوطی سے تھاما تھا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت سخت تھی اس نے اسے گھما کر اس کا رخ سورج کی سمت کر دیا۔

”اس طرف دیکھو تمہیں روشنی میں کوئی منظر دھندلا دکھائی نہیں دے گا نا کچھ غیر واضح تمہیں روشنی سے رخ موڑ کر نہیں روشنی کو دیکھ کر اس کی سمت سفر کرنے کی ضرورت ہے۔ مسرتعلق! اپنے اندر کی کمزوری پر نظر کرو کہ تم روشنی کا سامنا کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی ہو۔“ اس کا انداز دھیما تھا۔ بے اختیار کلائی پر سے گرفت ڈھیل کی تھی اور پھر کلائی چھوڑ کر چلتا ہوا گاڑی کی سمت بڑھنے لگا۔

انا نیلک اسے خود سے دور جاتا دیکھتی رہی تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

”کیا ہوا“ کھانے میں مرچ تیز ہے کیا؟ تمہاری آنکھوں سے اس طرح پانی کیوں بہہ رہا ہے؟“ زائرہ ملک نے لٹی میک کو دیکھا۔

”بچی کو پانی دو اور وہ فروٹ ٹرائفل آگے کرو۔“ نانا کو بھی فکر ہوئی۔ لٹی میک جو سر جھکائے کھانا کھا رہی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں سے بے ساختہ انداز آنے والے آنسوؤں کی خود بھی خبر نہیں تھی۔ زائرہ ملک

کے احساس دلانے پر اس نے اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیرا تھا اور می دلچسپ لڑچولی تھی۔

”تم ٹھیک ہو؟“ زائرہ ملک کو فکر ہوئی۔

”ہاں ہاں! میں ٹھیک ہوں۔ آپ نے کھانا بہت لذیذ بنایا ہے۔ نانا میں ابھی فروٹ ٹرانسفل نہیں لوں گی۔ فی الحال کھانا کھاؤں گی مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ فروٹ ٹرانسفل بعد میں چکھوں گی۔“ اس نے نشو سے آنکھوں کو رگڑا تھا اور مسکرا دی۔

”زائرہ ملک! یہ بریانی مجھے بہت پسند آتی ہے۔ آپ مجھے بنانا سکھائیں گی؟“ وہ کہہ کر پھر سے کھانے لگی۔

”ہاں سکھا دوں گی مگر تمہیں اتنی مرج کی عادت نہیں ہے نا! میں نے احتیاطاً مرج کم ڈالی تھی مگر.....!“ می نے پانی کا گلاس اس کی سمت بڑھایا۔

”کوئی بات نہیں زائرہ ملک! آپ نے کھانا بہت اچھا بنایا ہے۔ مجھے مسالوں والے کھانے پسند ہیں۔ میری می کے ہاتھ کا ذائقہ آپ کے ہاتھ میں.....!“ اس نے برملا تسلیم کیا تھا۔

”تمہاری می مشرقی کھانے بنا سکتی تھیں کیا؟“ نانا چونکے تھے۔

”ہاں! جہانگیر ملک کو بریانی اور دیگر مشرقی کھانے بہت پسند تھے۔ تو می نے سب سیکھ لیا تھا۔“

”بہت اچھے!“ نانا متاثر ہوئے تھے۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟ مستقبل میں کیا ارادے ہیں۔ شادی یہاں کرو گی اس ماحول میں یا.....؟“

می نے پوچھا۔ اس کا بریانی منہ میں لے جاتا ہاتھ رکھا تھا۔

”میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا زائرہ ملک! یہ بہت بڑا فیصلہ ہے۔ میں اپنی ماں جیسی شادی نہیں چاہوں گی۔ مجھے ساری عمر ایک آدمی کے ساتھ ایک گھر میں اس کی بیوی بن کر رہنا ہے۔ تو بہت مختار رہنے کی ضرورت ہے۔“ اس نے بات بنائی۔

”ہاں یہ تو اہم ہے۔“ نانا نے سراہا تھا۔

”شادی ایک پیچیدہ معاملہ ہے اس میں احتیاط کی بہت ضرورت ہے۔ می نے بھی کہا تھا۔“

”اوہ شادی سے یاد آیا۔ انانیا کی منڈا کی تھی۔ غالباً وہ شادی کو ایک بڑی تقریب بنانے جا رہے ہیں۔ اسی کے سلسلے میں دعوت نامہ دینے آئی تھی۔ میں نے لکرمیز پر رکھ دیا تھا۔ تم دیکھ لو بیٹا۔“ نانا نے یاد آئے پر کہا تھا۔ وہ انھی تھیں اور پھر کارڈ لینے بڑھ گئی۔ پلٹیں تو بغور کارڈ دیکھ رہی تھیں۔

”مجھے انانیا نے نہیں بتایا تھا کہ وہ تقریب کا کوئی ارادہ بنا رہے ہیں!“

”تو کیا ہوا؟ اگر وہ ایسا کر رہے ہیں تو اس میں عجیب کیا ہے؟ ملنے ملانے والوں کو شادی کے بارے میں آگاہ کرنا ضروری ہوگا تو انہوں نے تقریب کا انعقاد کر دیا۔“ نانا نے سرسری انداز میں کہہ کر بات کو مکمل قرار دیا۔

”ہاں مگر یہ سب تو ماہوں، مہندی، سنگیت سبھی کچھ کر رہے ہیں۔“ زائرہ ملک چونکی۔

”کیا عجیب ہے بیٹا! شادی اتنی افراتفری میں ہوتی تھی کہ اس کی نوبت نہیں آئی۔ اب اگر وہ تمام

آخر کتنا تا شکرا بن جاؤں میں اس کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤں میں دن کو دنیا داروں جیسا روپ بھردوں رات آئے تو سجے میں گر جاؤں میں پھول اور پودے جاگ رہے ہیں میرے ساتھ ان ہی کو اب دل کا حال سناؤں میں منی پانی آگ ہوا کی قید میں ہوں شعر میں لیکن رنگ کس کی دکھلاؤں میں خواب سفر میں گھوموں چاند ستاروں پر آنکھ کھلے تو خود کو زمیں پر پاؤں میں بھیں بدل کر رات کو میرے ساتھ نکل دنیا کیا ہے آ تجھ کو دکھلاؤں میں ہر شب دل میں ایک یہی خواہش جاگ اٹھے ماں کی گود میں سر رکھ کر سو جاؤں میں روک رہے ہو زہر کا پیالا پینے سے چاہتے کیا ہو تم جیسا بن جاؤں میں موت کے ڈر سے بچ نہ کہوں تو کیا عارف جھوٹ کہوں اور اندر سے مرجاؤں میں (عارف شفیق)

تقریبات الگ الگ کر رہے ہیں۔ تو کیا حرج بہو کا خیر مقدم اسے چاؤ سے کر رہی ہے تو کیا برا ہے؟“ نانا نے کہا تھا۔ زائرہ ملک نے انانیا کا موبائل نمبر ملایا تھا۔ مگر اس کی بیٹری غالباً ختم تھی۔ بات ممکن نہیں ہو سکتی تھی۔

”یہ لڑکی سدا کی پے پر وا ہے۔ کبھی موبائل چارج نہیں کرتی۔“ زائرہ ملک فکر بندی سے گویا ہوئیں۔

”اوہو کیا پریشانی ہے؟ بیٹھو کھانا کھاؤ۔ بات بعد میں کر لینا۔ شادی کی تیاریوں میں مصروف ہوگی۔“ نانا نے انہیں مطمئن کیا تھا۔

”ہاں ابا! مگر اسے بات تو کرنا چاہیے۔ کل یہاں آنا تھا اور نہیں آئی۔ مجھے فکر ہوتی ہے اس کی۔“

زائرہ ملک موبائل ایک طرف رکھ کر کرسی چھینچ کر بیٹھی تھیں۔

”فکر کرنے کی بات نہیں۔ وہ اب اس گھر کی بیوی ہے۔ انہیں اس کا خیال رکھنا ہم سے بہتر آتا ہوگا۔“

نانا بولے۔ زائرہ ملک بے دھیانی میں پلیٹ میں پیچ چانے لگی تھیں۔

”آپ ٹھیک ہیں زائرہ ملک!“ ملی میک نے انہیں دیکھا تھا۔ وہ سارا قصہ چپ چاپ سن رہی تھی۔



زارہ نے سر اثبات میں ہلایا۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔ بس انا نیا کی کچھ فکر ہو رہی ہے۔ ماں ہوں نا۔“

”ماں ایسی ہی ہوتی ہے۔ میں جانتی ہوں میری ماں بھی ایسی ہی تھیں۔ مگر بچے بڑے ہو جائیں تو ماں کو ان پر اعتماد کرنا چاہیے۔ بچوں کا حوصلہ بھی بڑھتا ہے۔ کوئی بھی معاملہ ہو آپ انا یا ملک کو خود سے سنبھالنے دیں۔ آپ اس کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہ سکتیں۔ اسے یہ سب خود سے کرنا آنا چاہیے۔“ لٹی میک بہت سمجھ داری سے بولی۔

”ماں! بچی ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ نانا متفق ہوئے تھے۔

”لیکن بچوں کو اچھا لگتا ہے جب ماں ان کی اتنی فکر کرتی ہے۔ لٹی میک کے اندر جس شے کی کمی تھی۔ اس کا اظہار بھی کبھی اس کی باتوں سے ہو جاتا تھا۔ زارہ ملک نے اسے بغور دیکھا تھا۔ پھر بازو اس کے گرد پھیرا کر اسے ساتھ لگا کر اس کی پیشانی پر پیار کیا۔

”میرے پاس اب دو بیٹیاں ہیں۔ ایک انا نیا اور دوسری تم!“ لٹی میک نے ان کی سمت خاموشی سے دیکھا۔ پھر نانا کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

”نانا! آپ مجھے وہ فروٹ ٹرانگل پکڑائیں گے؟“

نانا نے اسے فروٹ ٹرانگل تھما دیا تھا اور پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”میں ذرا پچھل قدمی کروں گا۔ بہت کھا لیا۔“ نانا باہر کی طرف بڑھ گئے تھے۔

”تمہیں کوئی پریشانی ہے؟“ زارہ ملک نے دریافت کیا۔

”نہیں!“ وہ بہت اعتماد سے ان کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

”کیوں؟“ سوالیہ نظروں سے زارہ ملک کو دیکھا تھا۔

”کچھ نہیں مجھے جانے کیوں لگا کہ تم کچھ پریشان ہو۔“ زارہ ملک نے کہا۔

”آپ کو ایسا کیوں لگا؟“ لٹی چوکی۔ ”ویسے آپ نے یہ پیٹھا بہت اچھا بنایا ہے۔ آپ کو کیسے پتا چلا کہ

یہ میرا پسندیدہ ہے؟“ کیا وہ بات کو موضوع سے ہٹانا چاہ رہی تھی۔

”تم رو کیوں رہی تھیں؟“ لٹی میک کا ہاتھ رکھا تھا اور وہ نگاہ چراگئی تھی۔

”نہیں!“ میں نہیں رو رہی تھی۔“ وہ انکاری ہوئی۔

”ماں سے جھوٹ بولنا ممکن ہے؟“ زارہ ملک نے کہا اور جانے کیا ہوا تھا کہ وہ ان کے شانے پر سر

رکھنے پر مجبور ہو گئی تھی اور چپ چاپ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ زارہ ملک نے کچھ نہیں کہا

تھا۔ کوئی سوال نہیں پوچھا۔ پتھر پر تنک اسے موقع دیا تھا کہ وہ اپنے اندر کے اس غبار کو نکال دے اور یہ

سودمند بھی ثابت ہوا تھا۔ لٹی میک کچھ دیر بعد ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑتی ہوئی ان سے الگ ہو گئی

اور بولی۔

”آپ کے کھانے میں شاید آج کچھ خاص تھا مجھے بہت اچھا لگا اور جب میں خوش ہوتی ہوں تو بلا

وجہ آنکھوں سے پانی بہہ نکلتا ہے۔“ وہ جیسے اندر کی خجالت اور شرمندگی کو تو دھور ہی تھی۔ زارہ ملک نے

کچھ نہیں کہا بس پیار سے اس کا شانہ پیچھے پاتھا۔

”اب ٹھیک سے یہ فروٹ ٹرانگل کھاؤ۔ میں تمہارے لیے کافی بنا کر لاتی ہوں۔“ زارہ ملک اٹھ کر کچن کی سمت بڑھ گئی تھیں مگر لٹی میک سے مزید نہیں کھایا گیا تھا۔ اس نے ہاتھ پیچ لیا تھا۔ پھر پرس سے سیل فون نکال کر دیکھا تھا۔ شاید اسے خوش گمانی تھی کہ کوئی میسج یا ماس کال ہوگی مگر ایسا کچھ نہیں تھا۔ لٹی میک نے سیل فون دوبارہ بیگ میں ڈال دیا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

”میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی کہ تم جب اتنا کچھ کر چکے ہو تو میری فیملی سے روابط کیوں بڑھا رہے ہو کہ سارے پیغامات اب بھی تمہارے ویلے سے مجھے تک پہنچ رہے ہیں۔“ پارسا چوہدری نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا تھا۔

”اس بات کا جواب تمہیں مجھ سے نہیں خود اپنے آپ سے مانگنا چاہیے گلابو!“ وہ لالعلق لہجے میں بولا۔

”مجھے خود سے کسی بات کا جواب مانگنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ یلماز کمال! تم آج بھی اتنے ہی بے حس اور خود غرض ہو اور یہ تمہاری سرشت میں ہے۔ تم کبھی بدل نہیں سکو گے۔“ پارسا چوہدری نے کہا۔ ”اور تم مجھے بدلنے کے جتن کیوں کرنا چاہتی ہو؟ تم سے کوئی کام ڈھنگ کا نہیں ہوتا! مجھ سے دور نہیں رہ سکتیں تم؟“ وہ سپاٹ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بے تاثر اور نظریں ہر احساس سے ماور تھیں۔ جیسے وہ کوئی ردیوٹ ہو۔ کوئی مشین۔

”تمہارے اتنے سارے اسکینڈلز کس طرح مشہور ہیں؟ تمہارے پاس تو کوئی احساس ہے نامروت! دل سینے میں دھڑکتا ہے اس کی بھی کیا گارنٹی ہے؟“ پارسا چوہدری نے طنز کیا۔

”میرے پاس دل واقعی نہیں ہے گلابو! اور اسکینڈلز میرے پیار محبت یا عشق کے نہیں بنے وہ کچھ اور نوعیت کے ہیں۔ میرے نزدیک اس بات کے لیے کوئی پابندی ہے نا شرم۔ میں نے جو کیا اپنی مرضی سے کیا اور اس کے لیے کوئی احساس جرم بھی نہیں۔ جو نام میرے ساتھ جوڑے گئے ان پر بھی میں نے کبھی کوئی زبردستی نہیں کی۔ وہ اپنی پوری رضامندی سے میرے ساتھ ہوئیں۔ میری طرف سے کبھی کوئی حدود یا شرائط نہیں رکھی کہیں۔“ وہ برملا کہہ رہا تھا۔

”تمہیں جاننے میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ وہ چڑ کر بولی۔

”اچھی بات ہے۔ مجھ سے دس میل دور باکرو! میں تمہاری بھلائی ہے۔“ اسے جتا رہا۔

”مجھے تمہارے قریب آنے کا کوئی شوق نہیں ہے یلماز کمال! میں جانتی ہوں تمہارے نزدیک جذبات اور احساسات کی کوئی وقعت نہیں ہے۔“

”ٹھیک!“ اس نے سر تسلیم خم کیا۔

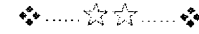
”تم میرے لیے کوئی پیغام لائے تھے؟“ وہ اصل موضوع پر آتی ہوئی بولی۔

”ہاں! چاچی نے تمہارا پوچھا ہے اور یہ تمہارے لیے بھیجا ہے۔“ اس نے ایک پیکٹ اس کی

”مجھے کیا پتا.....! اب چاچی سے ہر بات نہیں پوچھتا۔ انہوں نے فون کر کے بلایا تھا۔ میں چلا گیا۔ انہوں نے یہ پیکٹ تھمایا اور میں نے تھام لیا۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح کہا کہ کسی اور کو پتا نہ چلے کہ میں نے گلابو کے لیے یہ سب تجھے دیا ہے تو میں نے صیغہ راز میں رکھنے کا وعدہ کر کے تھام لیا۔ اب اس سے زیادہ سوال جواب مجھ سے مت کرنا۔ تیرے لیے دیہات کا سفر کرتا ہوں۔ احسان ہے تجھ پر۔“ یلماز کمال نے جتنا۔

”اوہ تو تم مجھ پر احسان کر رہے ہو؟ تو ٹھیک ہے آئندہ یہ احسان مت کرنا۔ مجھے تم جیسے بندے کا کوئی احسان بھی نہیں لینا۔ تمہارا جو کرایہ بنا ہوا مجھ سے وصول کر لینا۔ چیک بنا کر دے دوں گی۔“ وہ پیکٹ تھام کر زہر خند لہجے میں کہتی ہوئی پلٹی تھی۔ جب اس نے ایک جھٹکے سے اس کی کلائی تھام کر اسے جھکا دیا تھا۔ اس کی کلائی پر اس کی گرفت انتہائی سخت تھی اور اس کی آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔

”آئندہ جو بولنا ہو سوچ سمجھ کر بولنا۔ ورنہ اگلا اسکینڈل جوئے گا وہ تیرے ساتھ بنے گا۔“ وہ انتہائی سخت لہجے میں کہہ کر اس کا ہاتھ چھوڑ کر تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ وہ اپنی کلائی پر اس کی سخت گرفت ابھی تک محسوس کر رہی تھی۔ انگلیوں کے نشان کلائی پر چھپ چکے تھے۔ پاراسکی آنکھیں پانیوں سے بھر گئی تھیں۔



ایشاع نیچے کسی کمرے میں تھی۔ جب ملازم نے آن کر اطلاع دی تھی کہ ایشاع بھائی اسے بلارہی ہیں۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر آئی تھی۔ وہ یہاں پچھلے کئی دنوں سے تھی مگر گھر کے کئی گوشے اب بھی اس نے نہیں دیکھے تھے بلکہ بہت سے حصوں کی طرف وہ گئی بھی نہیں تھی۔ اسی لیے جب ملازم کہہ کر باہر نکل گیا تھا تو وہ کھڑی سوچتی رہی تھی کہ نیچے کس کمرے میں..... کس راہ داری کی طرف۔ وہ سوچتی ہوئی اس طرف آگئی تھی کہ کوئی ملازم ہوگا تو وہ اس سے مدد لے لے گی۔ مگر نگاہ دور تک دوڑانے پر بھی اسے کوئی ملازم دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ اپنی مدد آپ کے تحت راہ داری سے گزرتی ہوئی آگ بھڑکی تھی۔ مگر راہ داری کے اختتام پر جا کر رک جانا پڑا تھا کیونکہ کمروں کا اختتام ہو چکا تھا۔ وہ میل فون پر ایشاع کا نمبر ملا کر اس سے پوچھنا ہی چاہتی تھی کہ وہ کہاں ہے جب ایک کمرے نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی تھی۔ جانے کیا اسرار محسوس ہوا تھا کہ وہ آگے بڑھنے لگی تھی اور اس دروازے کے پینڈل پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ شاید وہ کمرہ مقل نہیں تھا دروازہ کھلتا چلا گیا تھا۔

گلابی رنگ کی کلر اسکیم اور قیمتی فرنیچر سے مزین وہ کمرہ بہت نفاست سے سجایا گیا تھا۔ جس طرح کی آرائش و زیبائش تھی اس سے ظاہر تھا کہ یہ کمرہ کسی لڑکی کا ہے تو کیا یہ ایشاع کا بیڈ روم تھا۔ جیسے وہ ہمیشہ سے استعمال کرتی رہی تھی اور اب جب کچھ دنوں کے لیے قیام کے لیے آئی تھی تو وہی کمرہ استعمال کرنے کو ترجیح دی تھی.....!

وہ چیزوں کے معیار اور انتخاب سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ کسی نے اسے بہت دل سے سنوارا تھا اگر یہ ایشاع کے زیر استعمال تھا تو ایشاع کا ذوق کمال تھا۔ وہ ایک ایک شے سے متاثر ہو رہی تھی مگر ایشاع اسے کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔

”ایشاع؟“ اس نے پکارا تھا۔ پھر وہ واش روم کے دروازے کے قریب آئی تھی، مگر اندر سے کوئی آواز بالکل نہیں آ رہی تھی۔ ”ایشاع! وہ پکارتی ہوئی پلٹی تھی۔ سبھی نگاہ سائینڈ نیبل پر گئی تھی۔ ایک انتہائی دلکش پیکر کی تصویر وہاں سائینڈ نیبل پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ ایشاع تو بالکل نہیں تھی۔ تو کیا وہ کسی غلط کمرے میں آگئی تھی۔ وہ چونکی تھی۔ اس کمرے کی آرائش و زیبائش اور صفائی سے کہیں نہیں لگتا تھا کہ وہ کمرہ کسی کے استعمال میں نہیں۔ تو یہ کون تھی؟ یہ پری پیکر! یہ دل کش چہرے والی لڑکی! اس خاندان سے کیا تعلق رکھتی تھی؟ وہ آگے بڑھی تھی اور تصویر اٹھا کر بغور دیکھنے لگی تھی۔ بلاشبہ اس نے اس سے زیادہ حسین چہرہ اپنی ساری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ حسن اپنے اندر ایک عجیب دل نشی رکھتا تھا۔ وہ حیران تھی اس گھر کا کون سا کونسا تھا جو اس سے چھپایا گیا تھا اور جس کے متعلق اسے آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔

”یہ کون تھی؟“ وہ اس تصویر کو بغور دیکھ رہی تھی۔ جب اپنے پیچھے اسے کھٹکا محسوس ہوا تھا۔ وہ یکدم پلٹی تھی۔ معارج تعلق اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کی نظروں سے بچی کو نہ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس نے آج سے پہلے کبھی ایسے نہیں دیکھے تھے۔ اس کی آنکھوں سے صاف پتا لگ رہا تھا کہ وہ اس کی یہاں موجودگی سے خوش نہیں ہے۔

”تم یہاں کیسے آئیں؟“ وہ بہت سخت لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔ انا یا ملک نے ابھی کوئی جواب بھی نہیں دیا تھا۔ جب اس نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے تصویر لے کر دوبارہ سائینڈ نیبل پر رکھی تھی اور اس کی کلائی کو سختی سے پکڑ کر اسے لے کر اس کمرے سے باہر نکلنے لگا تھا۔

وہ اس کی اس حرکت پر بے انتہا حیران تھی۔ ایسا کیا ہوا تھا؟ وہ یوں بدسلوکی کیوں کر رہا تھا؟

اسے باہر نکال کر اس نے کمرہ مقل کیا تھا اور پلٹ کر رستم کی طرف دیکھا تھا۔

”اس کمرے کی ذمہ داری تمہیں سونپی گئی تھی نا!“ وہ قہر برسانی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ انا یا ملک حیران تھی۔ نگاہ حیرت سے معارج تعلق کو دیکھ رہی تھی۔

(انشاء اللہ باقی آئندہ ماہ)



# سینچی کہاں بہا

نزہت جمیں ضیاء

یہ سارے پھول یہ پتھر اسی سے ملتے ہیں  
تو اے عزیز! ہم اکثر اسی سے ملتے ہیں  
وہ ایک بار نہیں ہے ہزار بار ہے وہ  
سو ہم اسی سے بچھڑ کر اسی سے ملتے ہیں

”مالا! بیٹی! چھت سے لحاف اُتار لاؤ شام ہو رہی ہے کہیں اوس شروع نہ ہو جائے۔“ دادو کی آواز پر مالا۔ ”اچھا دادو۔“ کہہ کر چھت پر جانے لگی۔ وہ لحاف لے کر پٹی ہی تھی کہ برابر والی چھت پر کھڑی ماہین کو دیکھ کر اس کے قریب آگئی۔ دونوں مل کر باتیں کرنے لگیں۔ کافی دیر بعد وہ لحاف لے کر نیچے اتری دادو کے ساتھ پر آمدے میں کسی اجنبی شخص کو دیکھ کر ٹھنک گئی۔ اجنبی کی پیٹھ اس کی جانب تھی۔

”آؤ بیٹی مالا! میرا بآیا ہے!“ دادو نے کہا۔ ”میرا ب.....؟“ وہ زیر لب بڑبڑائی۔ دل دھڑکا اس نے لحاف وہیں تخت پر ڈال دیے۔ میرا ب نے ہلٹ کر اسے دیکھا۔

”السلام علیکم!“ مالا نے جلدی سے کہا۔ ”علیکم السلام۔“ کہہ کر میرا ب آنکھیں پھیلائے اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

”یہ..... مالا ہے؟“ لہجے میں حیرت تھی۔

”کیوں کوئی شک ہے کیا؟“ مالا نے قریب آ کر سختی سے کہا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ بگڑ گیا تھا۔

”نہیں!“ اس بار وہ گڑبڑا گیا۔ کیونکہ آج کی مالا اور چند سال پہلے والی مالا میں بہت فرق نظر آ رہا تھا۔ تیل سے چڑے لہجے بالوں کی جگہ جدید انداز کے ڈائی کیے بال اور جدید فیشن کے ٹراؤزر اور شرٹ میں پچھری اوڑھے با اعتماد اور پروقار سی مالا اس کے لیے قطعاً نئی تھی۔ مالا نے ایک گہری نظر میرا ب کے حیران چہرے پر ڈالی گزشتہ سالوں میں اس کے اندر کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اسے حیران چھوڑ کر مالا نے تلے قدم اٹھائی لیکن کی طرف چل دی۔ کچھ دیر بعد مالا آئی تو ہاتھ میں گرم گرم بھاپ اڑاتی کافی اور چاکلیٹ کیک تھا۔

”یہ کیک گھر میں بنا ہے کھائے گا ضرور اور ہاں کافی بھی میں نے بنائی ہے۔“ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے ٹرے سامنے رکھ کر وہ منظر سے غائب ہوتے ہوئے میرا ب کو اچھی طرح نشانہ بنا کر گئی



تھی۔ کچھ دیر بعد میرا بچہ چلا گیا۔

مغرب کی اذان کے ساتھ ہی دادو وضو کرنے اٹھ گئیں اور وہ نماز پڑھنے چل دی نماز سے فارغ ہو کر الماری کھولے پڑے سلیکٹ کر رہی تھی کہ دادو آگئیں۔

”بیٹی! میرا بچہ کا آنا تجھے برا لگا کیا؟“ سوال پر وہ چونک کر بولی۔

”ارے نہیں دادو کسی بات کر رہی ہیں آپ“

آپ کا نواسا ہے وہ۔ آپ کی مرحومہ بیٹی کا بیٹا۔“

دادو کے مذہب اور وجود پر اسے ترس آ گیا تھا۔

”بیٹی! مالادہ.....“ اس نے آگے بڑھ کر دادو کو

تھام لیا۔ ”چھوڑیں بھی اب آپ کچھ مت سوچیں“

اللہ نے جو کیا بہتر کیا“ میں..... میں تو خوش ہوں نا

آپ کے ساتھ، اچھا آئیں یہاں بیٹھیں میرے پاس دیکھیں نا میرا دوشہ جو ماہین نے کاڑھ کر دیا

ہے۔“ اس نے دادو کی توجہ ہٹانے کی خاطر پنک

کاشن کا دھاگوں کے کام والا دوشہ ان کے سامنے

پھیلا دیا اور کچھ دیر بعد ہی مالادہ نے انہیں ادھر ادھر کی باتوں میں لگا کر ان کا موڈ بالکل بحال کر دیا۔ بظاہر

مطمئن اور ہنسنے والی مالادہ آج میرا بچہ کو دیکھ کر ایک بار پھر بکھر گئی تھی۔

ماہی کی سچ یادیں پھر سے اسے ستانے لگی تھیں۔ رات کے کھانے کے بعد دادوؤں کے اثر سے دادو تو جلد سو گئیں لیکن مالادہ..... مالادہ کی آنکھوں سے جیسے نیند روٹھ چکی تھی۔

☆☆☆☆

صدیقہ بیگم کے دو بچے وہاب اور انیلہ تھے۔ وہاب بڑا تھا اور انیلہ چھوٹی صدیقہ بیگم کے شوہر

ایک بہت بڑے زمین دار تھے اس لیے ان کے

انتقال کے بعد صدیقہ بیگم مالی لحاظ سے مستحکم رہیں۔ وہاب نے بھی پڑھائی مکمل کر لی تھی۔ ابھی وہ زمینوں وغیرہ کے بارے میں اتنا نہیں جانتا تھا پھر وہ لوگ شہر میں آباد تھے سارا انتظام نئی عنایت سنبھالتے۔ وہاب بھی کچھ گاؤں جا کر زمینوں وغیرہ کا حساب دیکھ لیتے۔ انیلہ ابھی میٹرک میں تھیں صدیقہ بیگم ہو لانا چاہتی تھیں ایسے میں گاؤں جاتے جاتے وہاب نے وہاں کی ایک لڑکی پسند کر لی اور جب ماں سے اپنی پسند کے بارے میں بتایا تو صدیقہ بیگم نے صاف انکار کر دیا۔ وہاب نے پیش میں آ کر خود ہی شادی کر لی اور صدیقہ بیگم نے انہیں جائیداد سے بے دخل کر دیا۔ وہاب جو گاؤں گئے تو پھر لوٹ کر نہیں آئے اور صدیقہ بیگم نے بھی دل پر پتھر رکھ لیا۔ وہاب کی بیوی ایک ان پڑھ اور گاؤں کے ماحول میں پلی جاہل لیکن خوب صورت عورت تھی۔ نہ پسینے اور نہ کالہ سلیقہ تھا۔ نہ بات کرنے کا ذہن تھا۔

صدیقہ بیگم نے مناسب رشتہ دیکھ کر انیلہ بیگم کی شادی کر دی اور اس شرط پر کہ وہ کھر داماد رہیں گے۔ انیلہ کے شوہر احمد دوپٹی میں جاب کرتے تھے۔ کئی ماہ و سال بیت گئے بھی کبھار گاؤں سے

وہاب کی کوئی خبر مل جاتی جسے سن کر صدیقہ بیگم سنی ان سنی کر دیتیں احمد چھٹیوں پر آتے کچھ ماہ رہ کر

واپس چلے جاتے پھر احمد کو وہاں اچھا گھر وغیرہ مل گیا تو انہوں نے انیلہ کو بلوانے کا سوچا۔ انیلہ کا

ایک بیٹا میرا بچہ تھا جو اب بیس بائیس سال کا ہو گیا تھا اور ایم ای اے کر رہا تھا۔ انیلہ اور احمد نے سوچا کہ

میرا بچہ کو بھی یہیں بلوائیں گے ورنہ صدیقہ بیگم اکیلے رہ جاتی ہیں انیلہ دوپٹی چلی گئیں اور میرا بچہ

نانو کے پاس رہ گیا۔

پھر اچانک خبر آئی کہ وہاب کا انتقال ہو گیا ہے اس کی بیوی کے انتقال کی خبر تو کئی سال پہلے آ چکی تھی لیکن بیٹے کی موت کی خبر اور پھر ایک جوان پونی کی موجودگی کی خبر نے صدیقہ بیگم کے حواس چھین لیے اور وہ دھڑام سے گر پڑیں۔ میرا بچہ نے دوڑ کر نانوں کو سنبھالا ہوش میں آئیں تو ایک ہی رٹ تھی کہ ”مجھے میری پونی ملا۔ ہائے میری معصوم پونی“ میرے بچے۔ تو نے ماں کو شکل تک نہ دکھائی۔“ وہ دہ بارہ بلک پڑیں۔ پھر نئی عنایت کی کوشش سے مالادہ اپنی دادو سے ملی۔ دونوں دادی پونی دھواں دھارو رہیں۔ مالادہ جو خود کو بے آسرا سمجھ رہی تھی اپنی دادو کی نرم آغوش میں آ کر اسے تحفظ کا احساس ہوا۔

میرا بچہ کسی کام سے گیا ہوا تھا جب شام کو لونا تو برآمدے میں نانوں کے ساتھ بیٹھی مالادہ کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ پندرہ سولہ سال کی ذرا موٹی سانولی

رنگت والی لڑکی تھی جس کے بالوں میں تھوک کے حساب سے تیل چھڑا ہوا تھا اور تیل کی چمکانا ہٹ سے چہرہ بھی متاثر تھا۔ لمبی لمبی چوٹیوں میں رنگ

برنگا پرانہ ڈالے شاکلنگ پنک اور اورنج بڑے بڑے پھولوں والے ڈھیلے ڈھالے اور بے تکے کپڑوں پر لمبی سی کالی چادر لپیٹے وہ عجیب بے

وقوف لڑکی نظر آ رہی تھی۔

”آؤ آؤ میرا بچہ ملا ہے۔ وہاب کی بیٹی۔“

صدیقہ بیگم کی آواز بھرا گئی۔ مالادہ نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اونچا لمبا سانولی رنگت گھنے بالوں والا وہ

نوجوان اسے اچھا لگا تھا۔

”السلام علیکم!“ مالادہ نے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام!“ کہہ کر میرا بچہ تیزی سے اسے کمرے کی طرف چلا گیا۔ مالادہ کو دیکھ کر میرا بچہ

عجیب سی گھبراہٹ آ رہی تھی۔ واقعی اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ گاؤں سے آئی ہے۔

مالادہ کے آجانے سے صدیقہ بیگم بہت مطمئن ہو گئی تھیں کہ اب میرا بچہ دوپٹی جائے گا تو مالادہ تو

ساتھ رہے گی۔ میرا بچہ کو مالادہ کے وجود سے ہی وحشت ہوئی وہ اپنے کام سے کام رکھتا اور کوشش

کرتا کہ مالادہ سے سامنا ہی نہ ہو لیکن گھر کے سارے کام مالادہ نے سنبھال لیے تھے۔ وہ میرا بچہ

کے چھوٹے چھوٹے کام بھی کر دیا کرتی۔

ایک دن شام کو میرا بچہ اتفاق سے گھر پر تھا۔ مالادہ

دادو کے ساتھ بیٹھی دوپٹے پر کڑھائی کر رہی تھی دادو سبزی بنا رہی تھیں میرا بچہ کچھ فاصلے پر بیٹھا کوئی

کتاب پڑھ رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے اس نے ایک اچھٹی سی نگاہ مالادہ پر ڈالی شاید آج نہا کر بیٹھی تھی تب

ہی لمبے لمبے بالوں میں تیل چھڑا ہوا نہیں تھا۔ میرا بچہ نے اسے آج تک کچھ پڑھتے نہ دیکھا تھا

نہ چاہتے ہوئے بھی میرا بچہ اس سے پوچھ بیٹھا۔

”مالا! کیا تم کبھی اسکول نہیں گئیں؟“

”ہاں جی میں نے گاؤں کے سرکاری اسکول سے دس جماعتیں پڑھی ہیں پھر اب نے کہا کہ بس

اب کون سی ماسٹر کی کی نوکری کرنی ہے اس لیے بس آگے نہیں پڑھا۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”تمہیں شوق بھی نہیں ہے پڑھنے کا؟“

دوبارہ پوچھا۔

”نہ جی نہ اتنا سارا تو پڑھ لیا“ لکھ پڑھ سکتی ہوں۔ خط بھی لکھ سکتی ہوں۔ اب کیا ضرورت ہے؟“

لمبے میں فخر کے ساتھ ساتھ پڑھائی سے فطرتی ہیزاری بھی تھی۔

”واقعی اتنا سارا پڑھ لیا ہے۔“ بی بی انج ڈی کر لی ہے سرسوں کے تیل پر۔“ فطر سے بڑا تاتا ہوا وہ اپنی

کہتا میں سنبھال کر اٹھ کر اندر چلا گیا اور مالا حیرت سے اس کی پشت دیکھتی رہی۔ کتنا اچھا لگتا تھا اسے میرا اب بالکل فلموں کے ہیرو جیسا! لیکن اس کی جانب وہ دیکھتا بھی نہیں تھا۔

پھر جب مالا کو دادو کی زبانی معلوم ہوا کہ میرا اب دوبنی جا رہا ہے تو مالا کے اندر جیسے کچھ کھلبلی سی ہوئی۔ عجیب سی اداسی نے اسے گھیر لیا۔ اتنی دور جا رہا تھا وہ اپنے اس جذبے پر خود ہی حیران ہو رہی تھی۔ یہ کیا تھا؟ شاید وہ میرا اب کو جاننے لگی تھی۔ معصوم سی مالا کا معصوم سادل اس کی چاہ کر بیٹھا تھا جو ہر لحاظ سے اس سے کمزور دور تھا۔ اس کا دل جب بہت پریشان کرنے لگا تو وہ دادو کے پاس آگئی جہاں آکر اسے سکون ملتا تھا۔

دادو بھی اس کا بہت خیال رکھتیں۔ بچوں کی طرح اس سے ایک ایک بات پوچھتیں مالا دادو کے ساتھ مطمئن تھی ایک بے کلی تھی تو میرا اب کے رویے سے۔

”بیٹی تو یہاں آ کر خوش تو ہے نا؟ تجھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں اگر کچھ چاہیے تو کہہ دے۔“ ایک روز دادو نے پیر دہانی مالا سے پوچھا۔ تب اس کا دل چاہا تمام تر حیا بالائے طاق رکھ کر کہہ دے۔

”دادو! میرا اب مجھے دے دو۔“

”مالا کیا سوچ رہی ہے بچی؟“ دادو کی آواز پر وہ چونکی۔

”دادو! آپ نے مجھے بہت پیار ہر چیز تو دے رکھی ہے مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“ آنکھوں میں آنی نمی کو چھپا کر وہ دادو کی باتوں میں سما کر دھیرے سے بولی اور دادو نے مسکرا کر اسے سینے سے لگا لیا۔

میرا اب کے جانے کے دن بالکل قریب آگئے تھے۔ مالا کا دل چاہتا تھا کہ وہ میرا اب سے بہت سی

باتیں کرنے لے اس کے منہ کی بارے میں معلوم کرے اپنا منہ اسے بتائے اور آنے والے دنوں کی بھی اچھی اچھی باتیں لیکن وہ تو بالکل بھی گھاس بیڑا لٹا بلکہ اب تو اس کی مسروریت اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔

مالا کی وقتی تو اس پاس کی لڑکیوں سے ہونگی تھی۔ اس لیے وہ اکثر ان کے ساتھ بازار چلی جاتی، گرمیوں کی آمد تھی اس لیے دادو نے اسے گرمیوں کے کپڑے لانے کے لیے کہا تو وہ اس روز ماہین کے ساتھ بازار آگئی۔ اپنے لیے اور دادو کے لیے بھی دو سوٹ لے آئی۔ شاپر سنبھالے وہ خوش خوش گھر میں داخل ہوئی خلاف معمول دادو پر آمدنے کے بجائے اپنے کمرے میں تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آگے بڑھی اور اندر سے آنی آوازوں نے اس کے قدم روک لیے۔ اندر میرا اب بھی تھا۔

”میرا اب! انیلہ نے فیصلہ تم پر چھوڑا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تمہارے جانے سے پہلے تمہارا اور مالا کا نکاح کر دوں۔“ مالا گھر کی بیٹی ہے سلیقہ مند اور گھڑے پھینا اچھی بیوی ثابت ہوگی اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے تسلی رہے گی۔“

”اوہ تو ناٹو یہ..... کیا کہہ رہی ہیں آپ۔“ میرا اب کی آواز قدرے تیز تھی۔ ”وہ..... وہ بے وقوف اور گاؤں کی لڑکی! جسے نہ سینے کا ہوش ہے نا بات کرنے کا سلیقہ۔ جو پاؤ بھرتیل سر میں بھر کر ہر وقت تھیلوں میں ملبوس دو شمال لیے رہتی ہے نہ لباس کا خیال ہوتا ہے نہ ہی فیشن اور دنیا کے بارے میں خبر۔ میں ایم بی اے ایسی لڑکی کے ساتھ۔“ وہ گاڑ.....! آپ لوگوں نے ایسا سوچا بھی کسے؟

اسے تو نہ کالی بنائی آنی ہے نہ ہی اچھی کوئلنگ

بیکنگ! ناٹو آئی ایم سوری لیکن میں..... میں آپ کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا۔“

اتنی تذلیل! ف خدا! مالا کو لگا جیسے پگھلا ہوا سیسے کانوں میں انڈیل دیا گیا ہو۔ وہ لٹے پیر پٹی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی اتنی تھک اور تذلیل پر اس کی آنکھیں برسنے لگیں۔ اسے لگا جیسے اس کے سارے وجود میں آگ کی لگ گئی ہو۔ اس کا روم روم چلنے لگا تھا۔ شدت غم اور شرمندگی سے وہ گھر رہی تھی لیکن اسے خود پر قابو پانے میں کمال حاصل تھا۔ اگلے چند لمحوں میں وہ سنبھل کر بظاہر ہستی مسکراتی شاپر سنبھالے دادو کے کمرے میں گئی اور وہ دشمن جاں ایک نگاہ اس پر ڈال کر کمرے سے نکل چکا تھا۔

پھر میرا اب چلا گیا اور جاتے جاتے مالا کی سوچوں کو نارینگ دے گیا۔ اس کی سوچوں میں واضح تبدیلی آگئی تھی شاید اسے اپنی کم وقتی کا احساس ہو گیا تھا۔

”دادو! میں نے سوچا ہے کہ پڑھائی دوبارہ شروع کر دوں۔“ مالا کی بات پر دادو نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”ہاں دادو! میرے خیال میں اس دور میں پڑھائی بہت ضروری ہے۔ پڑھائی کے بغیر انسان تو کسی قابل نہیں رہتا۔ نہ ہی زمانے کے بارے میں سمجھ سکتا ہے۔ نہ ہی اس میں عقل اور رکھ رکھاؤ آ سکتا ہے۔“ اس کے لرزتے لہجے پر دادو نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

یہ..... لڑکی اتنی گہری بات! یقیناً میرا اب کی بات پر۔

”مالا..... تو..... تو.....!“

”ہاں! دادو میں پڑھوں گی بہت زیادہ میں..... میں خود کو بدل دوں گی دادو۔ میں جاہل

اور گنوار نہیں رہوں گی دادو۔“ دفعتاً وہ ہڈیانی انداز میں کہتی ہوئی دادو سے لپٹ کر بری طرح رونے لگی۔ آج بھی میرا اب کا ایک ایک لفظ نشتر بن کر اس کے وجود کو زخمی کر رہا تھا دادو بھی مالا کے غم میں اس کے ساتھ رو دس۔

اب تو جیسے مالا کی دنیا بدل رہی تھی۔ اس نے دوسرے دن سے ہی ماہین کے ساتھ مل کر ایڈمیشن کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی ماہین سے کورس لیا اور دن رات مصروف رہتی اس نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ بیکنگ کلاسز بھی لینا شروع کر دیں ساتھ ساتھ جدید تراش خراش کے لباس کی کلاسز بھی ہفتے میں ایک بار لینے لگی۔ زندگی کو مصروف کر کے وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

میرا اب کا بھی تمہارون آ جاتا وہ آواز پہچان کر دادو کو تھما دیتی۔ حالانکہ انیلہ سے وہ بات کرتی، میرا اب نے وہاں ایک کمپنی جو ان کر لی تھی جس کا رابطہ کراچی سے بھی تھا لیکن وہ کافی عرصہ نہیں آیا ماہ سال گزرتے رہے۔

اس عرصے میں مالا نے امتیازی نمبروں سے گریجویشن کیا اور ساتھ ہی ایم اے کی تیاری کرنے لگی ایسا لگتا تھا کہ وہ پڑھائی کے معاملے میں جنونی ہو گئی ہے۔ اس عرصے میں اس کے لیے بہت سے رشتے بھی آئے لیکن اس نے دادو سے صاف کہہ دیا کہ ابھی وہ صرف پڑھنا چاہتی ہے۔ دادو بے چاری خاموش ہو گئیں۔ ادھر میرا اب کی شادی کی اطلاع بھی ملی نہ جانے کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی مالا تکیے میں منہ دیے بے آواز سسک پڑی۔ لگتا تھا اسے عرصے کے بعد آج بھی وہ دشمن جاں دل کے کسی کو نے میں دھرتا دیے بیٹھا تھا۔

کچھ عرصے بعد میرا اب کے آنے کی خبر ملی وہ

پاکستان آنے والا تھا۔ کمپنی کے کسی کام کے سلسلے میں رہنا تو اسے ہول میں تھا البتہ صدیقہ بیگم سے ملنے وہ آگیا اور..... اور..... آج کالا کو دیکھ کر ہنگامہ رہ گیا۔ یہ وہ..... وہ مالا تو نہ تھی۔ جسے وہ کچھ سال پہلے رنجش کر کے گیا تھا۔ اُس مالا اور اس مالا میں زمین آسمان کا فرق تھا اور میراب ایک ہفتے بعد لوٹ گیا۔ وہ نانو کے لیے اور مالا کے لیے کپڑے لایا تھا۔

کچھ عرصہ گزرا پھر ایک دن میراب کا فون آیا وہ بہت رو رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا کہ انیل اور احمد دونوں ہی ایک حادثے میں فوت ہو گئے ہیں۔ ادھر نانو بھی بلک پڑیں یوں دونوں بچوں نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ایسے میں مالا نے بہت ہمت اور صبر سے دادو کو سنبھالا۔

”بیٹا میراب..... اب تو پاکستان آ جانی بیوی کو لے کر وہاں رہ کر اور پریشان ہوگا۔“ نانو کی بات پر اس نے کہا۔

”ہاں نانو میں خود بھی آنا چاہ رہا تھا لیکن لیکن نانو میں نے وہاں پر فلیٹ خرید لیا ہے اور میں وہاں رہوں گا۔“ اس کی بات پر نانو سرد ہر کر رہ گئیں۔ میراب آگیا اس کے ساتھ ڈیڑھ دو سال کی بیاری سی بیٹی بھی تھی۔

”ہائے میرے بچے۔“ نانو اس سے لپٹ کر دھواں دھار روئے لگیں تو اسے کو دیکھتے ہی بیٹی داماد کی یاد آگئی تھی۔ اس طرح روتا دیکھ کر بھی منی بچی گھبرا کر رونے لگی مالا نے آگے بڑھ کر بیٹی کو گود میں لے لیا۔ بچے تو ویسے بھی اس کی کمزوری تھے۔ بچی فوراً چپ ہو گئی۔

”میراب بیٹا تیری بیوی؟“ کچھ دیر بعد سنبھل کر نانو نے میراب سے پوچھا۔

”نانو..... میں نے اسے طلاق دے دی ہے۔“ میراب نے شکستہ لہجے میں کہا۔

”کیا.....؟“ نانو نے سینے پر ہاتھ مارا۔ ”مگر کیوں بچے؟“ نانو کی بات پر مالا نے چونک کر میراب کے دھکی چہرے پر نظر ڈالی۔

”بس نانو شاید وہ اس قابل نہ تھی وہ ایک بدتمیز اور ماڈرن لڑکی تھی۔ اسے گھر یا ریا بچے سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اس نے خود ہی طلاق مانگی اور بھی رومال بھی چھوڑ کر چلی گئی۔“ میراب کے لہجے میں دکھ بول رہے تھے۔ کتنا بکھرا ہوا اور نہ حال سا لگ رہا تھا وہ بے در پے حادثات نے گویا اسے توڑ کر رکھ دیا تھا حالات اور پھر تنہی بچی کا ساتھ وہ پریشان تھا۔

مالا سے اب نظریں ملاتے بھی اسے شرمندگی ہو رہی تھی۔

صدیقہ بیگم کے لاکھ کسے پر بھی میراب کبھی یہاں پر رکتا نہیں تھا۔ آتا کچھ کھٹے بعد جلا جاتا اس طرح عرصے میں مالا رومال کے ساتھ پھلتی رہی میراب اور صدیقہ بیگم باتیں کرتے رہتے۔

میراب نے پاکستان میں ایک فلیٹ خرید لیا تھا اور ایک گورنس رکھ لی تھی۔

اس روز بھی میراب آیا ہوا تھا۔ میراب اور دادو کمرے میں بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے۔ مالا بچکن میں مصروف تھی۔

”میراب بچے! تو کب تک اس طرح رہے گا؟“ گھر میں بچی سے سوشکات ہوتی ہیں کم از کم تو کوئی ڈھنگ کی لڑکی دیکھ کر نکاح کر لے گو کہ تو نے مالا کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے لیکن میرا دل کرتا ہے کہ مالا سے بات کر کے مالا اور تیرا.....“

”خدا کے لیے نانو! اب ایسا مت کریں میرے ہاتھوں اتنی تدلیل کے بعد میں خود کو اس

قابل نہیں سمجھتا اور نانو پھر..... جس لڑکی کو میں نے بری طرح دھکا مارا۔ وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے؟ ہرگز نہیں نانو اس وقت میں خود غرضی کی انتہا پر تھا اور آج میں اپنی مجبوری اور ضرورت کی بجائے اسے چڑھا دوں نانو کوئی بھی لڑکی اتنی تفصیح کے بعد مجھ جیسے شخص کی شکل نہ دیکھے وہ تو پھر بھی مجھ سے بات کر لیتی ہے۔ اب مجھ سے رشتہ جوڑے ناممکن ہے نانو اور یہ بات میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں۔“

میراب کے لہجے میں دکھ شرمندگی اور ندامت تھی۔

”لیکن میراب.....! آپ کا یہ دعویٰ غلط بھی ہو سکتا ہے۔“ مالا کی آواز پر دادو کے ساتھ ساتھ میراب نے بھی چونک کر دروازے میں کھڑی مالا کو دیکھا۔

”ہاں میراب میں نے بہت سوچا ہے۔ مجھے رومال آج اس مقام پر نظر آتی ہے جس پر کل میں تھی میراب میں جانتی ہوں بن ماں کی بیٹی کی زندگی کیسی ہوتی ہے۔ میں بہت چھوٹی تھی جب ماں کا انتقال ہوا۔ ابانے اکیلے مجھے کس طرح سنبھالا مجھے کوئی سمجھانے بتانے اور سکھانے والا نہ تھا۔ جو ملا پہن لیا جیسا ملا کھالیا نہ ج غلط کا پتا تھا نہ ہی اچھے برے کا پھر مجھے تو دادو نے سنبھال لیا لیکن رومال کو کون سنبھالے گا۔ مجھے ایسے بچوں کی نفسیات سمجھ میں آگئی ہے۔ میں نے بہت کڑا وقت گزارا ہے۔ خود کو بنانے میں بہت دقت اور دشواریاں دیکھی ہیں اور..... میں..... میں رومال کو دوسری مالا نہیں بننے دوں گی۔ میں..... میں رومال کے لیے سب کچھ بھولنے کے لیے تیار ہوں۔“

”مالا! تم..... تم بہت عظیم ہو مجھے..... مجھے معاف کر دو مالا۔“ میراب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے جب کہ دادو فرط مسرت سے مالا کو

دیکھ رہی تھیں۔

مالا کے لہجے میں اعتقاد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسی اعتقاد نے اسے حوصلہ بخشا تھا۔

”یا اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے آج میرے بچوں کی روجوں کو قرار مل گیا ہوگا۔ ادھر آؤ میرے بچوں۔“ صدیقہ بیگم نے روتے ہوئے کہا۔

میراب اور مالا ان کے پاس گئے تو انہوں نے دونوں کو سینے سے لگا کر آسو بہا ڈالے۔

”میں..... میں شکرانے کے نفل پڑھنے جا رہی ہوں۔“ کچھ لمحے بعد وہ اٹھ کر نماز پڑھنے چل دیں۔

”بہت شکریہ مالا! آج..... آج تم نے مجھے اپنا مقروض بنالیا ہے۔“ میراب نے مالا کے قریب آ کر پیار سے اس کے ہاتھ تھام کر جذب سے کہا۔

”میں میراب یہ مت سمجھنا کہ یہ فیصلہ میں نے ترس کھا کر کیا ہے۔ بلکہ مجھے تو رومال کا مستقبل عزیز ہے اور.....! وہ کچھ لمحے کے لیے رکی، حیا اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔

”اور..... اور کیا مالا.....؟“ میراب کا لہجہ بے تاب تھا۔

”اور..... اور شاید میرے دل میں اس دشمن جاں کے لیے آج بھی سو ف کا رز تھا۔“ خوب صورت اعتراف پر میراب کے دل میں اُترتی چلی گئی۔ میراب نے آگے بڑھ کر مالا کو سینے سے لگا لیا اور میراب کے فران سینے سے لگ کر مدتوں سے پھلتے دل کو ڈھیر وں سکون مل گیا۔





# گہر ہونے تک

عائشہ خان

وہاں نہ پھول کھلتے ہیں نہ ہی موسم بدلتے ہیں  
وہاں تو کچھ نہیں ہوتا جہاں پر تم نہیں ہوتے  
یہاں ویسے تو ہر سوغات آسانی سے ملتی ہے  
یہ میرا دل نہیں لگتا جہاں پر تم نہیں ہوتے

”آپ کس سوچ میں کھو گئے ہیں شاہ جی!“ فضا  
کی آواز انہیں حقیقت کی دنیا میں کھینچ لائی تھی۔  
”بس یونہی..... سوچ رہا تھا آخر کب سے تم مجھے  
جانتی ہو؟“ انہوں نے خاصی بے دلی سے کہا تھا۔  
”شاید ازل سے.....“ اس کی بہت جھمی سی آواز  
اور خواب آگیاں لہجہ انہیں پھر اپنی طرف مائل کرنے  
لگا تھا۔  
”تمہیں علم ہے تمہاری آواز اور لہجہ دونوں  
بے حد خوب صورت ہیں؟“ بے اختیار ہی وہ کہہ  
گئے تھے۔  
”اللہ تعالیٰ کا شکر ہے شاہ جی! اگر آواز اور لہجہ بھی  
دلکش نہ ہوتا تو میں کیا کر لیتی لیکن پھر کوئی اور خوب  
صورتی ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر بندے کو کسی نہ کسی  
خوب صورتی سے ضرور نوازتا ہے۔ میرا خیال ہے اب  
آپ کو سونا چاہیے زیادہ جاگنا آپ کی صحت کے لیے  
ٹھیک نہیں ہے۔“ اپنی نرم انگلیاں دھیرے دھیرے  
ان کے بالوں میں پھیرتے ہوئے اس نے کہا۔  
”نہیں! ابھی مجھے نیند نہیں آ رہی۔“ ان کا جھٹ  
سے کہنے کو دل چاہتا تھا مگر بشکل خود کو کہنے سے باز رکھا

اور دل ہی دل میں خود کو ڈپٹتے ہوئے سونے کی کوشش  
کرنے لگے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ ان کے سر کو سہلائی  
رہی تھی اور جانے کس پل انہیں نیند آ گئی۔  
پھر ان چند لمحوں میں اس نے یوں انہیں چاہا تھا  
اس قدر ٹوٹ کر محبت کی تھی کہ ان کی ساری زندگی کی  
فکری جیسے ختم ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتے تھے کہ  
بیاری اور تنہائی ان کے عذاب ناک دنوں میں اگر اس  
کا وجود نہ ہوتا تو وہ کیا کرتے..... وہ بھی تو جیسے نہ کوئی  
تکلیف تھی نہ پریشانی حتیٰ کہ یہ خیال اور خدشہ بھی  
کہ بتائیں نہ پتہ چلتے پر وہ دیکھ بھی سکیں گے یا نہیں  
اس نے بھلا دیا تھا اور وہ اتنے یقین سے کہتی تھی۔  
”آپ کی آنکھیں اللہ کے فضل سے بالکل ٹھیک  
ٹھاک ہیں شاہ جی! آپ بالکل فکر نہ کریں۔“  
”تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو فضا!“ ایک  
دن انہوں نے پوچھ لیا۔  
”مجھے اپنے اللہ پر بے حد یقین ہے۔ اس نے  
آج تک میری کوئی دعا روئیں کی۔“ بے حد مان سے  
کہا گیا یہ جملہ انہیں متاثر کر گیا۔  
اس دن سارہ کا فون آ یا تھا اور ہمیشہ کی طرح فضا

اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔ جب کافی دیر گزری اور وہ نہیں آئی تو وہ بے حد بے چین ہو گئے تھے۔ اچھے خاصے تکلیف دہ انتظار کے بعد جب وہ آئی تو خاموش سی تھی۔

”فضا! کہاں رہ گئی تھیں؟ دو بار میں نے سسٹر ماری کو بھیجا تھا تمہیں دیکھنے کے لیے۔“

”اتنی دیر تو نہیں گزری شاہ جی!“ اس کی بھاری اور پھٹی پھٹی سی آواز پر وہ بڑی طرح چونکے۔

”فضا! تم رونی رہی ہو؟“ ان کے دل کو جیسے کچھ ہوا تھا۔

”نہیں تو۔۔۔۔۔۔“

”جھوٹ مت بولو فضا! بتاؤ کیوں رونی تھیں؟“

”یونہی دل بھر آ پاتا تھا۔“

”یونہی تو کچھ نہیں ہوتا۔“ آہستگی سے کہتے ہوئے انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور ضبط کی طنائیں جیسے اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں۔ ان کے ہاتھ پر پیشانی ٹکائے وہ رونی چلی گئی۔ انہوں نے بے اختیار اسے بازوؤں میں لے لیا۔ انہیں اس کے رونے سے بے حد تکلیف پہنچ رہی تھی مگر انہوں نے اسے چپ نہیں کرایا تھا کیونکہ جانتے تھے اس وقت جو بات اسے زلزلہ رہی ہے وہ ان کو نہیں بتائے گی اور دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا دوسرا راستہ صرف آنسو ہی تھے۔

”آج شام آپ کی آنکھوں کی پٹی کھل جائے گی نا؟“ وہ اک اضطراب اور کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ انہوں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا، دونوں خاموش تھے لیکن یہ خاموشی بھی اپنے اندر گوبائی رکھتی تھی۔

”جانتی ہو فضا! جی کھلتے ہی میں کسے دیکھنا چاہوں گا؟“

”کسے۔۔۔۔۔۔؟“ اس نے آہستگی سے پوچھا۔

”صرف تمہیں۔۔۔۔۔۔!“ انہوں نے کہا اور اپنے ہاتھ پر گرتے انمول آبی قطروں کو لبوں سے چھو لیا تھا، ممکن سا مذاق ان کے پورے منہ میں گھل گیا اور ایک عجیب سی طمانیت انوکھی سی سرشاری ان کی رگ رگ میں پھیل گئی تھی۔

ان کے ہاتھ کو اپنے نرم و گداز ہاتھوں کی گرفت میں لیے وہ بار بار اپنی آنکھوں سے لنگائی اور ان کی عمر بھر کی نقشی جیسے اس کے آنسوؤں میں بہتی جا رہی تھی۔ کسی کے لیے اس قدر اہم ہونے کا احساس بہت انوکھا اور خوش کن تھا بے حد مسرور اور مغرور کر دینے والا۔

”دیکھنے کے قابل تو سارہ جاتی ہیں مجھ میں تو ایسی کوئی بات نہیں شاہ جی!“ کئی لمحوں کے بعد اس نے دھیرے سے کہا۔

”خسں شکلوں میں نہیں دیکھنے والی نگاہ میں ہوتا ہے فضا! اور تم نے بھلا سارہ کو کب دیکھا ہے؟“

”بہت بار۔۔۔۔۔۔“

”کہاں۔۔۔۔۔۔؟“

”آپ کے ساتھ۔“ تبھی ڈاکٹر ان کو چیک کرنے کے لیے آگئے تھے اور ان کو بات ختم کرنی پڑی تھی۔ پھر ان کی پٹی کھل گئی تو انہوں نے فضا کو دیکھا تھا۔ اس نے پورا چہرہ اس بار چادر میں چھپایا ہوا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔

انہوں نے ایسی آنکھیں میلے بھی نہیں دیکھی تھیں جو بیک وقت ہنس بھی رہی تھیں اور رو بھی رہی تھیں۔۔۔۔۔۔ جو بے تحاشا یا رلٹا رہی تھیں۔۔۔۔۔۔ شمار ہوئی جا رہی تھیں۔۔۔۔۔۔ وہ آنکھیں جو آئینہ تھیں اور آ آ سینے میں ان کا ہی عکس تھا۔ وہ بے خود سے ان آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے بہت کہا تھا کہ وہ چہرے

سے چادر اتار دے لیکن وہ نہیں مانی تھی۔

”اس چہرے میں ایسا کچھ نہیں ہے شاہ جی! جو دیکھ کر آپ خوش ہوں۔ اصرار کر کے مجھے شرمندہ مت کریں۔“ اس نے کچھ اس انداز میں کہا تھا کہ وہ خاموش ہو گئے تھے۔ پھر جب انہوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ ماں جی کے پاس جا رہے تھے تو وہ خاموش سی ہو گئی تھی۔

”کیا بات ہے فضا! کیا تم میری ماں جی سے ملنا نہیں چاہتیں؟“ انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”ایسی بات نہیں ہے شاہ جی! دراصل آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے دھیرے سے کہا اور اس کی بھاری ہوئی آواز اور سرخ آنکھوں نے اس کی گواہی دی تھی۔

”تو ٹھیک ہے۔ آج کی رات ہم ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں صبح چلے چلیں گے۔“ انہوں نے فوراً اپنا پروگرام بدل دیا اور وہ کھلی ہوئی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

پہلے انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ وہ واقعی اس قدر بد صورت ہے جتنا کہتی ہے لیکن جب اس نے مسلسل چہرہ اچھپائے رکھا اور کھانا بھی علیحدہ کمرے میں کھایا تو انہیں یقین کرنا پڑا لیکن یہ کوئی ایسی پریشان کن بات نہیں تھی۔ چہرے کی سرجری کروانی جا سکتی تھی اور یہ کام وہ فوراً کرنا چاہتے تھے۔

رات گئے گھپ اندھیرے میں جب وہ بے خبر سو رہی تھی۔ ان کی اچانک آنکھ کھل گئی تو دل چاہا کہ وہ لائٹ جلا کر اس کا چہرہ دیکھ لیں لیکن چونکہ اس نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اس لیے انہوں نے بمشکل خود کو روکے رکھا لیکن دل میں انہوں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ صبح سب سے پہلے فون کر کے

سکرینری کو اس کے چہرے کی سرجری کے فورا سے پیش تر انتظامات کرنے کے لیے کہیں گے مگر اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔

صبح وہ بیدار ہوئے تو وہ کمرے میں نہیں تھی۔ انہوں نے وائش روم کے دروازے پر نگاہ ڈالی تھی جو کھلا ہوا تھا۔ تبھی ان کی نگاہ نیکے کے ساتھ رکھے اپنی ڈائری میں سے پھاڑے ہوئے ایک صفحے پر پڑی تو وہ بڑی طرح چونکے۔ کسی انجانے سے احساس کے تحت ان کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکا تھا۔ تیزی سے انہوں نے وہ کاغذ سیدھا کیا اور پھر بڑی طرح چونکے۔

”شاہ جی!“

خدا کرے آپ ہمیشہ خوش رہیں۔ دل تو چاہتا ہے خاک بن کر آپ کے قدموں سے لپٹ جاؤں راکھ بن کر آپ کے ارد گرد بھر جاؤں۔ مگر آپ سے دور نہ جاؤں لیکن دل کا کیا ہے دل تو بہت کچھ چاہتا ہے اور جی بات تو یہ ہے شاہ جی کہ انسان بہت ناشکرا ہے اس کی خواہشات کا دائرہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے ورنہ مجھے تو اتنا کچھ ملا ہے جو میں خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ وہ دن جو آپ کی قربت میں بسر ہوئے میرے لیے سرمایہ حیات ہیں۔ زندگی ان دنوں کی یاد کے ساتھ گزار دینا میرے لیے قطعاً مشکل نہیں بس آپ سے ایک ہی التجا ہے اگر آپ مان سکیں تو۔۔۔۔۔۔ کہ خدارا اپنا نام مجھ سے مت چھینے گا۔

اللہ نگاہبان

ہمیشہ آپ کی خوشیوں کے لیے دعا گو

دل و جان سے آپ کی

”فضا“

چند لمحے تو وہ خالی الذہنی کی سی کیفیت میں



ساکت و صامت سے بیٹھے رہے تھے پھر جیسے ان کے جسم میں بجلی سی بھڑکنی تھی۔ سلیپنگ گاؤن کی ڈوریاں باندھتے وہ تیزی سے گاڑی کی جانب بڑھے تھے پھر سارا دن وہ پاگلوں کی مانند اسے ڈھونڈتے رہے تھے لیکن وہ نہیں ملی تھی۔ وہ بادبھاری کے سبک خرام جھونکے کی مانند سکون و طمانیت اور فرحت و راحت کا احساس بن کر ان کی زندگی میں داخل ہوئی تھی اور کبھی نہ ختم ہونے والی بے چینی و بے قراری اور رنج و ملال دے کر نکل گئی تھی۔ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ انہیں کیسے جانتی تھی؟ اور اس حد تک کہ محبت کرنے لگی تھی؟ بلکہ محبت بھی نہیں وہ تو عشق تھا۔ اور عشق بھی ایسا جس میں انسان فنا ہو جانے کی خواہش کرنے لگتا ہے لیکن پھر وہ ان کی زندگی سے کیوں نکل گئی۔ وہ سوچتے تھے اور حیران ہوتے تھے اور بے کئی تھی کہ بڑھتی چلی جاتی تھی۔ بے قراری تھی کہ ہر دم مضطرب کیے رکھتی تھی۔

عجب لڑکی تھی خود تو پاگل بھی انہیں پاگل بنا گئی تھی۔ کسی کام میں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ یہاں تک کہ سارہ کی پڑھ سرتگت بھی اب جیسے کوئی کشش نہیں رکھتی تھی۔ وہ ان کے سامنے ہوتی تھی لیکن وہ فضا کے بارے میں سوچ رہے ہوتے اس کی محبتیں اس کی شدتیں اس کی وارفتگی کچھ بھی تو بھولنے والا نہیں تھا۔ دن تو جیسے تیسے گزر جاتا لیکن رات کو اس کی یادیں سوئے نہیں دیتی تھیں۔ اب تو سارہ بھی ان کی بے تو جہی کا گلہ کرنے لگی تھی اور ان کی بے دھیانیوں پر چڑنے لگی تھی۔ اس دن تو ان کی اچھی خاصی تھی ہوئی تھی۔ وہ ایک اسکول کے افتتاح کے لیے مدعو تھے۔ یہ اسکول ان کے دوست ریحان صاحب کی بیٹی نے قائم کیا تھا۔

جہاں غریب بچوں کی مفت تعلیم کا انتظام تھا۔ یونیفارم کتابیں کاپیاں اور بیگ ہر چیز مفت تھی۔ چند دن پہلے انہوں نے اسکول کے لیے دو لاکھ کا چیک دیا تھا جس پر سارہ اچھی خاصی چراغ پا تھی۔ اسی لیے جب انہوں نے افتتاح کے لیے مرادشاہ اور اسے مدعو کیا تو پہلے تو وہ جانے کے لیے ہی تیار نہیں تھی اور جب ان کے اصرار پر تیار ہو گئی تو ان کی بے نیازی نے اس کی سوانحیت کو بڑی طرح مجروح کیا تھا اور وہ ایک دم پھٹ پڑی تھی۔

”آخر آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے ہر وقت ماتی صورت بنائے جانے کہاں گم رہتے ہیں۔ میں تو جیسے آپ کو نظر ہی نہیں آتی آخر کیوں؟“ ہینڈ بیگ غصے سے ہینڈ پر پھینکتے ہوئے وہ چلتی ہوئی ان کی قریب آئی۔

انہوں نے موبائل سے نگاہیں ہٹا کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ اورنج پیورسلک کی سازش اورنج پھولوں والے آف وائٹ سلیولیس بلاؤز میں ملبوس پرل کی جیولری اور بے حد مہارت سے کیے ہوئے میک اپ میں وہ ہوش اڑا دینے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔ بھی یہ حسن ان کو سحرزد کردیا کرتا تھا۔ ان کی نگاہوں کو جکڑ لیا کرتا تھا مگر اب ایسا کچھ نہیں ہوا تھا اور ان کی بیبی سے اعتنائی سارہ سے پرہیز نہیں ہو رہی تھی پھر وہ کافی دیر یونہی چنتی رہی تھی۔ انہوں نے پہلے تو اسے راضی کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کسی طرح جانے پر آمادہ نہ دیکھ کر خود چلے گئے تھے۔ پھر یہ سب جیسے اکثر و بیش تر ہی ہونے لگا تھا۔ سارہ کو شبہ تھا کہ شاید وہ کسی اور میں دلچسپی رکھتے ہیں لیکن کس میں؟ اچھی خاصی چھان بین کے باوجود کبھی اسے کوئی سراغ نہیں ملا لیکن اس کا شک و شبہ نہیں ہوا تھا اور ہوتا بھی کیسے۔ وہ جو ہر آن

ہر گھڑی اس کے ارد گرد ہار کرتے تھے پروانہ دار اس پر نثار ہوا کرتے تھے۔ اب جیسے وہاں ہوتے ہوئے بھی کہیں اور ہوتے تھے، لیکن کہاں؟ وہ یہی سوچ سوچ کر کڑھتی اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتی تھی۔

وہ موسم بہار کا ایک بے حد خوب صورت دن تھا لیکن باہر کے سارے موسم تو دل کے تابع ہوتے ہیں اور ان کے دل کا موسم تو جیسے ہمیشہ کے لیے خزاؤں کی زد میں آچکا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی و بے قراری ہمہ وقت دل و روح کا احاطہ کیے رہتی تھی۔ اس دن بھی وہ ایسی ہی کیفیت میں کب سے فائیس سامنے رکھے بے زاری سے بالوں میں انگلیاں الجھا کر خود کو کام میں مصروف کرنا چاہ رہے تھے مگر جانے کیا وجہ تھی کہ آج کام کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کافی دیر وہ یونہی بیٹھے رہے تھے بالآخر تنگ آ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ست روی سے گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جب ایک آدمی ان کی راہ میں آکھڑا ہوا۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا پھر حیران ہوا اٹھے تھے اس کے ہاتھ میں ایک سفید لفافہ اور آغوش میں چادر میں لپٹا ہوا ایک بچہ تھا۔ اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن لپٹنے کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ چند دنوں یا زیادہ سے زیادہ چند ہفتوں کا ہوگا۔ اس آدمی نے لفافہ ان کی طرف بڑھایا۔

”مہربانی کر کے آپ اسے پڑھ لیں۔“

لفافہ تھا جسے ہی ان کے دل میں جیسے بھونچال سا آ گیا تھا۔ اندر باہر گویا جتنی پکڑی گئی تھی۔

”فضا..... فضا..... فضا.....!“

تیزی سے لفافہ کھولتے ہوئے انتہائی بے چینی و بے قراری سے انہوں نے کاغذ سیدھا کیا اور بے تابانہ سے اپنی نگاہیں لفظوں پر دوڑانے لگے۔

”دل و جان سے عزیز شاہجی!“

ہمیشہ خوش رہیں۔ مسکراتے رہیں۔

جس وقت آپ کو میرا یہ خط ملے گا میں ایک نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو چکی ہوں گی۔ کچھ لوگوں کے مقدر میں یوں سفر لکھ دیا جاتا ہے کہ پھر ایک جگہ ٹھکانا ممکن ہی نہیں رہتا۔ میرا بے شک کوئی گھر نہیں، کوئی در نہیں، کوئی آسرا کوئی سہارا نہیں، کوئی ٹکلی کوئی ساتھی نہیں، لیکن پھر بھی آج میں خوش ہوں بے حد خوش۔ یہ تحفہ جو میں آپ کو دے رہی ہوں اس سے انمول میرے پاس کوئی شے نہیں۔ اگر ہوئی تو وہ بھی آپ کی نذر کرو جیتی۔ گزشتہ سال عید پر ایک یتیم خانے کے بچوں میں کپڑے اور جوتے تقسیم کرتے ہوئے آپ کی اور سارہ جی کی تصویر اخبار میں چھپی تھی اور اس تصویر کو تراش کر اپنے بچکے کے نیچے رکھتے ہوئے میں نے دل کی گہرائیوں سے دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اولاد کی نعمت عطا فرمائے۔ اس وقت میں نہیں جانتی تھی کہ اللہ میری دعا یوں سنے گا کہ اب کی زندگی کی یہ کی دور کرنے کے لیے مجھنا چیز ہے شاہجی! شاید آپ کبھی نہ جان سکیں لیکن میں نے آپ کو کتنا چاہا ہے کتنا سوچا ہے اس کا ثبوت اس تحفے و جود کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ اس کی آنکھیں اس کی ناک اس کے لب سب لچکھا آپ سے مشابہہ ہے یا پھر مجھے ہی ہر سو آپ ہی آپ نظر آتے ہیں۔

ہر دم ہر گھڑی آپ کی خوشیوں کے لیے دعا گو!

”فضا“

”صاحب جی! یہ آپ کی امانت.....“ آخری لفظوں پر نگاہ جمائے وہ گم گم سے کھڑے تھے جب ان الفاظ نے انہیں چونکا دیا۔ وہ چادر میں لپٹا نکھاسا



وجود ان کی طرف بڑھائے کھڑا تھا۔ بے اختیار ان کے بازو آگے بڑھے اور انہوں نے اسے تھام لیا تھا۔ دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے اور دل میں جیسے تلاطم سا رہا تھا۔

”فضا کہاں گئی ہے بابا جی! آپ کو تو کچھ پتا ہوگا؟“ دل نے خوش فہمی کی ردا اور ہتے ہوئے یہ پوچھنے پر مجبور کیا تھا۔ انہوں نے حقائق سے نگاہ چراتے ہوئے بڑی امید سے ان کی جانب دیکھا تھا۔

”نہیں..... آج صبح کچھ بھی بتائے بغیر چلی گئی۔“ کہاں گئی ہوگی وہ.....؟“ بمشکل ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

”پتا نہیں.....!“

”سنیں بابا جی!“ انہیں جاتا دیکھ کر وہ جلدی سے آگے بڑھے۔ ”آپ کی فضا سے کیا رشتہ دار ہے؟“

”وہ میری چچا زاد بہن کی پوتی ہے۔“

”تو آپ کو یہ اندازہ تو ہوگا کہ وہ کہاں گئی ہوگی؟“

”نہیں میں نے پوچھا تھا لیکن اس نے ٹال دیا۔ شاید اس لیے کہ وہ آپ کو بے خبر رکھنا چاہتی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اسی شہر میں ہے کیونکہ ایک بیگم صاحبہ اس سے کپڑے سلوانے آئی تھیں انہوں نے کہا تھا کہ ان کی بہن کے پاس جگہ ہے وہ وہاں رہ جائے اور ان کی بیٹیوں کے کپڑے ہی دیا کرے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔ اس نے کہا تھا اور خدا حافظ کہتے ہوئے چلا گیا۔ وہ شکستہ اور نڈھال سے بمشکل اپنی ٹانگیں کھینچتے گاڑی میں آ بیٹھے تھے۔

”وہ کہاں گئی ہوگی اور اتنے بڑے شہر میں وہ کیسے اسے ڈھونڈ سکتے تھے۔“ بے حد مضطرب سے وہ سوچ رہے تھے اور جی ان کی بانہوں میں سٹے وجود میں

حرکت ہوئی اور پھر رونے کی آواز پر انہوں نے ہر جذبے سے خالی اداس آنکھوں سے اس صورت کو دیکھا تھا اور ان کی نگاہ اس کے نقوش پر جم کر رہ گئی تھی۔ ان کے سامنے جیسے ان کی اپنی تصویر تھی۔ وہی آنکھیں وہی پیشانی وہی ناک وہی لب۔

”یقیناً یا میری چاہت کا.....؟“ جیسے قریب ہی کہیں سے سرگوشی ابھری اور وہ بالوں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگے تھے۔ وہ ہوتی تو وہ اسے بتاتے کہ یقیناً تو انہیں پہلے بھی تھا لیکن وہ نہیں تھی اور جانے کہاں ٹھوکریں کھا رہی تھی۔ تنہا اور بے سہارا..... یہ خیال کس قدر تکلیف دہ تھا۔ غم ہوتی آنکھوں کے ساتھ انہوں نے اس ننھے وجود کو سینے سے لگا کر بھینپا اور وہ حیرت انگیز طور پر فوراً خاموش ہو کر ٹکر ٹکر انہیں دیکھنے لگا تھا۔ انہوں نے آنکھوں سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا اور دل میں جیسے محبتوں کے سوتے اٹھتے محسوس ہوئے تھے۔ اس کے وجود سے آشتی مانوس سی مہک نے انہیں جیسے پاگل کر دیا تھا۔ وہ دیوانہ وار اس کے رونے کے گالوں جیسے رخساروں پر پیار کرتے چلے گئے تھے۔

پھر انہیں یہ ننھا سا گل گوشتنا سا وجود جس کے اک ایک نقش میں ان کی شاہت جھلکتی تھی سارہ شاہ کے حوالے کرنے کے لیے کیسے کیسے جتن کرنے پڑے تھے یہ وہی جانتے تھے۔ انہوں نے سوائے اس حقیقت کے کہ فضا ان کے لیے کیا حیثیت رکھتی تھی سب کچھ نے تلے انداز میں بتا دیا تھا۔ اس کے بعد ان کی تلاش میں کچھ اور شدت آگئی تھی۔ کہاں کہاں نہیں کھو جاتا تھا انہوں نے اسے سالوں گزر گئے تھے لیکن وہ مایوس نہیں ہوئے تھے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا لیکن وہ جتنے ضرور لگے تھے اور اب جب وہ اچانک انہیں مل گئی تھی تو وہ اسے کسی اصول

اور نیا بخرانے کی مانند بڑی حفاظت کے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔ اس کی ساری محبتوں اور عنایتوں کا قرض چکانا چاہتے تھے۔ مدتوں سے پیاسے من کو سیراب کرنا چاہتے تھے۔

☆.....☆.....☆

انہوں نے آنکھوں سے اس کی لمبی پلکوں والی غلائی آنکھوں کو چھوا تھا اور اس نے کسماتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو انہوں نے یکدم اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

”فضا! تم کہاں چلی گئی تھیں؟ میں نے بہت ڈھونڈا تمہیں بالوں کی طرح ہر طرف سمجھیں کھوجنا پھر بالوں میں بازاروں میں سڑکوں پر تم کہاں چھپ گئی تھیں؟“ وہ والہانہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے انتہائی بے چینی و بے قراری سے کہہ رہے تھے اور وہ لرزرتے ہونٹوں اور ہتھیلی آنکھوں کے ساتھ انہیں سن رہی تھی۔ ”فضا! کیوں کیا تم نے ایسا؟“

”آ..... آپ..... کے لیے..... آپ کی خوشی کے لیے.....“ ان کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے وہ آنکھوں سے بولی۔

”میری خوشی.....؟“ انہیں جیسے اس کی نادانی اور کم فہمی پر تلافی ہو اور وہ بے چینی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”آپ سارہ باجی کے ساتھ بے حد خوش تھے اور میں آپ کی ازادگی زندگی کو درہم برہم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے کہاں خبر تھی کہ آپ مجھے یاد کر رہے ہیں میری کی محسوس کر رہے ہیں۔“

”کیوں نہیں آیا تمہیں یہ خیال جب کہ محبت میں تو دل کو دل سے راہ ہوتی ہے؟“ انہوں نے جیسے شکوہ کیا۔

”کیا میں اتنی خوش نصیب ہو سکتی ہوں شاہ جی!“

وہ بے چینی سے انہیں دیکھتی جیسے کشکش میں تھی۔

”تمہیں ابھی بھی یقین نہیں فضا؟“ انہیں جیسے سخت رنج ہوا۔

”اپنی کم مائیگی کا احساس یقین کی دیوار بننے لگتا ہے شاہ جی!“

”محبت جن کے لیے یوں اپنا دامن وا کر دے وہ کبھی بے مایہ ہو سکتے ہیں؟“ انہوں نے بے حد چاہت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور وہ بے اختیار روتے ہوئے ان کے ساتھ لیٹ گئی۔

انہوں نے بڑی محبت کے ساتھ اسے سینے سے بھینچ لیا اور دھیرے دھیرے اسے اپنی محبت کا یقین دلارہے تھے۔ بیٹے دنوں کی داستان دہرا رہے تھے اور وہ ان کی محبتوں کی چھوہار میں بھٹکتی مدہوش ہوئی جا رہی تھی۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ بزرگوں کی دعائیں بھی رازِ گاہاں نہیں جانتیں۔ دادی جو اٹھتے بٹھتے اسے دعائیں دیا کرتی تھیں۔ اس کے مقدر کے ٹھنکے کے لیے لیے بے وفائے کیا کرتی تھیں۔ وہ سب دعائیں بار بار دہرا رہی تھیں۔

”کاش دادی بھی زندہ ہوتیں اور یہ سب دیکھتیں.....“ اس نے بے اختیار سوچا اور لہجہ بھر کے لیے بڑی طرح اداس ہو گئی لیکن مراد شاہ نے اسے زیادہ دیر اداس نہیں ہونے دیا۔

”دیکھا میرا پاگل پن..... تمہیں بخار ہے اور پتا نہیں کب سے تم نے کچھ کھایا نہیں اور میں ہوں کہ.....“

”مجھے تو بس آپ کی محبت چاہیے شاہ جی! میں میرا ہوجاؤں گی۔“

”جناب! میں خود اور میرا سب کچھ آپ کا ہے۔ تنگ پڑ جائیں گی آپ۔“

”تنگ پڑنے سے پہلے میں مر نہ جاؤں شاہ جی!“

”بہشت..... خوف ناک باتیں نہیں اچھا اب تم اٹھو اور فریش ہو جاؤ پھر کھانا کھاتے ہیں۔“ وہ بیڈ پر سے اترتی ہوئی ٹھٹک کر گئی اور سحر زدہ سی چاروں طرف دیکھنے لگی تھی۔ اس نے کہاں دیکھا تھا یہ سب کچھ..... حقیقت تو دور کی بات تھی اس کے تو خواب میں بھی کبھی ان چیزوں کا گزر نہیں ہوا تھا۔ دیواروں کے رنگ پر دے بیڈ ڈرینگ ٹیبل صوفہ ویئر قالین جس میں پاؤں دھنس رہے تھے۔ ہر چیز ایک دوسرے سے مکمل ہم آہنگ اور خوب صورتی اور دلکشی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھی۔ وہ جیسے بہشتی کھڑی تھی۔

”کیا دیکھ رہی ہو فضا!“ انہوں نے بے حد نرمی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

وہ بڑی طرح چونکی تھی اور پھر خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ انہیں کیا جواب دے۔

”اچھی آرائش اور امتزاج ہے نا!“ انہوں نے ملکہ پھلکے لہجے میں پوچھا تو وہ بمشکل اثبات میں سر ہلاتی۔

”سارہ کو ہمیشہ زبردست چیز ہی پسند آتی ہے۔ بے حد اعلیٰ ذوق ہے اس کا۔“ وہ کہہ رہے تھے اور وہ خالی خالی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

پھر اچانک اس کی نگاہ اپنے کپڑوں پر پڑی۔ سستی لان کا گلابی پرنٹڈ سوٹ پہنے جو دل وصل کر اپنی اصلی رنگت کھوپکا تھا، اپنے منگے سے حلے میں اس چمکتے دسکتے بے حد راستہ کمرے میں کھڑی وہ یقیناً بے حد عجیب لگ رہی تھی۔ اس کے پہلے بڑتے چہرے نے جیسے مرادشاہ کو سب کچھ سمجھا دیا تھا انہوں نے بے حد نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما اور ہاتھ روم کی طرف لے گئے۔

”صرف چندرہ منٹ ہیں تمہارے پاس۔“ ٹھیک سوہویں منٹ تمہیں میری نگاہوں کے سامنے ہونا چاہیے۔ پہلے ہی انہیں بہت ترسایا ہے تم نے۔“ انہوں نے اس کے لیے داش روم کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”فضا! ایک منٹ پلیز۔“ اس کے دروازہ بند کرتے ہی اچانک کچھ یاد آنے پر وہ تیزی سے نکارے تھے۔ فضا نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی مگر وہ نہیں کھلا تھا۔ وہ پریشانی سے بار بار ہینڈل کو گھما رہی تھی مگر دروازہ اس سے کس نہیں ہو رہا تھا۔

”فضا! دروازہ لاک ہو گیا ہے۔ ایک منٹ رکو میں چابی دیکھتا ہوں۔“ انہوں نے کہا تھا پھر ڈرینگ ٹیبل کے دروازے اور ادھر ادھر سب طرف دیکھ لیا تھا مگر چابی کہیں نظر نہیں آئی۔ ”فضا! غور سے میری بات سنو۔“ وہ باہر سے اسے تالا کھولنے کا طریقہ سمجھا رہے تھے اور اندر مارے شرمندگی اور ندامت کے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین چھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ اپنا آپ اسے انتہائی بے مایہ اور حقیر لگ رہا تھا۔ ایک دروازہ تک تو اسے کھولنا نہیں آتا تو کیا وہ اس انتہائی خوب صورت اور شان دار گھر میں رہنے کے قابل تھی۔

”نہیں..... ہرگز نہیں“ اس نے ہمیشہ حقیقت پسندی سے سوچا تھا اور یہ حقیقت بے حد درد اور روح فرسائی لیکن کبھی تو حقیقت کہ اپنی تمام تر محنتوں اور شدتوں کے باوجود وہ اس قابل نہیں تھی کہ مرادشاہ جیسے وجہہ و تکیل اور بڑے لکھے شخص کی بیوی کہلا سکتی۔ اس خوب صورت گھر میں رہ سکتی۔

”فضا..... فضا! کیا ہوا۔ تم دروازہ کھول نہیں رہیں؟“ اندر سے کسی قسم کی آواز نہ پا کر مرادشاہ نے بے یقینی سے پکارا..... اور وہ اندر کیا کر رہی تھی اوروازہ

”فضا..... فضا!.....! انہوں نے پھر اسے پکارا تھا اور جواب میں اس کی بھرائی ہوئی ”جی“ سن کر اچانک ہی انہیں سارہ سے چابی کے بارے میں پوچھنے کا خیال آیا تھا۔

جس وقت انہوں نے دروازہ کھولا اسے ان کی جانب دیکھا نہیں گیا تھا۔ ندامت اور شرمندگی کی اک گہری دلدل تھی جس میں وہ خود کو دھنسا محسوس کر رہی تھی۔

”دراصل یہ ہینڈل میں کچھ پرالیم ہے جلدی کھلتا نہیں ہے۔“ اس کے آترے آترے نام سے چہرے کو بڑبوج نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ تھوڑی سی غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اسے اس کیفیت سے نکالنے کی سعی کر رہے تھے۔ فضا نے ایک نظر انہیں دیکھا تھا پھر نگاہیں جھکالی تھیں۔

”میں اب چلوں گی شاہ جی! بس ایک دفعہ امان کو مجھے دکھادیں۔ وہ اتنے دنوں سے کہاں ہے باہر نظر کیوں نہیں آتا؟“ وہ دھیسے سے لہجے میں کہہ رہی تھی اور وہ حیرانی سے اسے دکھ رہے تھے۔

”تم کہاں جاؤ گی؟“ حیرانی سے انہوں نے پوچھا۔

”گھر.....“

”گھر تو وہ ہوتا ہے فضا! جہاں والدین اور بہن بھائی ہوں یا پھر شوہر اور بچے۔“ وہ جانے کس رو میں کہہ تو گئے تھے لیکن پھر فوراً ہی احساس ہوا تھا کہ یوں نہیں کہنا چاہیے تھا تب وہ جلدی سے سنبھلا۔ ”تمہارا گھر یہ ہے جہاں میں ہوں تمہارا بچہ ہے۔“ اس نے ڈبڈبی نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا پھر ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے بے حد تشکرانہ انداز میں گال کے ساتھ گالیاں اور کئی لمحے خاموشی کے ساتھ دبے پاؤں

”میں خود کو اس قابل نہیں پاتی شاہ جی! بس اتنی مہربانی کریں کہ کبھی کبھی مجھ سے ملنے آ جایا کریں اور امان کو بھی لے آیا کریں۔“ شدت ضبط سے نکلا اب دانتوں تلے دباتے ہوئے اس نے رک رک کر کہا۔

”میرا خیال یہ ہے کہ انسان نہیں جانتا کہ وہ کس قابل ہے اس کے مقام کا تعین دوسرے کرتے ہیں اور تم نے اب تک بہت سمن مانی کر لی اب تم وہی کرو گی جو میں چاہوں گا۔“ ان کے بڑے رعب سے کہنے پر فضا نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ ”کرو گی نا.....؟“ اس کے کندھے پر بازو رکھتے ہوئے انہوں نے دھیمی سی آواز اور جذبول سے گندھے لہجے میں پوچھا تو فضا کا دل بے تحاشہ ہڑکے لگا تھا۔ وہ اس قدر خوش نصیب بھی ہو سکتی ہے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

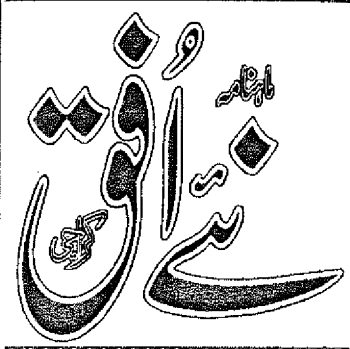
”فی الحال تمہیں سارہ کے کپڑوں پر گزرا کرنا ہوگا۔ شام کو ہم شاپنگ کے لیے چلیں گے۔“ انہوں نے الماری کھولتے ہوئے کہا۔

”اور سارہ جی؟ کیا وہ میرا وجود اس حیثیت سے برداشت کر لیں گی؟“

”کرنا پڑے گا لیکن فی الحال تو وہ اپنے بھائیوں کے پاس امریکہ گئی ہوئی ہے۔ بس تم ساری فکریں چھوڑ کر یہ دیکھو کہ میں کیا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے بے اختیار ان کا ہاتھ تھام لیا۔

پوری الماری رنگا رنگ ملبوسات سے بھری ہوئی تھی۔ اتنا ڈھیر ادھر تھا تو جانے وہ اپنے ساتھ کیا لے کر گئی تھیں۔ اس نے حیرانی سے سوچا اور بھلا وہ ان میں سے کیا پہنے۔ بغیر بازو کی قمیص اور گہرے گلے دیکھ کر اسے پسینا آ رہا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ یہ ٹھیک رہے گا۔“ آسانی



بھی سارہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے نہیں گیا۔  
ہیشہ وہ اپنی شاپنگ خود ہی کرتی رہی ہے۔ اس لیے  
خواتین کی شاپنگ کے معاملے میں بالکل انارڈی  
ہوں لیکن خیر آج یہ تجربہ بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے  
گاڑی پارک کرتے ہوئے بلکہ پچھلے لہجے میں کہا۔  
”یہ یہاں کا مشہور اور بڑا اسٹور ہے۔ یہاں سے  
لیڈر، جینٹلس، چلڈرن گارمنٹس، کاسٹیکس، جیولری  
بیکرز جوتے، سویٹرز، شاور اور تقریباً سب کچھ مل جاتا  
ہے اور ہر چیز بہترین ہوتی ہے۔“ وہ اس کے ساتھ  
چلتے ہوئے بتا رہے تھے۔

پھر جس وقت شاپنگ کے بعد واپسی کے لیے  
گاڑی میں بیٹھ رہے تھے کہ ان کے سل کی بپ بجی۔  
”جی زاہد صاحب!“ انہوں نے اسکرین پر نگاہ  
ڈالتے ہی فوراً فون اٹینڈ کیا تھا۔ ”بہت عمدہ یہ تو  
زبردست خبر سنائی ہے آپ نے اچھا بتائیے ہم  
ابھی دیکھ لیتے ہیں۔“ انہوں نے خوش گوار لہجے میں  
سل آف کر کے اس سے کہا۔

”بوجھو فضا! ہم کہاں جا رہے ہیں؟“  
”وہ..... آپ کھر کا بتا رہے تھے نا! تو شاید  
وہیں.....؟“

”ہوں..... میری فضا ہے تو ذہن.....“ انہوں  
نے ”میری“ پر زور دیتے ہوئے کہا تو وہ نم ہونی  
آ نکھوں کے ساتھ مسکرا دی۔

مرادشاہ سے اس کی آنکھوں کی نمی چھپی نہیں رہ  
سکی تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ چند لمحے خاموشی سے  
ذرا سوچ کر کہتے رہے تھے پھر آہستگی سے اسے  
مخاطب کیا۔

”فضا! تم میری بیوی ہو میرے بچے کی ماں ہو  
میں نے تمہیں صرف قبول ہی نہیں کیا بلکہ تم سے محبت  
بھی کرتا ہوں۔ اسی طرح تمہیں سب کے سامنے

گئی تھی۔  
آدھی آستین اور جدید تراش خراش کے میلوں میں  
اسے ویسے ہی بے حد جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ اس  
نے کہاں پہنچے تھے اسے فیشن والے کیڑے۔ وہ خود کو  
خاصی بے اطمینان محسوس کر رہی تھی۔ جب وہ  
مارکیٹ جانے لگی وہ گھبرائی ہوئی سی بار بار مرادشاہ کی  
جانب دیکھ رہی تھی۔  
”کیا بات ہے فضا! تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟“ کچھ  
دیر تو وہ خاموشی سے اسے دیکھتے رہے پھر آہستگی سے  
اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

”وہ دراصل..... میں بھی مارکیٹ نہیں گئی اور پھر  
اس طرح..... میرا مطلب ہے اس طرح کے لباس  
میں باہر جاتے ہوئے ہمیشہ میں منہ پر چادر لیتی رہی  
ہوں لیکن.....“ رک رک کر کہتے ہوئے وہ یک دم  
خاموش ہو گئی۔

”لیکن.....؟“ کچھ لمحے اس کے بولنے کا انتظار  
کرنے کے بعد مرادشاہ نے ڈھرایا۔

”وہ چادر کافی پرانی ہے اور پھر آپ کے  
ساتھ..... اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کیسے وہ  
انہیں اپنا وقت سمجھائے۔

”تم ایسا کرو اسی دوپٹے کو چادر کی طرح اوڑھ  
لو۔ خاصا بڑا ہے یہ۔ مارکیٹ سے ہم اسکا ف خرید  
لیں گے۔“ انہوں نے کہا تھا اور وہ جیسے خوشی سے  
کھل اٹھی۔

”آپ..... آپ بہت اچھے ہیں شاہ جی!“ ان  
کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں کی گرم جوش گرفت  
میں لپیٹے ہوئے اس نے بے حد عقیدت اور محبت  
سے انہیں دیکھا اور پھر ان کی محبت پاش لگا ہوں سے  
گھبرا کر سرخ ہوتے ہوئے سر جھکا لیا۔

”شادی کے شرو ع کے کچھ عرصے کے بعد میں

رنگ کی لان کی کڑھالی والی میس اور بڑے سے  
دوپٹے والا سوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے  
مرادشاہ نے اس کی مشکل آسان کرنی چاہی تھی۔ فضا  
نے ایک لمحے کے لیے انہیں دیکھا تھا پھر ان کے  
ہاتھ میں تھامے ہوئے پلوں کو..... اس کی سمجھ میں  
نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کہنا چاہیے کیا کرنا چاہیے  
لیکن پھر جیسے دل نے خود ہی فیصلہ دے دیا تھا۔ اسے  
وہی کرنا تھا جو مرادشاہ کہہ رہے تھے۔ اس نے ان  
کے ہاتھ سے ہٹ کر لیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی  
ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

جب وہ ہاتھ لے کر آئی تو وہ فون پر کئی اہم  
معاملات بننا چکے تھے۔ جن میں سرفہرست محل تک  
ایک سچے سچے گھر کا انتظام کرنا تھا اور فضا کی  
شخصیت نکھارنے کے لیے کسی تجربہ کار خاتون کا  
انتظام کرنا بھی وہ چاہتے تھے کہ جب وہ سارہ کے  
سامنے آئے تو مکمل اعتماد کے ساتھ اور اس کے لیے  
اسے مکمل تربیت کی ضرورت تھی جو کہ یہاں مناسب  
نہیں تھی۔ ملازم ایک ایک بات نوٹ کر کے سارہ کو  
بتا سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ایک ماہ کے لیے  
علحدہ گھر لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ جب یہ ساری تفصیل  
انہوں نے فضا کو بتائی تو چند لمحوں کے لیے وہ انہیں  
دیکھتی رہ گئی۔ پھر یک دم اس کی آنکھیں جھلجھلائی اور  
اگلے ہی لمحے باقاعدہ آسو بونے لگے تھے۔  
”یہ کیا فضا.....؟“ وہ بُری طرح بے

چمیں ہوئے۔  
”یہ خوشی کے آسو ہیں شاہ جی!“ بھرائی ہوئی آواز  
میں کہتے ہوئے وہ مسکرائی تو مرادشاہ کو بہتی آنکھوں  
اور مسکراتے لبوں کا یہ نظارہ اس قدر سحر انگیز لگا کہ چند  
لمحوں کے لیے وہ مبہوت سے اسے دیکھتے رہ گئے اور  
ان کی والہانہ نگاہوں پر وہ بُری طرح تجو ب ہو کر رہ



لارہجی لہڑا کر سکتا ہوں۔ لوگ کیا کہتے ہیں مجھے کسی کی پروا نہیں..... لیکن میری خواہش ہے کہ تم جب میری بیوی کی حیثیت سے سب کے سامنے آؤ تو لوگ تمہاری عزت کریں، تمہیں سارہ جتنی ہی اہمیت و عزت دیں اور خود تم اپنے آپ کو کسی طرح بھی سارہ سے کم نہ سمجھو اور تمہارا بیٹا نہیں دیکھے اور تم سے ملے تو اسے اپنی ماں سب سے اعلیٰ سب سے مفرد نظر آئے۔ مگر بار بار تم ہوتی تمہاری آنکھیں ظاہر کر رہی ہیں کہ تم شاید مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔“

”نہیں..... نہیں شاہ جی! ایسا نہیں ہے۔ میں آپ کے بارے میں ایسا کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔ میرا اللہ کتنا مہربان ہے! آنکھیں تو اس کی مہربانیوں پر ہم ہوتی ہیں اور کچھ دادی بار بار یاد آ رہی ہیں۔ یہ ان کی دی ہوئی دعا میں ہی ہیں جو آپ مجھے مل گئے۔ آپ کی محبت مل گئی۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں.....؟“

ان کے حلقے سے دیکھنے پر اس نے فوراً بات اٹھوری چھوڑ دی۔

”درحقیقت اپنے بزرگوں سے دعائیں لیتے ہی خوش نصیب لوگ ہیں فضا! اور جو لوگ بے لوث محبت لاتے ہیں نا محبت بھی بڑی فراخ دلی سے ان کے لیے اپنا دامن وا کر دیتی ہے اور چلیے جناب! یہ آ گیا آپ کا گھر.....“ انہوں نے ایک خوب صورت سے گھر کے دروازے پر گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ ان کے گاڑی روکتے ہی ایک آدمی دروازہ کھول کر تیزی سے آگے بڑھا تھا۔

”فضا! تم چلو گی یا گاڑی میں بیٹھو گی؟“

”جیسے آپ کہیں.....“ اس کے فرماں برداری سے کہنے پر وہ بے ساختہ مسکرائے۔

”ٹھیک ہے تم ابھی بیٹھو۔“ انہوں نے کہا تھا اور پلٹ کر اس آدمی سے ملے اور اس کے ساتھ اندر کی

جانب چل دیئے اور وہ بے حد محبت کے ساتھ اس وقت تک انہیں دیکھتی رہی جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئے تھے۔

اسے آج خود پر رشک آ رہا تھا۔ ساری کائنات بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ یہ سب کس قدر غیر متوقع اور انوکھا تھا۔ خواب میں تو اس نے خود کو ان کے سنگ چلنے ان کے ساتھ رہنے بہت باریک دیکھا تھا مگر حقیقت میں یہ سب کیسے ممکن ہو گیا تھا اور کہیں یہ سب خواب ہی تو نہیں تھا۔ جاگتی آنکھوں کا خواب پلک جھٹکتی اور ختم ہو جاتا..... خدا نہ کرے! اس نے بے اختیار جھرجھری سی لی اور اپنے اللہ کا شکر ادا کرنے لگی جس نے اسے اپنے من چاہے شخص کی سنگت اور محبت سے نوازا تھا۔ ورنہ وہ تو آسمان تھے اور وہ خود زمین آسمان اور زمین کا ملن کیونکر ممکن ہے لیکن بے شک وہ قدرت والا رب جس چیز کو چاہے ممکن بنا سکتا ہے۔

”فضا!“ سیٹ کی پشت گاہ سے سر نکائے۔ مہم سہی مسکراہٹ لبوں پر سجائے وہ خوش کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی جب ان کی دھیمی سی آواز اس کی سماعت سے کٹرائی اور اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

”کیا بات ہے سو گئی تھیں؟“

”نہیں تو.....“ وہ کھوئی کھوئی سی کیفیت میں انہیں دیکھتی ہوئی بولی۔

”فضا ڈیر! یہ تمہاری قسمت سے جو گھر کا فوراً انتظام ہو گیا ورنہ میرا خیال تھا کہ کم از کم دو چار دن تو ضرور لگیں گے۔ آؤ تم بھی دیکھ لو تاکہ پھر فاضل کر دیں۔“

”آپ اس بندے کو فارغ کریں پھر اسٹے اندر چلیں گے۔“ اس نے دھیمی سی آواز اور محجوب سے

انداز میں انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ محبت سے اسے دیکھتے والی پلٹ گئے۔

کچھ دیر کے بعد مراد شاہ کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے اس خوب صورت گھر میں داخل ہوتے ہوئے وہ خود کو باؤں میں اٹاٹا محسوس کر رہی تھی اور تہہ دل سے اپنے رب کا شکر ادا کر رہی تھی۔

”شاہ جی! اگر سارہ باجی نے مجھے قبول نہ کیا تو.....؟“ ان کے کندھے سے سر نکاتے ہوئے اس کے دل میں پچھل چاٹا خدشہ بے اختیار اس کے لبوں پر آ گیا۔

”آج ہم صرف اور صرف اپنی باتیں کریں گے۔ میری اور تمہاری اور کسی کی نہیں..... سچی!“

”اور امان کی؟“

”نہیں آج صرف میں اور تم..... ویسے بڑی عجیب بات ہے فضا! کہ مجھے کبھی پتا ہی نہیں چلا کہ میں اس قدر رو میٹک ہوں۔“ انہوں نے قدرے شوقی سے کہا تو اس نے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ ان ہی کی پشت پر چہرہ اچھالیا تھا۔ بھی باہر نکل ہوئی تھی اور وہ والٹ اٹھاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ لاؤنج میں داخل ہوئے تو ہاتھوں میں کئی شاہنگ بیگز اٹھائے ہوئے تھے۔ اس نے حیرانی سے انہیں دیکھا تھا۔

”آجے جناب! اپنا کچن بھی دیکھیے اور کھانا بھی نکال لے۔“ انہوں نے خوش دلی سے کہا تو وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہاتھ دھونے کے لیے اس نے سنگ کاٹل کھولتے ہوئے چور نظروں سے مراد شاہ کی طرف دیکھا جو شاہنگ بیگز میں سے کچھ نکال کر پلٹ میں ڈال رہے تھے۔ پتا نہیں وہ کیا تھا اور اس کا نام کیا تھا۔ وہ ہر چیز کو دیکھ کر حیران ہو رہی تھی اور اس کی حیرت بجا

تھی۔ وہ دادی کے ساتھ جس گھر میں شروع میں رہتی تھی وہاں کچن میں ایک طرف اینٹوں کا چولہا بنا ہوا تھا۔ جہاں لوگ لکڑیاں جلاتے تھے اور جسے ہر روز وہ مٹی کا ہاتھ بھیر کر صاف کر دیا کرتی تھی۔ اس کے بعد وہ جس محلے میں گئے وہاں برآمدے میں ایک طرف گیس کا چولہا رکھا ہوا تھا اور ساتھ سمیٹ سے بنی ایک سیلپ تھی۔ اسے مالک مکان وہ اور دادی باورچی خانہ کہتے تھے باہر محلے میں خالہ سیکڑ کے گھر میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جہاں سوئی گیس کے دو چولے اور ایک چھوٹی سی لکڑی کی الماری تھی۔ جہاں برتن وغیرہ رکھے ہوئے تھے اور اوپر سینٹ سے الماری نما جگہ بنی ہوئی تھی جہاں اوپر والے خانے میں ریت صابن سے چمکانی گئی دیکچیاں ہوتیں اور نچلے میں نمک مریچوں والے ڈبے۔ ان کا کچن اسے بڑا اچھا لگتا تھا مگر ایسا چمکتا دمکتا اور سجا سجا ہوا کچن کہاں دیکھا تھا اس نے۔ اسے تو ان چیزوں کے نام بھی نہیں آتے تھے جو یہاں تھیں استعمال کا طریقہ تو دور کی بات۔

عجیب اک احساس کمتری نے اسے آگھیرا تھا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے سر جھٹک کر اپنا دھیان مراد شاہ کی طرف مبذول کر دیا تھا۔ وہ دھیمی سی مسکراہٹ لبوں پر لیے جلدی جلدی ہاتھ چلا رہے تھے اور وہ بغور انہیں دیکھتے ہوئے غور کر رہی تھی کہ وہ کیا کیا چیز کس برتن میں ڈال رہے تھے کھانے کے بعد جب وہ برتن دھونے لگی تو انہوں نے اسے روک دیا تھا۔

”صبح سب کاموں کے لیے ملازم آ جائے گی۔ تم اب نماز پڑھ لو۔“ انہیں یاد تھا کہ وہ اسپتال میں پابندی سے نماز پڑھا کرتی تھی۔ وہ ہاتھ روم میں جانے لگی تو وہ جلدی سے اس کے برابر آ گئے تھے اس

نے حیرانی سے دیکھا تھا۔

”میں ذرا ہاتھ دھو لوں۔“ کہتے ہوئے وہ ہاتھ روم میں داخل ہو گئے تھے ابھی ابھی تو انہوں نے پنجن میں ہاتھ دھوئے تھے۔ فضا نے کچھ الجھ کر انہیں دیکھا تھا۔ ”فضا یار! لاؤ کچھ میں شاپنگ بیگ پڑا ہے وہ جو ابھی ابھی بچہ دے کر گیا ہے اس میں صابن ہوگا۔“ انہوں نے کہا تو وہ حیران بھی کتا خرپے سب چیزیں کیسے آ رہی تھیں اور صابن کھول کر انہیں پکڑاتے ہوئے آ خراس نے پوچھ ہی لیا۔

”زائد صاحب سے فون نمبر لے کر میں نے شاپ پر فون کیا تھا اور ضروری سامان لکھوایا تھا۔ یہ لوگ ہوم سروس بھی دیتے ہیں۔“ انہوں نے ہاتھ دھوتے ہوئے بتایا تھا۔ ”فضا! واش روم کی کھڑکی کھلی ہوئی ہے نا! اچھا دیکھو کھڑکی میں پانی یوں گرا رہا ہے۔“ نے پردے انداز میں انہوں نے بتایا تھا اور وہ سمجھ گئی تھی کہ پنجن میں ہاتھ دھونے کے بعد وہ دوبارہ ہاتھ دھونے کس لیے آئے تھے۔ اپنی طرف سے وہ اسے شرمندگی سے بچانا چاہ رہے تھے۔ اسے اس لمحے وہ بے انتہا اچھے لگے تھے۔

نماز پڑھتے ہوئے اسے اپنے اللہ پر بے انتہا پیار آ رہا تھا۔ جس نے اسے یوں نوازا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ خوب سارے شکرانے کے نوافل ادا کرے مگر اسے علم تھا کہ مراد شاہ اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس لیے دو نفل ادا کرتے ہوئے اس نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا اور باقی نوافل صبح پڑھنے کا ارادہ کرتے ہوئے مراد شاہ کی طرف بڑھی۔ وہ فون پر بات کر رہے تھے۔ اس نے پیچھے سے جا کر آہٹنگی سے تھوڑی ان کے سر پر کا دی تھی۔

”ساگر مبارک ہو شاہ جی! اس بہت ہی اہم اور خوب صورت دن پر دینے کے لیے میرے پاس

سوائے دعاؤں کے اور کچھ بھی نہیں۔ لیکن ایک چیز اور ہے اگر آپ کو پسند آئے تو؟“ اک انداز دلبرانہ محبت اور جاہت سے لبریز مذہم سا کول سا لہجہ مراد شاہ کو ایسے غسوس ہوا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہے ہوں۔ بے حد سہانا خواب بے حد دیرینہ خواب۔

بہن بھائیوں میں وہ سب سے چھوٹے تھے۔ والد پنچپن میں وفات پا گئے تھے۔ شوہر کی وفات کے بعد اماں بی تمام تر محبت کے باوجود انہیں وہ محبت اور توجہ نہیں دے پاتی تھیں جس کی انہیں طلب تھی لیکن وہ بھی کیا کرتیں۔ زمینوں کا حساب کتاب گھر کی دیکھ بھال میکے اور سسرال کی خوشی غمی اور پھر بچوں کی شادیوں کے سلسلے۔ وہ یوں مصروف رہی تھیں کہ مراد شاہ پر زیادہ توجہ دینے کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔ گواہی ضروریات کے لیے انہیں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ گھر میں ملازموں کے علاوہ دو بڑی بہنیں بھی موجود تھیں پھر اماں بی ایک اچھی نگران تھیں۔ گھر کا نظام احسن طریقے سے چل رہا تھا۔ لیکن بھرپور توجہ اور محبت کی طلب جو ایک بار مراد شاہ کے دل میں پیدا ہوئی تو وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتی ہی چلی گئی تھی اور زندگی کی مصروفیات نے والدین اور بڑے بہن بھائیوں کو یوں الجھایا ہوا تھا کہ کسی کو ان پر توجہ دینے کی فرصت بھی نہ ان کے وجود میں روز بروز بڑھتے اس خلا کی خبر۔

میسٹرک کے بعد انہوں نے ہاسٹل جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو جمال بھائی اور اماں بی نے ان کی خواہش اور آسانی کی خاطر یہ بات بخوشی مان لی تھی کہ کانچ گاؤں سے بہت فاصلے پر تھا لیکن مراد شاہ کے دل میں یہ بات پختہ ہو گئی تھی کہ کسی کو ان کی ذات میں دلچسپی نہ ان کی ضرورت۔ یوں آہستہ آہستہ وہ سب سے دور ہوتے چلے گئے۔

پھر بڑے شوق اور امانوں کے ساتھ سارا سے شادی کرتے ہوئے ان کا خیال تھا کہ اب زندگی کی ہر کی اور محرومیاں دور ہو جائیں گی۔ کتنے خواب بنے تھے انہوں نے، مگر سب ایک ایک کر کے بکھر گئے تھے۔ دل میں وہی تنگی تھی وہی تنہائی تھی انہوں نے جسے چاہا تھا پایا تھا مگر پانے کے بعد پتا چلا تھا کہ طلب کچھ اور تھی۔ عجیب المیہ تھا۔ بہت محبت کی تھی انہوں نے سارا شاہ سے اور بہت تر سے تھے خود محبت کے لیے لیکن پھر انہوں نے خود کو سمجھا لیا تھا۔ یہ سوچ کر صبر کر لیا تھا کہ شاید قسمت کی ستم ظریفی سے ان کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے جو عمر بھر منتظر ہی رہتے ہیں۔ محبت انہیں کبھی نہیں ملتی۔ بھری بہار میں بھی ان کے من پر خزاں ہی چھائی رہتی ہے ان کے دل کی کٹی کٹی کبھی نہیں ٹھنکتی ایسے میں اب کیسے وہ یہ مان لیتے کہ محبت کا یہ بے کراں سمندر ان کے لیے تھا؟ مراد شاہ کے لیے؟ انہوں نے آزدگی سے سوچا اور پھر ایک چبھکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر آٹھری۔

تلاش بسیار کے بعد بے حد انتظار کے بعد انہیں یہ لحاظ میسر آئے تھے اور ابھی کچھ دیر قبل تک وہ اس قدر خوش تھے کہ ان لحاظ کو اپنی کسی تکلیف دہ سوچ یا خیال کی نذر کرنے کا گمان بھی نہیں کر سکتے تھے مگر کبھی انسان وہی کچھ کر جاتا ہے جس کا گمان بھی اسے نہیں ہوتا۔ ویسے بھی اس بات کو جتنا بھی جھٹلایا جائے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان جو نئی دنیاؤں کی تلاش میں رہتا ہے بڑی بڑی فتوحات حاصل کر لیتا ہے مگر کبھی کبھی اپنی ہی سوچیں اسے پس کر دیتی ہیں اور یوں کہ اسے خبر تک نہیں ہوتی۔ وہ نہ جانتے ہوئے بھی کسی ایسے تنکے کی مانند جسے پانی کی لہریں اپنی مرضی سے بہائے لیے جا رہی ہوں۔ خیالات کے دھارے پر بہتا ہوا کہیں سے کہیں جا نکلتا ہے۔ کچھ

ایسا ہی اس وقت مراد شاہ کے ساتھ ہوا تھا۔ دل و دماغ پر تسلط جھاتے ایک خیال نے بے یقینا وہ کسی سے بے انتہا محبت کرتی تھی اور وہ شخص شاید مراد شاہ کے ساتھ بے حد مشابہت رکھتا تھا زندگی کے کسی موڑ پر اس سے پیچھے گیا ہوگا اور ایسے میں جب وہ اسے نظر آئے تو وہ انہیں اس پیچھے جانے والی محبت کا نعم البدل سمجھ کر دیوانہ وار ان کی طرف بڑھی ہو اور ان کو پانے کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہو گئی تھی تو گویا یہاں بھی مراد شاہ تو کہیں بھی نہیں تھے۔ اک زخمی سی مسکراہٹ سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے انہوں نے سوچا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی دل کو مضطرب کرتا یہ خیال سوال بن کر ان کے لبوں پر آ گیا۔

”فضا! پلیز..... اب اس معے کو حل کر دو۔ بتا دو وہ وجہ جو ہمیں میری زندگی میں لائی ہے۔ وہ کون تھا اور کہاں گیا جو تمہاری جاہت تھا؟ جو مجھ سے اس حد تک مشابہت رکھتا تھا کہ تم مجھے بچانے کے لیے خون کا آخری قطرہ تک دینے کے لیے تیار تھیں جس کی خاطر تم.....؟“ فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے اذیت کے احساس سے مراد شاہ نے لب بھینچ لیے تھے فضا حیران و ششدر سی پوری آنکھیں کھولے انہیں دیکھ رہی تھی۔

(انشاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

بھگت



# محبت چاہنی ہے

سباس گل

وہ پیڑ جن پہ پرندوں کے گھر نہیں ہوتے  
دراز جتنے بھی ہوں، معتبر نہیں ہوتے  
میرے ساتھیوں کی پہچان ہے بس اتنی سی  
کہ ان کے دل میں نفرتوں کے گھر نہیں ہوتے

سمیرا مہدیہ ہونے کو آیا، زار یہ ابھی تک میکے میں ہے، تم اسے لے کیوں نہیں آتے؟“ سسلی آپا نے ٹی وی لائونج میں گم صم بیٹھے سمیرا کو دیکھتے ہوئے کہا وہ ریسوٹ کنٹرول ہاتھ میں لیے نیوز چینل دیکھتا ہوا اپنے آس پاس سے بے خبر تھا۔  
”خود ہی آجائے گی۔“ وہ بے زاری سے بولا۔  
”تمہارا ابھی جواب نہیں ہے، سمیرا! محبت کرنے والے شوہر کو تو بیوی کی ایک دن کی عدم موجودگی بھی کھلتی ہے۔ تمہیں اس کی کمی محسوس نہیں ہوتی؟“  
”جی ہاں ہوتی ہے کی محسوس لیکن محبت کرنے والے شوہر کو.....!“ سمیرا نے سیاٹ لہجے میں جواب دیا۔ نظریں فی وی اسکرین پر جمی تھیں۔  
”کیا مطلب ہے تمہارا تمہیں زار یہ سے محبت نہیں ہے کیا؟“  
”جی سمیرا، مختصر جواب آیا۔“  
”ارے تم نے تو زار یہ سے محبت کی شادی کی تھی۔“ والدین کی پسند کو ٹھکرا کر اس کو اپنا تھا۔ یہ نکاح کیا ہو گیا۔ وہ تمہارے دل سے ہی اتر گئی؟“ سسلی آپا کو  
”سمیرا! محبت کرنے والے شوہر کو تو بیوی کی ایک دن کی عدم موجودگی بھی کھلتی ہے۔ تمہیں اس کی کمی محسوس نہیں ہوتی؟“  
”جی ہاں ہوتی ہے کی محسوس لیکن محبت کرنے والے شوہر کو.....!“ سمیرا نے سیاٹ لہجے میں جواب دیا۔ نظریں فی وی اسکرین پر جمی تھیں۔  
”کیا مطلب ہے تمہارا تمہیں زار یہ سے محبت نہیں ہے کیا؟“  
”جی سمیرا، مختصر جواب آیا۔“  
”ارے تم نے تو زار یہ سے محبت کی شادی کی تھی۔“ والدین کی پسند کو ٹھکرا کر اس کو اپنا تھا۔ یہ نکاح کیا ہو گیا۔ وہ تمہارے دل سے ہی اتر گئی؟“ سسلی آپا کو  
”سمیرا! محبت کرنے والے شوہر کو تو بیوی کی ایک دن کی عدم موجودگی بھی کھلتی ہے۔ تمہیں اس کی کمی محسوس نہیں ہوتی؟“  
”جی ہاں ہوتی ہے کی محسوس لیکن محبت کرنے والے شوہر کو.....!“ سمیرا نے سیاٹ لہجے میں جواب دیا۔ نظریں فی وی اسکرین پر جمی تھیں۔  
”کیا مطلب ہے تمہارا تمہیں زار یہ سے محبت نہیں ہے کیا؟“  
”جی سمیرا، مختصر جواب آیا۔“  
”ارے تم نے تو زار یہ سے محبت کی شادی کی تھی۔“ والدین کی پسند کو ٹھکرا کر اس کو اپنا تھا۔ یہ نکاح کیا ہو گیا۔ وہ تمہارے دل سے ہی اتر گئی؟“ سسلی آپا کو

”آخر ہوا کیا ہے جو تم اس سے اس قدر بے نیاز اور

بے پروا ہوئے بیٹھے ہو؟“ سسلی آپا کی انہنوں اور پریشانی میں اضافہ ہوا۔

اور انہیں پریشانی ہوتی کیوں نہ۔ ان کا سب سے



چھوٹا اور لاڈلا بھائی تھا سیر۔“  
 ”چنانچہ، مجھے لگتا ہے جیسے میں اندر سے خالی سا ہو گیا ہوں۔ میرے جذبوں کی حرارت اور گرم جوشی ماند پڑ گئی ہے۔ کوئی لطیف احساس میرے دل میں کسماتا ہے۔ نہ گدگداتا ہے۔“  
 ”زندگی ٹھہری گئی ہے۔ ہر منظر بے رنگ لگنے لگا ہے۔ میرے اندر گہرا سناٹا سرایت کر گیا ہے۔ چپ سی لگ گئی ہے میرے جذبوں کو۔ خاموشی کا آسب میرے چاردون اور پھیل گیا ہے۔ سکوت سا طاری ہو گیا ہے روح کے اندر۔ موت کی سی خاموشی نے مجھے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ہے۔ جسم میں کہیں درد کی لہریں اٹھتی ہے۔ کوئی ٹیس اٹھتی ہے تو مجھے لگتا ہے کہ میں زندہ ہوں ورنہ تو مجھے اپنے زندہ ہونے کا بھی یقین اور احساس نہیں رہا۔“ سیر کا دکھ بھر اور زندگی سے بے زار لہجہ سہلی آپا کے ہوش اُڑا رہا تھا۔  
 ”یا اللہ! خیر، ایسا کیا ہو گیا؟“ سہلی آپا اللہ سے خیر مانگ رہی تھیں۔ پھر سیر کی مَر جھانی مَر جھانی کبھی کبھی سی صورت دیکھ کر کہنے لگیں۔  
 ”سیر! مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ میں تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلتی ہوں، چلو اٹھو۔“  
 ”مجھے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔“  
 ”مگر تمہیں کسی ماہر نفسیات کی ضرورت یقیناً ہے۔“  
 ”آپا! آپ کو لگتا ہے کہ میں پاگل ہو گیا ہوں؟“  
 سیر نے انہیں خائف نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”ماہر نفسیات کے پاس جیک اب کے لیے جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ پاگل ہیں۔ نفساتی مسائل تو آج کل ہر کسی کے ساتھ ہیں۔ آج کے اس ٹیشن اور ٹھنڈے زدہ ماحول کے سبب، غیر محفوظ

حالات، غربت، بے روزگاری جیسے حالات میں ہر کوئی کسی نہ کسی نفسیاتی مسئلے کا شکار ہے۔“ سہلی آپا نے اسے قائل کرنے کے لیے دلائل پیش کیے تو وہ سنجیدگی سے بولا۔  
 ”یہ سب ٹھیک ہے لیکن میں کسی ماہر نفسیات کے پاس نہیں جاؤں گا۔“  
 ”تو پھر زاریہ کو واپس گھر لے آؤ۔ وہی تمہارے مسئلے سلجھائے گی مجھ سے تمہاری یہ حالت نہیں دیکھی جا رہی۔“  
 ”وہ خود ہی آجائے گی۔“ اس کے لہجے کی لافعلی ہنوز برقرار رہی۔  
 ”کیسے خود آجائے گی؟“ سہلی آپا نے جرح کی تو وہ کسمسا کر نظریں چرا گیا۔ مگر خاموش رہا۔  
 ”بیوی ہے وہ تمہاری جس سے تم نے بڑے ارمانوں اور چاؤ سے شادی کی تھی۔ جس کی ایک پل کی جدائی تمہارے لیے سوہان روح تھی۔ اب تم اس سے اس قدر لافعلی ہو گئے ہو کہ ایک ماہ سے وہ اپنے میکے میں ہے اور تم بے نیازی اور لافعلی کی ہلکے مارے یہاں بیٹھے ہو۔“  
 ”کہانا آپا! ہر جذبہ، ہر احساس سرا گیا ہے۔ اس کے قرب کی خواہش ہی نہیں جاگتی۔“ وہ ٹھنڈے لہجے میں بولا۔  
 ”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ میں زاریہ کو فون کر کے بتاتی ہوں۔ وہ خود ہی آکر تمہیں سنبھالے گی۔“  
 ”وہ مجھے سنبھالنے سے پہلے خود ٹوٹ جائے گی۔“ وہ جہد و شکیل سیر نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا تو سہلی آپا کے دل پر برجھی سی لگی تھی۔ بے ساختہ ترپ کر بولیں۔  
 ”اللہ نہ کرے، منہ سے اچھی بات نکالو۔“  
 ”آپا! زندگی میں انسان کو سب کچھ نہیں ملتا۔ کہیں

نہ کہیں اسے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے، بار بار پڑتا ہے۔ من کو مارنا پڑتا ہے۔ انسان کو سب کچھ مل جائے تو زندگی کتنی آسان اور شادمان گزارا کرے۔ ہے نا؟“  
 سیر نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہتے ہوئے آخر میں سہلی آپا سے اپنی بات کی تائید چاہی۔  
 ”ہاں چند! یہ تو زندگی کا چلن ہے اور ہم کون سے برائیوں سے مبرا، فرشتے ہیں کہ ہم کو سب کچھ مل جائے۔ کوئی کی ہماری زندگی میں نہ ہو۔ کوئی تنگی نہ رہے، یہ تو اللہ کی تقسیم ہے۔ اس نے جو کچھ ہمیں دیا ہے بہت سے انسانوں کو نہیں دیا اور جو دوسروں کو دیا ہے۔ اس میں کچھ ہمارے حصے میں نہیں رکھا اور کیوں نہیں رکھا؟ یہ اللہ کی حکمتیں ہیں وہی جانے اسی کے راز۔ پھر بھی ہمیں اللہ کا احسان ماننا چاہیے اس کا کروڑہا شکر ادا کرنا چاہیے۔ کہ اس نے ہمیں اپنی نعمتوں اور رحمتوں سے نوازا ہے۔ ہم دنیا کے ان کروڑوں انسانوں میں شامل ہیں۔ جو اللہ کی نعمتوں کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ اللہ نے ہمیں ایک مکمل انسان پیدا کیا ہے۔ ہر عضو جسسانی سے نوازا ہے ضروریات زندگی کی ہر نعمت سے نوازا ہے۔ ہمارا شانہ لوگوں میں نہیں ہوتا جن کو یہ نعمتیں سیر نہیں ہیں۔ کتنے انسان ہیں جنہیں پیٹ بھرنے کو ایک وقت کا کھانا میسر نہیں ہے۔ صاف پانی نہیں ہے۔ سر پر چھت ہے نہ تن پر ڈھنگ کی پوشاک، کتنے چھید ہیں ان کی پوشاک کی طرح ان کی زندگی میں..... چھوٹی سی خوشی بھی جنہیں دکھ کی چادر میں لپیٹی ہوئی ملتی ہے۔ ایک ہم ہیں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ناشکرے کے ناشکرے ہیں۔ ارے کیا ہوا اگر زندگی میں ایک آدھ چیز کی کمی ہوگئی اور جو سینکڑوں نعمتیں اللہ نے ہمیں دی ہیں کبھی ان کا بھی شکر ادا کیا ہے ہم نے۔ جو نہیں دی اس کا شکوہ اور ذکر بار بار کرتے ہیں اور اسے اپنی بد قسمتی سے تعبیر کرتے

ہیں۔ حالانکہ اللہ کا ذکر تو شکر کے ساتھ کرنا چاہیے نا۔ کفر کرنا بہت آسان ہے میرے بھائی اس کی نعمتوں سے مفر تو فوراً کر لیتے ہیں لوگ مگر شکر اور صبر کا راستہ بڑا کھٹن مگر اطمینان بخش ہے۔ جو اس نے دیا وہ بھی اسی کا ہے جو نہیں دیا وہ بھی اسی کا ہے۔ وہ مالک ہے ہمارا۔ وہ جو چاہے سودے جو چاہے نہ دے۔ ہم کون ہوتے ہیں اس سے سوال جواب کرنے والے کہ اسے تو دے دیا مجھے کیوں نہیں دیا؟ وہ تو بس پانچ وقت کی حاضری چاہتا ہے اپنے دربار میں اور ہم سے وہ بھی نہیں دی جاتی۔ تو پھر کس بڑے اور کس بنیاد پر ہم اس سے شکوہ کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی (اللہ) محنتیں، جنتیں وہی جانے سو جولا ہے اسی پر راضی بہ رضار پنا سکھو۔ اللہ کا شکر ادا کرو اور خوشی سے جیو۔“ آپا نے تفصیلی جواب دیتے ہوئے اسے تائید طلب نظروں سے دیکھا تھا۔  
 ”ہاں آپ کا لفظ لفظ چٹانی پر مٹی ہے۔“ سیر نے سہلی آپا کا مقلد جواب سننے کے بعد قائل ہوتے ہوئے کہا۔  
 ”تو اٹھو اور زاریہ کو گھر لانے کی تیاری کرو۔ مہینہ ہو گیا اسے میکے میں رہتے ہوئے۔“  
 ”ابھی نہیں آیا! دو چاردون بعد جاؤں گا۔ ابھی سنبھالوں خود کو اسے کہنے کا حوصلہ اور جرأت اپنے اندر پیدا کر لوں پھر جاؤں گا اسے لینے۔“ سیر نے سنجیدگی سے کہا اور گہرا سانس لبوں سے خارج کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ تو آپا چونک اٹھیں۔  
 ”ارے ایسا کیا کہنا ہے جو حوصلہ اور جرأت چاہیے۔ آئی لو یو تو تم نے اسے کہہ دیا تھا۔ اب کیا بچا کہتے کو؟“ سہلی آپا نے حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔  
 ”آپا! آئی لو یو کے بعد ہی تو اصل زندگی شروع

ہوئی ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ لہٰذا کے بعد محبت کا امتحان شروع ہوتا ہے۔ چاہت اور محبت کے دعوے اور وعدے پہلے ہوتے ہیں اور ان کی آزمائش بعد میں ہوتی ہے۔ محبت بڑے کڑے امتحان لیتی ہے۔ جیسا کہ ایسے ہی تو لوگ جنہوں اور فرہاد نہیں بن جاتے۔ یونہی کوئی منصور سولی پر نہیں چڑھ جاتا۔ خواجواہ تو سوئی کچے گھڑے پر دریا پار کرنے نہیں چل پڑتی۔ محبت ہونے کی دیر ہے۔ بس پھر کھونے کے خدشے خود بخود دس اٹھانے لگتے ہیں۔“ سمیر نے نہایت گہرے اور رنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

”تو بے سمیر! تم نے تو میرا دماغ ہلا کے رکھ دیا ہے۔ کیسی خوف ناک باتیں کر رہے ہو۔ میں تمہارے لیے جوں بجا کر لاتی ہوں اسے پی کر شاید تمہارا دماغ ٹھکانے پر آ جائے۔“

سلی! آپ اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر جھرمجری سی لیتے ہوئے کہا اور کچن کی طرف چلی گئی۔ سمیر کے لبوں پر افسردہ سی مسکان بکھر گئی۔

زار یہ اور سمیر یونیورسٹی میں ساتھ بڑھتے تھے۔ زار یہ کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ تین بکنیس دو بھائی اور ماں باپ سات مرلے کا گھر تھا ان کا۔ بہنوں میں وہ سب سے چھوٹی تھی۔ بھائی ایک اس سے چھوٹا تھا۔ زار یہ سے بڑی، بہن ساریہ تھی۔ سب سے بڑی ماریہ آپنی تھیں جن کی شادی ان کے ماموں کے بیٹے وحید سے ہوئی تھی۔ وحید ان کے ماموں کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس لیے اس کے والدین پوتوں سے بھرا گھر دیکھنے کے آرزو مند تھے اور وحید بھی ان کا ہم خیال تھا۔ اللہ نے انہیں تین بیٹوں اور دو بیٹیوں سے نوازا تھا۔ پھر بھی وہ شاکر نہ تھے۔ انہیں دو بیٹے اور درکار تھے۔ بیٹیوں کی پیدائش کی انہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی

کیونکہ وحید ان مردوں میں تھے۔ نہیں، بہن، بیٹی کے رشتے کا کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ ماریہ آپنی کی صحت بہت گر چکی تھی۔ سمیر اور زار یہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور سمیر نے اپنے والدین کو زار یہ کے لیے آمادہ کر ہی لیا تھا۔

دونوں کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ زار یہ کے خاندان والے تو وحید کی آگ میں جلنے رہ گئے تھے کہ زار یہ کی شادی اتنے امیر بزنس مین کے بیٹے سے ہو گئی تھی اور وہ دونوں ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے۔

آج اتوار تھا اور سمیر نے زار یہ کو گھر لانے کے لیے بہت کمری لٹی تھی۔ زار یہ کی فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ اسے لینے آ رہا ہے۔ زار یہ نے اسی وقت اپنا سامان پیک کر لیا تھا اور نہا کر بہت اہتمام سے تیار بھی ہو گئی تھی۔ زار یہ کی امی اور بھابیوں نے دوپہر کے کھانے پر خاصا اہتمام کیا تھا۔ ماریہ آپنی بھی میکے آئی ہوئی تھیں۔ اس بار ان کے ہاں جڑواں بچوں کی پیدائش ہوئی تھی۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی دونوں بہت خوب صورت اور ماشاء اللہ صحت مند تھے۔ ماریہ آپنی البتہ مرتے مرتے بچی تھیں۔ یہ ان کا تیسرا میجر آپریشن تھا۔ ہر بار ڈیلیوری کا خرچہ میکے والوں کو برداشت کرنا پڑتا۔

وحید کی تنخواہ اٹھارہ ہزار تھی اور کچھ ان کے سر مجید کی پنشن آ جاتی تھی۔ مہینے کے آخری دس بارہ دن انتہائی تنگی میں گزرتے تھے۔ کل تو افراد تھے ان کے تمام اخراجات اور گھر کے دیگر اخراجات اسکول کی فیس۔ علیحدہ تھی۔ ایسے میں ہر سال ایک بچے کا اضافہ ان کی معاشی بد حالی میں اہم رول ادا کر رہا تھا۔ ماریہ آپنی کی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ اس بار وحید انہیں میکے چھوڑنے آئے تو زار یہ نے انہیں بڑے طریقے

سے آئینہ دکھایا تھا۔

”آپ دو بچوں کو تو صحیح تعلیم و تربیت دے نہیں سکتے اور ہر سال ایک بچے کی آمد پر آپنی کی حالت دیکھی ہے آپ نے؟“ ڈاکٹر نے کہہ دیا ہے کہ ماں کو زندہ دیکھنا ہے تو اب بس کریں۔ خدا خواستہ اگر ماریہ آپنی کو کچھ ہو گیا تو کون سنبھالے گا آپ کے بچے اور کیا میکے والوں نے ٹھیکہ لے رکھا ہے آپ کے لیے کی سزا جھگڑنے کا؟ جب آپ اپنا فورڈ ہی نہیں کر سکتے تو کیوں نہیں اپنے والدین کو سمجھاتے؟ اللہ نے بجا رکھا ہے آپنی کو ورنہ آپ نے تو انہیں بہشتی بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔“

وحید تمللا کے رہ گئے تھے۔ کچھ کہنے کی جرأت بھی نہ کر سکے۔ البتہ زار یہ کی باتیں انہیں آئینہ دکھا گئی تھیں۔ حقائق سے نظریں چرانا، اب ان کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ تو اب مزید بچوں کی آمد اور اخراجات سے ہی گھبرا رہے تھے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی اور بچوں کی کثیر تعداد ان کے مسائل بھی بڑھا رہی تھی۔ ماریہ آپنی تو بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ سچ تو کہا تھا زار یہ نے۔ اگر ماریہ کو کچھ ہو جاتا تو..... زار یہ کی باتوں نے ان کی سوچ کے نئے در کھول دیے تھے۔ وہ خاموشی سے واپس چلے گئے۔ سمیر نے بھی بچوں کو دکھ کر پیار کیا اور ہزار ہزار کے نوٹ ان کے نوزائیدہ بچوں کی منھیوں میں دے دیے تھے۔

”اب چلیں۔“ کھانے سے فراغت کے بعد سمیر نے زار یہ سے کہا۔

”جی میں اپنا سامان لے کر آتی ہوں۔“ زار یہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ سمیر بھی اس کے پیچھے ہی چلا۔ زار یہ نے اسے محبت سے مسکراتے ہوئے دیکھا وہ بھی اسی کو دکھ رہا تھا۔ چھٹی رنگت والی، دل کش مین نقش کی مالک زار یہ

تھی سنو ری اس کے دل میں اترتی جا رہی تھی۔ سوئے ہوئے جذبے پھر سے انگڑائی لے رہے تھے۔

”سمیر میں تیار ہوں گھر چلیں۔“

”ہوں۔ ایک منٹ پہلے میری بات سن لو۔ اس کے بعد فیصلہ کرنا کہ تمہیں میرے ساتھ گھر جانا ہے یا نہیں؟“

”میں سمجھی نہیں؟ کیا آپ کسی باتیں کر رہے ہیں؟“

”بیٹھو سمجھاتا ہوں۔“ سمیر نے اسے کندھوں سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھا دیا اور خود بھی اس کے برابر بیٹھ گیا۔

”کیا بات ہے سمیر کہیے نا۔“ وہ پریشان ہو گئی تھی۔

”زار یہ، ہماری میڈیکل رپورٹس آن گئی ہیں۔“

”اوہ رینلی میں تو یہاں آ کے بھول ہی گئی تھی۔ کہ میں نے آنے سے پہلے اپنا چیک اپ اور کچھ ٹیسٹ کروائے تھے۔ کیا لکھا ہے میری رپورٹس میں؟“

زار یہ اس کی بات سنتے ہی نان اسٹاپ بولتی چلی گئی۔

”الحمد للہ تمہاری رپورٹس بالکل ٹھیک ہیں۔“

”شکر الحمد للہ، یہ تو خوشی کی بات ہے پھر آپ کیوں پریشان ہیں؟“ زار یہ نے اس کے چہرے پر پچھلی افسردگی کو دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیونکہ میری رپورٹس ٹھیک نہیں ہیں۔“

”کیا؟“

”ہاں، میں پیدائشی طور پر باپ بننے کی صلاحیت سے محروم ہوں۔“

”یہ..... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

زار یہ کے اعصاب پر جیسے ایٹم بم پھٹا تھا۔ لمبے بھر کو تو وہ کبھر کر رہ گئی تھی۔ اسے اب سلی آپنی باتیں یاد آ رہی تھیں جو انہوں نے اسے کل فون کر کے بتائی تھیں اور سمیر کی حالت کے بارے میں بتایا تھا۔ اب وہ بھی

تھی کہ میرا سنے پریشان اور افسردہ کیوں ہیں۔ یہ  
صدمہ انہیں اندر ہی اندر کھا رہا تھا۔  
”ہاں زاریہ! میری بیوی ہوتے ہوئے تم عمر بھر  
ماں نہیں بن سکتیں۔ اس لیے اگر تم چاہو تو میں کہیں  
اس بندھن سے آزاد کر.....!“

”میر! آپ نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا؟“  
زاریہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تڑپ کر  
سوال کیا۔

”زاریہ! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اس  
لیے خود غرض ہو کر نہیں سوچنا چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ  
اولاد سے ایک عورت مکمل ہوتی ہے۔ تم چند سال تو  
میری محبت میں اولاد کے بغیر گزار لو گی لیکن بلا خراک  
دن نہیں اولاد کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگے گی  
اور تمہاری مجھ سے محبت کم ہو جائے گی۔ میں ساری  
زندگی تمہارے سامنے سر جھکائے بچروں کی طرح  
نہیں رہ سکتا۔ تم مجھ سے بے زار ہو جاؤ، نفرت کرنے  
لگو، یہ نہیں سہہ سکوں گا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا  
ہے کہ تم.....!“

”آپ اکیلے کیسے کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں میر!“  
زاریہ نے اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر اس کے مقابل  
آ کر سوال کیا۔

”زاریہ!.....!“ اس نے دل پر جبر کر کے بولنا چاہا۔  
”میر! محبت تو ہم دونوں نے کی ہے پھر فیصلہ کا  
حق صرف آپ کیوں استعمال کریں؟ آپ یہ سب کر  
کے اپنی محبت کے سامنے سرخرو ہونا چاہتے ہیں اور  
مجھے کیا سمجھا آپ نے کہ میں آپ کے اس فیصلے کو  
قبول کر لوں گی؟ آپ کے بغیر جینے کا حوصلہ کر لوں  
گی؟ نہیں میر! ایسا ہونا ممکن نہیں ہے.....! مجھے آپ  
پر اور آپ کی محبت پر فخر ہے۔ مجھے ساری عمر آپ کے  
ساتھ مسز زاریہ میر بن کر رہی جینا ہے۔ آپ نے مجھے

”ہاں الحمد للہ۔“ وہ خوش دلی سے ہنس پڑا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ماریا پی کے بچوں کو لود میں لیے  
اپنی گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔ زاریہ نے سب سے یہ  
جھوٹ بول کر کہ وہ ماں نہیں بن سکتی میر کو سب کے  
سامنے شرمندہ ہونے سے بچالیا تھا۔ میر نے محبت  
سے اسے دیکھا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس کی محبت اتنی  
عظیم تھی واقعی چاندنی کی طرح اجلی اور روشن تھی اور اس  
نے بیٹے کے بجائے بیٹی کو کوفت دی تھی۔ ماریا پی شکر  
سے مسکرائی تھی۔ گھر واپس لوٹتے ہوئے وہ دونوں  
بہت خوش تھے۔

”زاریہ! ہم گھر میں کیا کہیں گے؟“ میر نے  
گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کا اشارہ بچوں  
کی طرف تھا۔

”سر پرانزا! زاریہ نے اس انداز سے کہا کہ وہ  
ہنس پڑا۔

”ہاں یہ تو سوائے آپ کے کسی کو معلوم نہیں ہوگا۔  
اچھا ہی ہونا کہ مئی ڈیڑی سب ایک سال سے لندن  
میں ہیں۔“

”جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے۔“  
”ہوں۔“ میر نے بیٹی کو پیار سے دیکھا تھا۔ بیٹی  
زاریہ کی گود میں سو رہی تھی۔

”گھر پہنچتے ہی ہم اہل کے لیے ڈھیر ساری  
شانگ کریں گے۔“ زاریہ نے ایک دم بیٹی کا نام بھی  
رکھ لیا اور خوشی سے پُر لہجے میں کہا تو میر نے چونک کر

اسے دیکھا۔  
”اہل؟“

”ہوں، ہماری بیٹی۔“  
”اوہ! اچھا نام ہے۔“  
اس نے لمبی سے ”او“ کے بعد ہنس کر کہا۔  
”مبارک ہو آج سے ہم بھی ماما بن گئے ہیں۔“

”تمہیں بھی مبارک ہو مبارک ہو مبارک ہو زاریہ اور.....!“  
”اور کیا؟“ اس کے احوال سے جملے پر وہ  
متحسّس ہوئی۔

”آئی لو یو سوچ۔“ میر نے محبت پاش نظروں  
سے اسے دیکھتے ہوئے دل سے کہا۔ تو وہ شرمیلے پن  
سے مسکراتے ہوئے بولی۔  
”لو یو لو۔“

”اچھا جی۔“ میر شرارت سے اس کے  
چہرے پر جھکا۔  
”ہاں جی ذرا ادھیان سامنے رکھیں سمجھے؟“ زاریہ

نے شرماتے ہوئے اسے ہاتھ سے پرے کیا۔  
”او کے مادام! جواب کا حکم۔“  
میر کے کہنے پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ میر نے

بھی ہنستے مسکراتے گاڑی کا رخ گھر کی جانب موڑ دیا۔  
محبت چاندنی ہے  
جو تاریک راتوں میں  
ہمیں رستہ دکھاتی ہے  
دلوں میں جگمگاتی ہے  
لہو میں گنگنائی ہے  
بہت بے سارگوں کو امیدیں دلاتی ہے  
دکھوں اور الجھنوں کو یہ  
جیون سے بھگاتی ہے  
محبت چاندنی ہے  
اور  
چاندنی جگمگاتی ہے  
ہمیشہ جگمگاتی ہے۔





# پتھر کی پلکوں

نازیہ کنول نازی

پھر کیا ہوا یہ راہ کی دشواریوں سے پوچھ  
بس اتنا یاد ہے تیری جانب چلا تھا میں  
کل رات ایک شخص تھا مجھ سا کسی کے ساتھ  
جانے میری نگاہ کا دھوکا تھا یا تھا میں

ہم جگنو تھے ہم تلی تھے ہم رنگے برنگے پیچھے تھے  
کچھ ماہ و سال کی جنت میں  
ماں ہم دونوں بھی سا جی تھے  
میں چھوٹا سا اک بچہ تھا تیری انگلی تھام کے چلتا تھا  
تو دور نظر سے ہوتی تھی میں آنسو آنسو روتا تھا  
اک خواب کا روشن بستہ تو ہر روز مجھے پہناتی تھی  
جب ڈرتا تھا میں راتوں کو تو اپنے ساتھ سلاتی تھی  
ماں تو نے کتنے برسوں تک اس پھول کو سینچا ہاتھوں سے  
جیون کے گہرے بھیدوں کو میں سمجھا تیری باتوں سے  
میں تیرے ہاتھ کے نیلے پر ماں اب بھی رات کو سوتا ہوں  
ماں! میں چھوٹا سا اک بچہ تیری یاد میں اب بھی روتا ہوں  
مسجد کے وسیع احاطے میں بیٹھا وہ دروازہ تھا اور ساتھ ساتھ مسجد بھی کر رہا تھا۔ جانے آج کیوں اسے اپنی ماما  
بے حد یاد آ رہی تھیں۔ وہ ان کی گود میں منہ چھپا کر رونا چاہتا تھا۔ دل کا سکون پانا چاہتا تھا۔  
کئی گھنٹے مسجد میں گزار کر رونے کے بعد وہ وہاں سے اٹھ کر سیدھا قبرستان چلا آیا جہاں اس کی جنت مٹی  
کے ڈھیر میں چھپی ہضبر خاموشاں کا حصہ بنی ہوئی تھی شافیہ کی قبر بھی ان کے پہلو میں ہی بنی تھی جب کرا اور اور  
صدف نیگم کی قبریں ساتھ ساتھ تھیں۔  
مٹی کے ان بڑے ڈھیروں کے نیچے کیسے کیسے محبوب رشتے، کیسے کیسے پیارے چہرے چھپ گئے تھے وہ

فاتحہ پڑھتا رہا اور کسی ننھے سے بچے کی مانند ہلکے ہلکے کر رہا تھا۔ اگلے کئی گھنٹے رو کر دل ہلکا کرنے کے بعد وہ شکتی ساٹھا اور گاڑی میں بیٹھ کر انوشہ کے گھر کی طرف چلا آیا مگر وہاں دروازے پر تالا دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ قدرے بوکھلاہٹ میں ساتھ والوں کا دروازہ کھٹکھٹاتا تو ایک ادھیڑ عمر خاتون نے سر ہانکا۔

”اسکرام علیکم نئی! یہ ساتھ والے آپ کے پڑوسی.....؟“

”وہ تو کل یہاں سے چلے گئے بیٹا! اپنا سارا سامان سمیٹ کر۔“

”چلے گئے..... کہاں چلے گئے.....؟“ بہت زور کا دھچکا لگا تھا اسے جب وہ خاتون بولی۔

”پتا نہیں..... کچھ بتا کر نہیں گئے! بس یہی کہا کہ اب اس شہر میں دل نہیں لگتا۔“

خاتون کا لہجہ سادہ تھا۔ شاہ زکریا کو لگا وہ گھر پرے گا۔ پتا نہیں زندگی کو ابھی اس سے اور کتنے امتحان مطلوب تھے۔

انوشہ رُمن کے گھر سے اپنے گھر تک جیسے وہ پہنچا تھا وہی جانتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی بھی لمحے دل یا دماغ کی رگ پھٹ جائے گی۔ آنکھوں میں جیسے لبو اُٹا آیا تھا۔ بُریہ اس وقت کچن میں تھی جب وہ لاؤنج میں آ کر دہانڈا۔

”بُریہ.....!“ اور بُریہ کے ہاتھ سے کڑھلی کی پلٹ چھوٹ کر زمین پر جا پڑی۔

”اللہ خیر..... کیا ہو گیا؟“ گھبرا کر وہ فوراً کچن سے نکلی جب وہ تہہ برسائی نگاہوں سے اسے دیکھتا اس کے سر پر آکھڑا ہوا۔

”کیا کہا تھا تم نے کل انوشہ سے! جو وہ لوگ راتوں رات شہر چھوڑ کر چلے گئے بولو.....؟“

اپنی انگلیوں کو اس کے گداز بازوؤں میں گاڑ کر زور کا جھٹکا دیا تھا اس نے وہ سہم گئی۔ شاہ زکریا یہ روپ اس کے لیے بالکل نیا تھا۔

”کچھ نہیں.....“ بہت مشکل سے وہ کہہ پائی جواب میں شاہ زکریا نے اسے تھپڑ دے مارا۔

”بکواس نہیں سنی مجھے جو بچ سے دہتاؤ۔“

وہ جنونی ہو رہا تھا۔ عین اسی لمحے سالہ بیگم کے قدم اس کی دہلیز پر پڑے تھے وہ بٹی کو سر پر اندر دینے بنا بتائے آئی تھیں مگر بیٹی نے آگے ان کے لیے سر پرانز تیار کر رکھا تھا ان کی آنکھیں جیسے پٹی کی پٹی رہ گئیں۔ اتنی ہمت بھی نہ رہی تھی کہ دھاڑ کر شاہ زکریا کو واہی دے سکتیں۔

”ممی.....“ بُریہ کی نگاہیں ان پر پڑی تھیں اور وہ خود کو شاہ زکریا گرفت سے نکالتی فوراً ان کی طرف ہلکی۔

”کیا ہو رہا ہے یہاں.....؟“ اگلے لمحوں ان کا سکتہ ٹوٹا۔

شاہ زکریا غیر متوقع طور پر انہیں وہاں دیکھ کر خود پر غصہ کر گیا جب کہ بُریہ رو پڑی۔

”گھٹیا! ذلیل! کینے انسان! میں تو سچی سچی بہن کی موت نے تمہیں توڑ کر رکھ دیا ہوگا! تم خود کو سنبھال نہیں پارے ہو گے! اس لیے میری بیٹی کا جو بد قسمتی سے تمہاری بیوی ہے تمہارے پاس ہونا ضروری ہے مگر مجھے کیا پتا تھا کہ تم تو جانور ہو بلکہ جانور سے بھی بدتر..... بہت غلط کیا میں نے جو اپنی شہزادیوں جیسی بیٹی تم جیسے جنگلی کے سپرد کر دی۔“ وہ بُریہ کو چھوڑ کر اس کے مقابل آئی تھیں۔ شاہ زکریا نے رخ پھیر لیا۔

”یہ صلہ ہے میری محبتوں اور احسان کا؟ ساری عمر بیٹا سمجھ کر دل سے لگا کر رکھا، ہر خواہش پوری کی اور تم اس کا بدلہ یوں دے رہے ہو میری بیٹی کو جہنم میں جھونک کر۔“ طلق کے بل چلائی وہ آپے سے باہر ہو رہی تھیں جب وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولا۔

”لے جائیں اپنی لاڈلی کو یہاں سے مجھے اس کی ضرورت نہیں۔“

”لے جاؤں گی لے جانے کے لیے ہی آئی ہوں مگر تم یاد رکھنا میں تمہارے ساتھ وہ کروں گی اس وحشت کے بدلے میں کہ ساری زندگی یاد رکھو گے۔“

”ٹھیک ہے کر لیجیے گا جہاں حالات نے اتنے تھپڑ لگائے ہیں اس چہرے پر وہاں آپ بھی لگا لیجیے گا“ کوئی فرق نہیں پڑتا اب مجھے اس سے۔“ ٹھہرے لہجے میں کہتا وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ سالہ بیگم بُریہ پر چڑھ دوڑیں۔

”بیٹی سب دیکھنے اور دکھانے کے لیے آئی تھیں یہاں دیکھ لو! جو نے کی نوک پر رکھ کر چلا گیا ہے تمہیں اب بھی نہیں روکو گی؟“

”وہ بہت پریشان ہے ماما۔“

”تو بویس نے کیا ہے اسے پریشان یا تم نے کیا قصور ہے تمہارا جو وہ یوں تھپڑ مار رہا تھا تمہارے منہ پر۔“

”محبت.....“ بہت دھیرے سے اس نے کہا تھا مگر سالہ بیگم نے سن لیا۔

”لعنت بھیجو ایسی محبت پر جس میں عزت اور احساس ہی نہ ہو تمہیں اتنے رشتوں کی کمی نہیں ہے بُریہ! چلو میرے ساتھ۔“

”نہیں ماما وہ اس وقت حقیقت میں پریشان ہے میں سمجھا لوں گی اسے۔“

”کیا سمجھا لو گی محبت سمجھانے سے ہوتی ہے کبھی۔ وہ بھٹک گیا ہے سمجھنے سمجھانے کی حد سے نکل گیا ہے اب کچھ نہیں کر پاؤ گی تم۔ عورت چاہے زندگی سے پیاری کیوں نہ ہو دل سے اُتر جائے تو پاؤں کی جوتی کے برابر بھی اہمیت نہیں رہتی اس کی تم بھی دل سے اُتر گئی ہو اس کے۔ اب کیا کرو گی یہاں رہ کر اس مقبرے میں رہ کر؟“ وہ تلخ ہوتی تو بُریہ کا دل کٹ گیا۔

وہ شکتی سی بیڑیوں میں آئی تو شاہ زکریا بیڑ پر نیم دراز آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا تھا۔ بُریہ نے روتے ہوئے وارڈ روم کے پٹ کھولے وہاں رکھا ہی کیا تھا جو وہ ساتھ لے جاتی، بس یونہی بے مقصد کپڑے ادھر ادھر کرتی رہی جب تھک گئی تو شاہ زکریا کے پاس چلی آئی۔

”کیا واقعی اب تمہاری زندگی میں میری کوئی گنجائش نہیں رہی شاہ؟“ کتنی ملول تھی وہ اس نے آنکھوں سے بازو ہٹا دیے۔

”گنجائش سے مگر زندگی نہیں رہی ہے یہ..... انہیں انصاف کر پار یا میں تمہارے ساتھ مجھے لگتا ہے تم یہاں رہیں تو میں تمہیں بھی گنوا دوں گا۔“ اس کا لہجہ نرم تھا۔ وہ بیڈ کے کنارے پرٹک گئی۔

”تو تم چاہتے ہو میں تمہاری زندگی سے چلی جاؤں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے؟“

”نہیں..... مجھے بس کچھ وقت چاہیے میرے اندر ابھی بہت اضطراب ہے طوفان ہے ابھی پلیز تم آئی



کے ساتھ چلی جاؤ، میں وعدہ کرتا ہوں، ٹھیک ہوتے ہی تمہیں خود لینے آؤں گا۔“  
وہ اسے اپنے بچہ سے رہائی دے رہا تھا۔ بڑیرہ جھولی کھلی پر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آئی ایم سوری بڑیرہ! ایم رنکلی میری سوری!“ اس کے کھڑے ہونے پر اس نے بہت محبت سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

”کاش! ایم لڑکیوں کا دل بھی خداتم مردوں جیسا بنا دیتا۔ ہمیں بھی فرق نہ پڑتا کسی کو کھودینے سے ہرنے موڑ پڑنے چہرے سے محبت کا عہد کرتے ہوئے ہمیں بھی پچھلی بھتیس یاد نہ رہتیں۔ کاش! یہ بے وفائی ہمارے لیے بھی اتنی آسان ہوتی شاہ زور کاش.....!“ وہ دل برداشتہ ہوئی تو شاہ زور بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔  
”تمہیں بھلا تا اور کھونا آسان نہیں ہے میرے لیے.....“

اس سے زیادہ شاید وہ خود کو یقین دلارہا تھا۔ بڑیرہ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اس نے اپنے لب اس کی پیشانی پر دھردیئے۔

”میری جان ہو تم بڑیرہ رحمن! مگر کاش میں اپنے اختیار میں ہوتا۔“  
جانے کیا ہوا تھا اسے کہ جھکے لہجے میں اپنی بے بسی کا اعتراف کرتے ہوئے اس نے بڑیرہ کو کسی قیمتی متاع کی طرح اپنی پناہ میں جکڑ لیا یوں کہ اس سے سانس لینا بھی دشوار ہو گیا۔

”کاش! میں زبردست پڑوالے کی گرفت میں نہ آیا ہوتا کاش.....!“ بڑیرہ کے کندھے پر چہرہ نکائے وہ اب ٹوٹ رہا تھا۔ وہ جب چاپ اس کی دھڑکنیں سنتی رہی تو تھوڑی دیر بعد نیچے آ کر اس نے سائلہ بیگم سے معافی مانگی تھی اور بہت مشکل سے انہیں منایا تھا۔ اگلے ایک ہفتے کے لیے اس نے زبردستی انہیں اپنے پاس روک لیا۔ وہ اس کی ماں نہیں تھیں مگر ماں جیسی تھیں۔ ان کے وجود سے اسے اپنی مایا کی خوش بو آتی تھی لہذا روز آفس سے واپسی کے بعد وہ اپنا تمام وقت بڑیرہ اور ان کے ساتھ ہی گزارتا تھا۔

اس ایک ہفتے میں نماز اور بڑیرہ کے ساتھ ساتھ سائلہ بیگم نے بھی اسے خاصا سنبھالا تھا۔ وہ ان کے ساتھ ہی انگلینڈ چلے جانا چاہتا تھا مگر جودل اور روح پر بوجھ تھا وہ اسے کسی صورت قرار لینے نہیں دے رہا تھا۔ انوشہ اور بیگم کی کشمکش جیسے پھانس بن کر سینے میں چھب گئی تھی۔ ایک ہفتہ اپنی بیوی اور ساس کے ساتھ خوب انجوائے کرنے کے بعد اس روز جب وہ انہیں ائر پورٹ چھوڑنے آیا تو بہت داس تھا۔

تمام راستے بڑیرہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہا تھا اور وہ ایک ہاتھ سے گاڑی سنبھالے رہا، دو تین بار بڑیرہ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکالنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے ہر بار اس کی کوشش ناکام بنا کر گرفت مضبوط کر لی۔

ائر پورٹ کی عمارت کے باہر گاڑی ایک جھکے سے رکی تھی۔ انگلینڈ کے لیے روانہ ہونے والی فلائٹ میں ٹائم بہت کم رہ گیا تھا۔ شاہ زور آخری وقت تک بڑیرہ کے ساتھ رہا۔ وقت رخصت اس نے بڑیرہ کی پیشانی چومی تھی جس پر وہ اس کا ہاتھ تھام کر رو پڑی۔

”لو پوسچ شاہ..... آئی آل ویڈس یو ان مالی لائف.....“  
”سی نو.....“ نرمی سے کہتے ہوئے اس نے بڑیرہ کا ہاتھ تھپتھپایا وہ اس کا شکریہ ادا کرتی سائلہ بیگم کے

ہم سے ہیں یہ عہدیں ہم سے دل دگنا ہے  
اور کیا ہے چاہیے ہم سے ہی زمانہ ہے

روح افزا اور کیا چاہیے!



چھپتی پلٹ گئی۔ شاہ زور دیتا کہ ان دونوں کو رخصت ہوتا دیکھتا رہا۔



گاڑی کی ہیڈ لائٹس اس کی آنکھوں میں پڑی تو وہ رک گئی۔

سنسان روڈ پر جھٹکے کے ساتھ رکی گاڑی سے ارسلان باہر نکلا تو امامہ کا دل خوشی سے دھڑک اٹھا۔ ڈھیلے ڈھالے ٹراؤ زرد اور شرٹ میں وہ کتنا پیارا لگ رہا تھا۔ وہ جاتی ہی وہ آئے گا ضرور آنے گا اور وہ آ گیا تھا۔ وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھی۔

”مون! تم ٹھیک ہو.....؟“ وہ پریشان تھا جب وہ مسکرائی۔

”ہاں! الحمد للہ..... کیوں کیا ہوا؟“

”وہ! تم نے امیر جنسی میں بلایا تو میں فکر مند ہو گیا کہ جانے کیا ہوا ہے؟“

”پاگل ہو تم اور کچھ نہیں میں نے تو اس لیے بلایا تھا کہ میں نے شجاع کا گھر چھوڑ دیا ہے بس آج سے ہم اکٹھے رہیں گے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ اس کے چہرے کا رنگ اڑا تھا۔

”کیوں..... کیوں ممکن نہیں؟ اب کس کا پریشہ ہے تم پر؟ ہم نکاح کر سکتے ہیں ارسلان!.....!“

”نہیں کر سکتے..... نہ میرے پاس کوئی جاب ہے نہ ٹھکانہ ہے کہاں رکھوں گا نہیں؟“

”جہاں تم رہو گے میں بھی وہیں رہ لوں گی تم کہو گے تو سڑک کنارے جھونپڑی میں بھی رہ لوں گی تمہارے ساتھ۔“

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا مون اور کچھ نہیں اچھی بھلی سکون سے رہ رہی ہو کیوں چھوڑ کر آئی ہو وہ گھر؟“

”تمہاری وجہ سے کیونکہ میں تم سے محبت کرتی ہوں اس لیے پی سے نہیں۔“

”تو کیا ہوا؟ محبت انسان کا پیٹ نہیں بھرتی ابھی میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ تمہاری ذمہ داری اٹھا سکوں! لہذا پلیز واپس چلی جاؤ مون! بلکہ دوسرے خود تمہیں چھوڑ کر آتا ہوں۔“

”ہرگز نہیں..... میں واپسی کے سارے راستے بند کر آئی ہوں اب وہاں پلیٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تم حماقت کر رہی ہو مون! مگر میں تمہیں یہ حماقت نہیں کرنے دوں گا؟“

”کیوں..... کیا تم مجھ سے پیار نہیں کرتے؟“

”کرنا ہوں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمہاری ہر حماقت پر سمجھوتا بھی کر لوں ابھی میں جن لڑکوں کے ساتھ رہ رہا ہوں وہ اچھے لوگ نہیں ہیں میں نہیں چاہتا کہ تم ان کی نظروں میں آؤ۔“

”مجھے کچھ نہیں پتا بس مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہے۔“ وہ اپنی ضد پر اڑی تھی۔ ارسلان کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”ٹھیک ہے ایک شرط پر تم میرے ساتھ رہ سکتی ہو۔“

”مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔“ وہ جذباتی ہوئی تھی جب وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”تو ٹھیک ہے جس گھر میں تم ایس پی شجاع حسن کے ساتھ رہ رہی ہو وہ اپنے نام کروالو میں وعدہ کرتا ہوں فوری نکاح کر لوں گا تم سے۔“

”کیا.....؟“ اسے حیرت سے جھٹکا لگا۔

”حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں کوشش کر کے جاب ڈھونڈ سکتا ہوں گھر بنا کر نہیں دے سکتا تمہیں۔ اس لیے جس گھر میں رہ رہی ہو وہ اپنے نام کروالو تا کہ بعد میں کوئی پریشانی نہ ہو۔“ وہ اس کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلا رہا تھا۔ امامہ پریشان ہو گئی۔

”وہ اپنا گھر میرے نام کیوں کرے گا اب تو شاید وہ مجھے طلاق بھی دے دے۔“

”کیوں! اب کیا ہو گیا ہے؟“

”بہت کچھ..... اس نے مجھے تمہاری گاڑی سے نکلنے دیکھ لیا تھا میں نے جھوٹ بولا تو اس نے تھپڑ مارا جس پر میں اس سے جھگڑا کر کے چلی آئی۔“

”بہت غلط کیا تم نے میں اس کی جگہ ہوتا تو جانے کیا کر بیٹھتا۔“

”ارسلان!.....! ارسلان نے رخ پھیر لیا۔“

”تم زندگی میں کچھ بھی نہیں کر سکتیں امامہ حسن! انتہائی بے کار فضول لڑکی ہو تم تمہاری جگہ میں ہوتا تو اب تک جانے کتنا کچھ تھپتھپا چکا ہوتا اس لیے پی سے۔“

”ایس پی نہیں رہا اب وہ ڈی آئی جی بن چکا ہے اور مجھے چیزوں سے کبھی محبت نہیں رہی سنا تم نے۔“

”جو بھی ہو مگر مجھے ابھی سہارے کی ضرورت ہے تم نے اب تک میرے لیے کچھ نہیں کیا اب کرنا ہوگا جیسے بھی ہو وہ گھر اسے نام کراؤ۔“

”میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔“

”تو ٹھیک ہے پھر آج کے بعد تمہارے اور میرے راستے جدا جدا ہیں۔“ ایک لمحے میں اس نے فیصلہ سنا دیا تو امامہ کی آنکھیں جیسے جل اٹھیں۔

”ایک اور آپشن بھی ہے میرے پاس اگر تم قبول کرنا چاہو۔“ فوراً سے پیش تر اس نے اپنے فیصلے میں ترمیم کی تھی۔ وہ ہم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

”یہ دیکھو.....! یہ بے ہوشی کی دوائے میں سوچ رہا تھا کہ ضرور میری وجہ سے شجاع نے تمہیں نارچہ کیا ہوگا تو یہ دوا اسی وقت خرید لی تھی میں نے شام کو دو گئی تو صبح ہی اٹھے گا تب تک تم اس کی ہر قیمتی چیز چیک بگ جو بھی ہاتھ لگتا ہے تھپتھپا لینا یقیناً گارڈ تمہیں روکنے کی جرات نہیں کرے گا پھر اس کے بعد اگر اس ایس پی کو پتا بھی چل جاتا ہے تو کوئی پریشانی کی بات نہیں زیادہ سے زیادہ وہ تمہیں طلاق ہی دے گا دے دے۔ ادھر وہ فارغ کرے گا اور ادھر میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا یہاں سے کہیں دور۔ جہاں کوئی نہیں پریشان کرنے والا نہ ہو ٹھیک ہے نا!“

بڑی مہارت سے جال پھینکتے ہوئے وہ اپنے پہلے سے پلان کے منصوبے پر عمل کر رہا تھا۔ امامہ بے بسی سے اسے دیکھتی آخری بازی کے طور پر یہ فعل سرانجام دینے کے لیے بھی تیار ہو گئی تھی جس کے لیے اس کا دل

اسے کسی طور پر اجازت نہیں دے رہا تھا۔

سنان سڑک پر ارسلان حیدر سے تبا چھوڑ کر گاڑی میں واپس جا بیٹھا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس کی محبت اس کے مفاد اور شرائط سے شروط تھی۔

وہ اس کے معیار اور مفاد پر پوری اترنے کے لیے بلکان ہوتی جا رہی تھی مگر وہ شخص تھا کہ اب بھی اس سے خوش نہیں تھا۔ خطرناک موسم کے تیور بدلے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ بادلوں نے بھی اپنے اصول موتی گرانے شروع کر دیے تھے۔

اس کے شکست قدموں کی رفتار میں تیزی آئی تھی جب کہ دل بے تکان دھڑک رہا تھا۔ جو راستہ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ اپنے لیے بند کرتا تھا اب اسی راستے پر واپس پلٹنا ایسی ناقابل تصور شرمندگی کا باعث تھا۔ کیسے سامنا کر سکتی تھی وہ شجاع حسن کا جسے بڑے کروفے ٹھکرا کر آئی تھی اور اب پلٹ کر واپس جانے کے بعد بھلا کیا حیثیت رہ جاتی تھی اس کی سوچیں تھیں کہ اسے ابھارتی جا رہی تھیں۔

تیز قدموں کو ٹھنکی ہوئی دھڑک کے سامنے پہنچی تو شرمندگی سے مر جانے کا مقام تھا۔ شجاع جو بے قراری سے سگریٹ نوشی کرتے ہوئے ٹیرس پر ٹہل رہا تھا اسے سر جھکائے گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھ کر بے ساختہ پرسکون ہو گیا۔ آپ ہی آپ بلفظ اس کے ہونٹوں پر اُٹھائے تھے۔

ہجرت کی رات آنکھوں میں گزاردوں گا تو رُودوں گا  
خیالوں میں تیری زلفیں سنواروں گا تو رُودوں گا  
پوہی سنان راتوں میں پریشانی کے عالم میں  
کلی میں آ کے جب تجھ کو یکاروں گا تو رُودوں گا  
تیری تصویر آنکھوں کو جھپکنے ہی نہیں دیتی  
میں جب دیوار سے اس کو اتاروں گا تو رُودوں گا  
اگر میں زندگی بھی بار دوں تو مسکراؤں گا  
مگر اے دوست! جب تجھ کو میں باروں گا تو رُودوں گا

امامہ کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی۔ وہ سر جھکانے چلتی سیدھی گڑیا کے کمرے میں آئی۔ کپڑے بارش میں جھینکے کی وجہ سے خراب ہو گئے تھے اس نے دروازہ لاک کیا اور بیگ سے کپڑے نکال کر تبدیل کر لیے۔

بھیکے کپڑے اٹھا کر ابھی وہ پھیلانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ دروازہ ہلکی سی دستک سے بج اٹھا۔ ایک لحظہ اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ تاہم وہ کپڑے وہیں صوفے پر پھینک کر دروازے کی سمت چلی آئی۔ کپکپاتے باتھوں سے چٹخنی رگرا کر جونہی اس نے دروازہ کھولا شجاع حسن کو مقابل پا کر بے ساختہ سر جھکا گئی۔ تاہم اس نے اس کی طرف توجہ نہیں کی آہستگی سے اسے سامنے سے ہٹا کر وہ اندر آیا اور بیڈ پر گہری نیند میں سوئی اپنی جین کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھالیا۔

امامہ اسے روکنا چاہتی تھی مگر وہ جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے واپس پلٹ گیا نہ کوئی استفسار نہ

سرزنش اس شخص کی خاموشی بھی کسی جان لیوا تھی۔

وہ کچھ دیر دروازے میں کھڑی رہی پھر گہری سانس بھرتے ہوئے واپس پلٹ آئی۔ اس رات وہ ایک پل کے لیے بھی سکون کی نیند نہیں سو سکی تھی۔ صبح ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا جب شجاع پھر اس کے کمرے میں آتا تھا وہ بازو پر سر رکھ کر روٹ کے بل لیٹی تھی اسے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی۔

”گڑیا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، تمہیں بلارہی ہے۔“

اس کی سرخ آنکھیں بھی رینگنے کی چٹکی کھا رہی تھیں۔ وہ سرعت سے اٹھی اور جوتا پہنے بغیر اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں گڑیا بیڈ پر بیٹھی ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی اس کا دل جیسے کسی نے ٹھکی میں لے لیا۔ لپک کر اسے اپنے سینے سے لگا گیا تھا۔

”گڑیا! میری جان..... کیا ہوا؟“

بچی اس کی پیٹھ سے آتے ہی اور بلک بلک کر رونے لگی وہ شاید خواب میں ڈر گئی تھی اسی لیے اسے دبوچے بس ماما کی گردان کرنی رہی اور وہ اس کا چہرہ اس کے ہاتھ بے تحاشا چومتی رہی۔

شجاع آ کر خاموشی سے دوسری سائیڈ پر تنک گیا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ گڑیا کے سر میں چلتا پیار سے اس کے بال سہلاتا تحفظ کا احساس دلاتا رہا۔ امامہ شرمندہ سی بیٹھی رہی۔

”میرا خیال ہے یہ کسی بھیانک خواب سے ڈر گئی ہے۔“ تھوڑی دیر بعد اسے شجاع کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے کوئی رائے نہیں دی گڑیا اس کے سینے سے لگی دونوں ہاتھوں میں شجاع کا بازو تھام کر سہمی سہمی سی روتی رہی۔



مجھے محسوس ہوتا ہے  
جہاں میں آنکھ جھپکوں گی  
وہیں یہ حادثہ ہوگا

ٹرین چلنے لگی تھی! جمال صاحب انوشہ کے سر پر ہاتھ رکھے اسے پلیٹ فارم سے اٹھالائے۔ بہت ممکن تھا کہ جن لوگوں کے ہاتھ اس کا بچہ لگا تھا وہ اس پر قبضہ جمانے کے لیے فساد کھڑا کرنے پہنچ جاتے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر صدف بیگم کی رحلت پر زہمت بیگم نے اس کا بچہ نہ دیکھا ہوتا تو آج شاید وہ اسے یوں فوری نہ پہچان پاتی اور وہ اپنے بچے کے قریب سے ہو کر گزر جاتی۔

ٹرین کی وکیل کے ساتھ اس نے اپنے بچے کو ہاتھوں میں بھرا تھا اور شکستہ وجود کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی تھی پلیٹ فارم پر موجود لوگوں کا رش اب چھٹنے لگا تھا۔

وہ دوبارہ ٹرین میں چڑھا آئی۔ پچہ اب خاموش ہو چکا تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنا اپنے خالق حقیقی کا شکر ادا کر رہا تھا کہ جس کے کمرے سے وہ اپنے بچے تک پہنچ پائی تھی مگر نہ دنیا کے اس سمندر میں سارے رشتے گنوانے کے بعد بھلا اسے اپنا بیٹا پانے کی امید ہی کہاں رہی تھی۔ حالات نے جیسے اسے اپنی ٹھوکر پر رکھ رکھا تھا اس کے بعد وہ کوئی اختیار بھی استعمال کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہی تھی۔ زار اور صدف بیگم کی رحلت

کے بعد یوں بھی اس کا داغ پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ وہ قدم قدم پر تھکنے اور ہانپنے لگی تھی۔

ٹرین سے باہر بھاگتے مناظر کے ساتھ سرد ہوا کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے بچے کو اچھی طرح آغوش میں چھپا کر اندادو چائس پر پھیلادیا۔ نہت بیگم اب جاگ رہی تھیں وہ سرایت کی پشت گاہ سے نکلا کر سکون سے پالمیں موند گئی۔

رات بھر کے سفر کے بعد گاڑی اگلے اسٹیشن پر رکی تو وہ جھٹکے سے بیدار ہو گئی۔ منزل آگئی تھی۔ مگر وہ ابھی تک لاعلم تھی کہ اسے کہاں جانا ہے۔

جمال صاحب نیکی سے روکا چکے تھے وہ نہت بیگم کے ساتھ اپنے بچے کو اٹھائے خاموشی سے نیکی میں آ بیٹھی تقریباً ایک گھنٹے کے بعد نیکی ایک پوش علاقے میں داخل ہوئی تھی۔ ابھی جمال صاحب نے اسے بتایا۔

”کچھ عرصہ پہلے زاور نے یہاں ایک گھر خریدا تھا تمہارے لیے مگر وہ اسے تعمیر نہ کر سکا۔ انگلینڈ میں سسل ہونے کی وجہ سے اس نے یہاں اپنی ساری پر اپنی فروخت کر دی تھی۔ اسی لیے اس گھر کی تعمیر بھی رک گئی۔

وہ چاہتا تھا کہ تمہیں بھی وہیں سیٹ کروادے اس سلسلے میں کئی بار اس کی تمہارے شوہر سے بات بھی ہو چکی تھی مگر..... قدرت نے اسے اتنا وقت ہی نہیں دیا تو بعد دنیا میں آنے والے اپنے بچے کی خوش

بھی نہ دیکھ سکا بہر حال یہاں تمہارے نام پر جو گھر ہے وہ زاور نے یہاں اپنے ایک دوست کے سپرد کر دیا تھا اسی نے سنا ہے تعمیر مکمل کروائی ہے اس گھر کی۔ ابھی ہم وہیں چل رہے ہیں زاور کا جو برنس انگلینڈ میں ہے

اس کی دیکھ بھال بھی وہی کر رہا ہے سال میں دو چار بار چکر لگا لیتا ہے پاکستان کا بہت اچھا لڑکا ہے۔“ جمال صاحب بتا رہے تھے اس کی آنکھیں یک لخت آنسوؤں سے بھر آئیں۔

اسی پل نیکی ایک جھٹکے کے ساتھ جس شان دار گھر کے سامنے رکی تھی۔ وہ واقعی اپنی شان و شوکت کے لحاظ سے اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا تھا۔ گیٹ پر گاڑا موجود تھا جمال صاحب اپنا تعارف کروا کر نہت بیگم اور انوشہ کو

ساتھ لیے اندر چلے آئے۔

”اب تم جب تک چاہو یہاں رہ سکتی ہو بیٹی! کبھی مت سمجھنا کہ تمہارا دنیا میں کوئی نہیں رہا وہ اوپر سات آسمانوں پر بیٹھا رب ہے ناں! اپنے ہر بندے پر نظر رکھتا ہے کس کی آنکھ میں آنسو ہیں کس کے لبوں پر مسکراہٹ ہے سب پتا ہوتا ہے اسے وہ اپنے بندے کو زما تا ہے مگر اس پر ظلم نہیں کرتا۔“ انوشہ کے سر پر ہاتھ رکھے وہ اسے سمجھا رہے تھے۔ وہ سر جھکانے آنسو ضبط کرتی رہی۔

اس کا بیٹا وہاں آ کر بہت خوش تھا۔ وہ دوپہی سے اسے دیکھتی دیر تک نہت بیگم سے باتیں کرتی رہی۔ جمال صاحب کے بقول وہاں روزانہ صفائی والی آتی تھی مگر پھر بھی گھر کو جو کمی ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک چیز کو بغور دیکھتی خامیاں نوٹ کرتی رہی اذیت میں تھکن سے بے حال کب اس کی آنکھ لگ گئی اسے بتائی نہ چلا۔

اگلے روز صبح وہ جلدی بیدار ہو گئی تھی۔ ایک مدت کے بعد ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے اس نے فجر کی نماز ادا کی تو رنگ و پے میں عجیب سا سکون آ رہا۔ اس لمحے اس کا دل شدت سے قرآن پاک کی تلاوت کو چاہتا تھا

مگر ابھی وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کون سی چیز کہاں ملے گی؟ دو تین کمرے لاک بھی تھے۔ لہذا نماز کے بعد وہ دیر تک سنج کرتی رہی پھر کچھ سوچ کر ناشتے کی تیاری کے لیے کچن کی طرف چلی آئی۔ جہاں بندوبست میں

ضروریات زندگی کی ہر چیز موجود تھی۔

گیس آن کر کے اس نے چائے کا پانی رکھا تھا جب نہت بیگم بھی بیدار ہو گئیں اس کا منہ جمال صاحب کے پاس سو رہا تھا۔ نہت بیگم انوشہ کے پاس چلی آئیں تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ اپنے اصل مقصد کی طرف آ گئیں۔

”مجھے تم سے کچھ بات کرنی تھی انوشہ!“ بڑے محتاط انداز میں انہوں نے اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ آنا گوندھتی رک گئی۔

”جی کیجیے!“

”دیکھو غصہ مت ہونا میں جس جگہ پر ہوں اگر تم اس جگہ پر ہو تیں تو میری پریشانی بہتر سمجھ سکتی تھیں خدا گواہ ہے میں نے کبھی یہ نہیں سمجھا کہ تم اور زاور میرے بچے نہیں ہو یا یہ کہ تم نے میرے بطن سے نہیں صدف کے بطن سے جنم لیا ہے میں دیاں انگلینڈ میں تھی تب بھی دل نہیں تمہارے پاس پڑا رہتا تھا۔ اب تو خیر بات ہی اور ہے“ وہ تمہید باندھ رہی تھیں انوشہ کے کان کھڑے ہو گئے۔

”تم جس اذیت اور کرب سے گزر رہی ہو اور گزر رہی ہو مجھے اس کا اندازہ ہے اس کے باوجود تمہارے بابا جانتے ہیں کہ تمہاری شادی کر دی جائے۔“

”کیوں.....؟ کیا بابا کو میں زندہ چلتی پھرتی اچھی نہیں لگتی؟“ کتنی بدتمیزی سے فوراً جواب دیا تھا اس نے نہت بیگم گڑ بڑا کر کہہ گئیں۔

”نفرت ہے مجھے مرد ذات کے نام سے شدید نفرت ہے مجھے شادی کے لفظ سے۔ اچھی یا بُری جیسی زندگی بھی میرے رب نے میرے نصیب میں لکھ دی ہے مجھے قبول ہے بنا کسی کے ساتھ کسی کے سہارے کے بھی آپ.....“ وہ اتنی تلخ ہو جائے گی انہیں اندازہ نہیں تھا۔ انوشہ اب رخ پھیرے آئے پر اپنا قبیلہ غبار نکال رہی تھی۔

نہت بیگم مایوس ہو کر جمال صاحب کے پاس کمرے میں چلی آئیں۔ انوشہ کا بیٹا ان کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

”نماز پڑھ لی.....؟“

”ہوں..... مسجد جانے کی ہمت نہیں تھی اس لیے گھر پر ہی ادا کر لی انوشہ کیا کر رہی ہے؟“

”ناشتا بنا رہی ہے..... آج تو اس نے بھی نماز ادا کی ہے۔“

”ماشاء اللہ! وہ پاک پروردگار چاہے گا تو آہستہ آہستہ دل کے سارے چالے صاف ہو جائیں گے اس کے۔ میں ہر نماز میں اس کے لیے خصوصی دعا کرتا ہوں تم بھی دعا کرنا بیگم! کل سرمد بیٹا آئے تو اسے وہ پسند آ جائے میں اب زیادہ دن اسے بے سرائیں دیکھ سکتا۔“

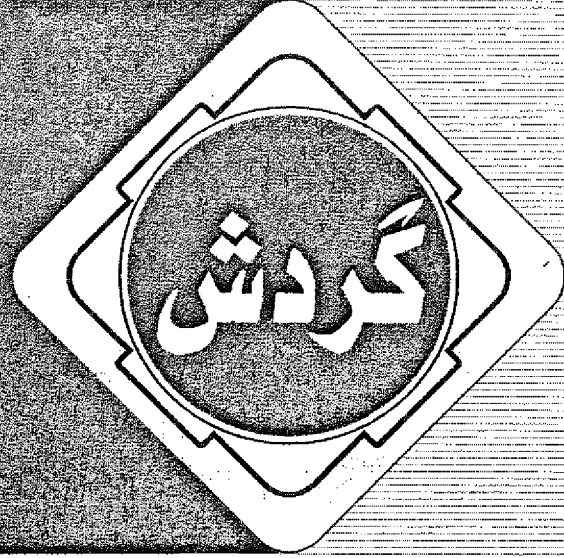
”میں بھی نہیں دیکھ سکتی مگر وہ بہت ضدی ہے میرا خیال ہے اس بار اگر اس کے ساتھ زبردستی ہوئی تو وہ برداشت نہیں کرے گی۔“

”تمہاری بات ہوئی ہے اس سے؟“



ہے ان کے باوجود قارئین کے دلوں کی دھڑکن بے ترتیب کرنے والی سلسلہ وار کہانی

خیر و خیریت سے لے کر شرف و دلچسپی لے کر ایک منظر کا لاکھ لاکھ مناظر و حالات



ایک آشفتمبرو جوان کی سرگزشت و زندگی سے بھی لڑ رہا تھا اور موت سے بھی نہرواڑا تھا۔ عام لوگوں کی نظر میں وہ مسیحا تھا اور کئی انسانیت کی خدمت اس کا فرض اور پیشہ تھا اس نے اپنا تن من و دھن لوگوں کو موت کے منہ سے نکالنے کی مہم میں لگا رکھا تھا کہ اچانک حالات کی گردش نے اسے موت کے سوداگروں کے مقابل لاکھڑا کر دیا اور وہ خود کو موت کے شکنجے سے بچانے کے لیے اپنے دشمنوں کو موت لہانے پر مجبور ہو گیا۔

اگرچہ یہ نثر نگار کے لیے لکھی گئی ہے مگر اس کا لکھنا ایک عظیم الشان کام ہے

بہت جلد نئے افق کے صفحات پر ملاحظہ فرمائیے۔

”ہاں! وہ کسی طور دوبارہ شادی کے حق میں نہیں ہے۔“

”باگل ہے وہ تم نے سمجھایا نہیں اسے؟“

”سمجھایا تھا مگر بے جب بڑے ہو کر کندھوں تک آجائیں تو پھر انہیں کچھ بھی سمجھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے جمال! میرا نہیں خیال کہ اس بار وہ کسی بات پر سمجھتا کرے گی۔“

”اچھا! اللہ بہتر کرے گا تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے ابھی وہ ذہنی طور پر ٹھیک بھی تو نہیں ہے وقت کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“

نزہت بیگم خدشات کا شکار تھیں جمال صاحب اپنے تیزی سے بچنے کی طرف متوجہ ہو گئے۔



بارش خوب برس رہی تھی۔ کھلے آسمان کے نیچے وہ تن تنہا کھڑی موسم کی ہولناکی کا نظارہ کر رہی تھی جب اچانک اس نے دیکھا کہ بادلوں کی گرج کے ساتھ آسمان پر دراڑیں پڑنا شروع ہوئی تھیں وہ خوف کے مارے سہم کر اندر کی طرف بھاگی مگر تب تک آسمان کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر زمین پر آ پڑا۔

آسمان کے ٹوٹنے کے ساتھ ہی زمین سے بادلوں تک پانی کی دیوار بن گئی اور یوں لگا جیسے دنیا پانی میں گھر کر رہ گئی ہو ہر طرف چیخ و پکار شروع ہو گئی تھی۔ گوری نے لوگوں کے ساتھ اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا اسے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ یہ پل بھر میں کیا ہو گیا تھا۔

لوگ قیامت قیامت کا رہے تھے اس کا دل جیسے خون میں ڈوب کر رہ گیا بس اتنی جلدی اختتام ہو گیا تھا دنیا کا؟ اتنی سی زندگی تھی اس کی؟

وہ بھاگتی جاتی تھی اور خوف سے روتی جاتی تھی کسی کو نہیں پتا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے عجیب افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم تھا زمین اُدھڑنے لگی تھی قائلین کی مانند ستمی جاری تھی نیچے گہرے کھداناں اور آگ کا سمندر تھا اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے ابھی اسے زور کی ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل گری تھی اسی اثناء میں منظر بدلا تھا اور اس نے اپنے سامنے سفید لباس میں ملبوس ایک نورانی چہرے والے نیک بزرگ کو دیکھا تھا۔ وہ بیچ پر کچھ پڑھ رہے تھے اور گوری مٹی سے بے حال ان کے سامنے زمین پر اوندھے منہ گری زار و قطار رو رہی تھی۔ بزرگ نے آنکھیں کھول کر ایک نظر اسے دیکھا تھا پھر بارعب آواز میں بولے تھے۔

”اب کیوں روتی ہے بچی! اب تو عمر کی نقدی ختم ہو چکی اب اگلے سفر کا سوچ۔ یہ دنیا تو صرف بازار تھی جس میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے تمہیں دوسرے اربوں لوگوں کے ساتھ عمر کی مخصوص نقدی دے کر بھیجا تھا کہ جا! دنیا کے بازار سے اپنی آخرت کے لیے کچھ خریدا! کیا خریدا تو نے؟ عمر کی ساری نقدی خرچ کر کے اپنی آخرت کے لیے کیا خریدا؟ نیکی یا بُرائی؟ آخرت کی فکر اگر ابی دین کی معلومات ہے دین کا علم یا دنیا داری؟ جہاں تک اپنے گریبان میں اور دیکھ اپنی جھوپ کی طرف صرف دنیا داری خریدی تو نے؟ عمر کی ساری نقدی خرچ کر کے کہا تو کیا کیا؟ صرف دنیا داری؟“ بزرگ کی آواز میں جلال تھا وہ مزید بلک بلک کر رو پڑی۔

”دنیا والوں کی پروا کی تو نے ان کی خوشنودی کا خیال رکھا ان کی پروا کی اپنے رب کا کیوں نہیں سوچا جس

نے تجھے دنیا کے بازار میں خریداری کے لیے بھیجا تھا اپنی آخرت کی فکر کیوں نہیں ہوئی تجھے..... کس گمان میں اپنے اصل سے غافل رہی تو بول..... ”وہ کیا بولی بولنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔“

”اب کیوں روتی ہے اب تو اختیار میں کچھ بھی نہیں عمر کی ساری نقدی سارے ماہ و سال خرچ ہو چکے۔ بھٹک گئی تو بھی دنیا کے اس بازار میں اب کس بات کا تم؟ دنیا والوں سے امید رکھی تھو نے رشتوں کی ڈوری میں الجھ کر دنیا کی طرف دیکھا اپنے رب کی طرف کیوں نہیں دیکھا جس کا درمیشہ کھلا رہتا ہے جہاں ہمیشہ واپسی کا انتظار ہوتا ہے عمر کی نقدی تک تجھے واپسی کا خیال نہیں آیا اب جب اس نے ڈوری کھینچ کر واپس بلا لیا تو روتی ہے اسے اعمال پر غم کرتی ہے بڑی بد نصیب ہے تھو..... بزرگ کے جلال میں کوئی فرق نہیں آیا تھا گوری کی آنکھ کھل گئی۔

آدھی رات کے اس پہر میں اس کا سارا وجود پسینے سے شرابور ہو چکا تھا بدن پر ایک عجیب سی لپکپی طاری تھی یہ کیسا خواب تھا؟ کیسی آگہی تھی؟ دنیا کے بازار..... عمر کی نقدی کی کیا گہائی تھی؟

وہ کیا نقصان تھا جس کا احساس اسے خواب میں دلایا جا رہا تھا؟ وہ کچھ دیر بستر پر بیٹھی سہمی رہی پھر پانی پینے کے لیے اٹھی تو دوبارہ مینڈی نہ آئی دن بھر کام میں مصروف رہنے کی وجہ سے کتنی تھک کر سوئی تھی مگر اس عجیب و غریب خواب نے کتنا لے چین کر دیا تھا اور یہ پہلی بار تو نہیں تھا ابلی اماں کے گھر بھی وہ ایسے خوابوں کی زد میں رہی تھی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟

شہر آنے کے بعد وہ بہت بدل گئی تھی خود کو مصروف رکھنے کے لیے بہت سے کام ڈھونڈ لیے تھے اس نے مگر سکون تھا کہ ابھی بھی دسترس سے دور تھا۔

فجر کی نماز میں ابھی کافی وقت تھا وہ وضو کر کے جائے نماز پر آ گئی مختلف سوچوں اور ذہن میں بھٹکتے ڈھیروں خیالات کے ساتھ جیسے تیسے اس نے تہجد کی نماز ادا کی۔ لی اماں بارہ نفل پڑھتی تھیں اس سے صرف آٹھ ادا ہو سکے تھے نماز کی ادائیگی کے بعد ہاتھ دعا میں اٹھے تو صرف ایک ہی دعا بولیں پڑائی۔

”اے میرے مالک! مجھے اس روندی ہوئی دنیا سے بے نیاز کر دے میں ان میں سے نہیں ہوں جن کے لیے یہاں سکون ہے مجھے یہ دنیا داری نہیں چاہیے میرے مالک! مجھے وہ راستہ دکھا جو خیر اور نجات کا راستہ ہے۔ میں بُرائی اور بُرائی پھیلائے والوں سے بے نیاز ہوں میرے ہر دانستہ و غیر دانستہ فعل کو پاک کر دے مالک! میری زبان ہاتھ اور نفل کے شر سے ہر کسی کو محفوظ رکھ (آمین)۔“ شفاف موتیوں کی طرح آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے گالوں پر بکھر رہے تھے اور وہ روتی جا رہی تھی۔



مجھ سے چھڑ کے تھو بھی نہ پائے گا کبھی چین  
آئیں گی یاد میری وفا میں تمام عمر  
تجھ پر تھا اعتبار مگر اب نہیں رہا  
اب غیر کو دکھانا ادائیں تمام عمر  
ایان مل گیا تھا۔ وہ خوشی سے بے حال ہوئی اسے اپنی ماں کے پاس لے آئی۔ اسی اثناء میں اس کے سیل

نے بیٹری ختم ہونے کا سگنل دیا تھا اس نے تیزی سے یہ قطعہ ٹاپ کیا اور عباد کو بھیج کر موبائل بند کر دیا۔  
دل تھا کہ بھائی مل جائے کی خوشی کے باوجود جیسے غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ وہ اسپتال سے نکل آئی۔ ارادہ گھر جا کر سب کو ایان کے مل جانے کی خوش خبری سنانے کا تھا مگر قدیم تھے کہ مزید چلنے سے انکاری ہو گئے تھے بہت مجبور ہو کر اسے رکشہ لینا پڑا تھا۔ وہ زندگی میں بہت کم روٹی تھی مگر اس وقت جانے کیا ہوا تھا کہ آنسو بھل بھل بہ رہے تھے۔

”واہ ری غربت! تجھے کسی کی خالص محبت بھی نصیب نہیں۔“  
”کہاں جانا ہے لی بی؟“ رکشے والے کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی اور جانے کس بے خیالی میں اس کے لبوں سے نکلا تھا۔  
”ساحل سمندر.....“

پھٹ پھٹ کی تیز آواز کے ساتھ رکشہ چلتا رہا اور وہ خود میں کھوئی رہی ہوش اس وقت آیا جب رکشہ ڈرائیور نے ساحل کے قریب لا اُتارا۔

”ایک سو پچیس روپے ہو گئے باجی!“  
”ایک سو پچیس؟“ حقیقی معنوں میں وہ اب چوکی تھی۔  
”ہاں جی ایک سو پچیس افارسی میں بولوں کیا؟“

دن بھر مشقت سے اکتایا رکشہ ڈرائیور تپا تھا۔ صاعقہ اپنی بے خبری پر جی بھر کے پچھتائی، منھی میں پکڑے پیسوں کی کتنی کرنے لگی، کل دو سو روپے تھے اس نے ایک سو پچیس نکال کر رکشہ والے کو تھما دیے۔ رکشہ پھٹ پھٹ کرتا آگے بڑھ گیا جب کہ وہ ہونٹ سی وہیں کھڑی رہی۔

”کیوں آئی ہوں میں یہاں بھلا میرا یہاں کیا ہے؟“ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی وہ سمندر کے قریب چلی آئی۔ اسے لگا جیسے سمندر کی ہل رہی اس پر ہنس رہی ہو۔

”سوری..... میں آپ کو نہیں جانتا..... اُف کتنی اذیت تھی اس ایک جملے میں کاش! وہ کسی کو بتا سکتی۔“ وہ سُن سی گھٹنوں کے گرد بازو پلٹ کر بیٹھ گئی۔

”آپ کو کیا لگا میں آپ کے منہ سے اصل حقیقت جان کر آپ سے نفرت کرنے لگوں گا؟ دو حرف بھیج کر چلا جاؤں گا“ اس نے اور میرے تعلق کو اتنا سستامت کریں صاعقہ! چلیز.....“ وہ کہیں قریب ہی سے بولا تھا۔ وہ سر اٹھاے سمندر کی لہروں کو دیکھتی رہی۔

”تم باز نہیں آؤ گی ناں صاعقہ! مت چو وہ راہیں جن پر چل کر پچھتانا پڑے ڈُل کلاس گھرانے کی لڑکی ہو تم لوڑ ڈُل کلاس گھرانے کی جہاں صرف خواب دیکھے جاتے ہیں ان کی تعبیر پانے کی ضد نہیں کی جاتی۔“ کتنی بلند باز گشت تھی سمندر کی لہروں کی وہ اچانک پھٹ پڑی۔

”کیوں..... کیوں ضد نہیں کی جاتی۔ ڈُل کلاس گھرانے کی لڑکیاں کیا انسان نہیں ہوتیں ان کے سینے میں کیا دل کی جگہ بچہ ہوتا ہے؟ کیوں بانٹ دیا ہے محبت کو گھرانوں میں؟ کوئی اپنی رضا سے نصیب لکھوا کر لاتا ہے اپنے؟ کیوں روند دیا ہے معاشرے نے انسانوں کو اسٹیشن میں بانٹ کر؟ ڈُل کلاس گھرانے کی لڑکیاں

کہاں جائیں؟ کیوں پتھر سے بنا کھلونا سمجھ لیا ہے لوگوں نے مڈل کلاس گھرانے کی لڑکیوں کو کیوں.....“  
 ساحل سمندر پر اس وقت زیادہ رش نہیں تھا لہذا کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ سمندر کی تسخراڑاٹی لہریں اب بھی اس پر نہیں رہی تھیں اس نے اشتعال میں آ کر کئی پتھر اٹھائے اور سمندر کی طرف اچھال دیئے۔  
 ”صرف مڈل کلاس گھرانوں کی میراث ہے یہ محبت سنا تم نے۔ ابر کلاس گھرانوں کی لڑکیاں یہ روگ نہیں پالتیں سو چلیے ہوتے ہیں ان کے پاس خود کو مصروف رکھنے کے لیے نوکریاں، کلب، نیٹ دوست اور نہیں تو ملک چھوڑ کر چلی جاتی ہیں وہ مگر..... مڈل کلاس گھرانے کی لڑکی تو کہیں جا بھی نہیں سکتی۔ ایک ایک محبت کو سنبھال کر اٹائے کی طرح رکھتی ہے خواب دیکھتی ہے اور ٹوٹ جانے پر خاموشی سے اپنی ذات کی کرچیاں چن لیتی ہے کوئی وہایا نہیں کرتی، کسی کلب، کسی انٹرنیٹ، کسی پارٹی میں سکون نہیں ڈھونڈ سکتی وہ چھوٹی سی چار دیواری ہوتی ہے اور احساسات کا رستا بھوتا ہے بس کون قدر کر سکتا ہے مڈل کلاس لڑکی سے بڑھ کر محبت کی بولو..... ہے کوئی جواب تمہارے پاس؟“ اس بار پھر وہ چلائی تھی جواب میں سمندر کی لہریں خاموش ہو گئیں۔

”بہت اذیت ناک ہے یہ غریب ہونا بھی نہ خودداری رہتی ہے نہ قدر۔ کاش! تم ادھوری تمناؤں کی اس اذیت کو سمجھ سکتیں، مگر میں یہ اذیت ساتھ لے کر نہیں چلوں گی اس نے فریب کیا ہے تو کیا؟ مجھے اپنی قدر بے صاعقہ سو بار لغت بھیجتی ہے ایسے دکھ اور ایسی محبت پر سنا تم نے..... کبھی ٹوٹا ہوا نہیں دیکھو گی تم مجھے، کبھی نہیں.....“ وہ چلا رہی تھی اور زار و قطار رو رہی تھی۔

”مڈل کلاس گھرانے کی لڑکی ہوں جانور تو نہیں ہوں نا پھر کیوں کیا اس نے میرے ساتھ ایسا آخر کیوں؟“ اذیت بھی کہ کسی طور کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

”کیوں کہا اس نے کہ اسے میرے غریب ہونے سے فرق نہیں پڑتا اسے کیا پتا کیا ہوتی ہیں مڈل کلاس گھرانے کی لڑکیاں۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے ترتی نا جائز باتوں پر بھی بُری طرح پتی..... آہ!“

سورج ڈوبتا جا رہا تھا۔ وہ مغمو می اٹھ کھڑی ہوئی۔

چھڑنے کی اذیت کو

اگر تم جانتا چاہو

تو کچھ بل کو ذرا یہ سانس اپنی روک کر دیکھو

تمہیں محسوس یہ ہوگا

چھڑنا ”موت“ جیسا ہے



”کیا بات ہے عبادا پریشان دکھائی دے رہے ہو؟“

وہ دوا لینے کے بعد گاڑی میں آ کر بیٹھا تھا جب اسے خاموش پا کر ہادیہ نے پوچھا عباد بنا کوئی جواب دیئے خاموشی سے گاڑی اشارت کرنے لگا۔

”بتاؤ نا! کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں یاد دوست کی وجہ سے پریشان ہوں اس کی مہا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”ایک تو تم بھی ناں! چن چن کر دھی دوست بنا رکھے ہیں تم نے۔“ اس بار وہ پھر خاموش رہا۔

”اب میں ایسے موڈ کے ساتھ مارکیٹ نہیں جاؤں گی بس گھر چلو۔“ وہ غفا ہوئی تھی عباد نے خاموشی سے

گاڑی گھر کے راستے پر ڈال دی۔

”تم بہت بُرے ہو عبادا! کبھی بھی شدید نفرت محسوس ہونے لگتی ہے مجھے تم سے۔“ اب وہ غبار نکال رہی تھی

عبادہ نوز خاموش رہا۔ وہ دل جلاتی رُخ پھیرے بیٹھی رہی۔

”جانے کیوں مجھے لگتا ہے جیسے کہیں پر کچھ غلط ہے تم کچھ چھپا رہے ہو مجھ سے یاد رکھنا عبادا! اگر تم نے مجھ

سے کچھ غلط کیا تو میں کبھی تمہیں معاف نہیں کروں گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ جیسے بہت پریشان تھا۔

ہادیہ شدید غم و غصے کا شکار ہوئی گاڑی رکنے پر ایک جھٹکے سے نکل گئی۔

وہ گاڑی لاک کر رہا تھا جب اسے صاعقہ کا منیج موصول ہوا۔ دل کو کھینچ لینے والا قطعہ تھا۔ اس نے فوراً

کال بیک کی مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بے ساختہ گاڑی کے بونٹ پر زور

دار مار کر سید کیا۔

”کیوں کیا میں نے اس کے ساتھ ایسا؟ کیوں اتنا کمزور پڑ گیا میں؟ کیوں؟“ اپنے عمل اپنی حرکت پر اب

اسے پچھتاوا ہو رہا تھا مگر.....

”مجھے معاف کر دو میں بہت شرمندہ ہوں۔“

اگلے ہی بل وہ بڑبڑایا تھا مگر یہ پچھتاوانی الحال اس کی بے چینی کو کم کرنے میں کسی طور معاون

ثابت نہ ہو سکا۔

اسے خبر ہی نہیں تھی کہ آنے والے دن اسے مزید کیا کیا دکھانے والے ہیں۔



”سانول! تو یہاں۔“

”ہاں آ پا! حوصلی چھوڑا یا ہوں میں۔“

”ہائے اور پا! مگر کیوں.....؟“

”بس غلامی نہیں کر سکتا میں کسی کی۔“ وہ شکستہ دکھائی دے رہا تھا۔

آپا جو سانول کی پھوپھی تھیں اور خاندان میں برابر کا رشتہ نہ ملنے کے جرم کی پاداش میں کنواری ہی بڑھا پے

کی دہلیز پر آ بیٹھی تھیں آ زردہ ہو گئیں۔

”بہت خراب ہے تو سانول! بچپن سے جانتی ہوں تجھے میری ہی گود میں پل کر جوان ہوا ہے کیسے

نہیں جانوں گی پھر مگر دیکھ سانول! زندگی کے ہر معاملے میں اگر نہیں چلتی۔“

”خدا را پھوپو! مجھے کچھ بھی سمجھانے کی کوشش مت کرنا آپ جانتی ہوں میں کبھی بیٹھے آنے کی روٹی



نہیں کھانا، وہ تو پھر لڑکی ہے جو دو روز گھر سے باہر گزر کر برآمد ہوئی ہے، نہیں چاہیے ایسی بچپن کی منگ اور اس کے ساتھ زمین جائیداد۔ میرا پہلے ہی دل نہیں تھا اُدھر بھائی کو بول میرا حصہ مجھے دے دے۔“ کچھ بھی سننے پر آمادہ نہیں تھا وہ پھوپھو پر بخیرہ کی سر جھکا گئیں۔

”اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا سانول! جو زیادہ اکر کر چلتا ہے وہ جب ٹوٹتا ہے ناں تو ٹوٹنے کی تکلیف برداشت نہیں ہوتی اس سے خدا کا واسطہ ہے تجھے زندگی کے ساتھ بھجوتا کرنا سیکھ لے ورنہ بہت پیچھتائے گا۔“

”کہاناں پھوپھو! کوئی نصیحت نہیں اپنا حصہ تو میں لے کر رہی رہوں گا چاہے کچھ ہو جائے۔“ وہ اشتعال کا شکار ہو رہا تھا۔ پھوپھو بے بسی سے اس کا منہ دھکتی رہ گئیں۔

اسی شام انہوں نے حویلی جا کر بہنو کے بڑے بھائی سے بات کی تھی اور انہیں ہر ممکن طور سے سمجھانے کی کوشش کی مگر نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا تھا۔ دونوں بھائی اپنی اپنی ضد پر اڑتا تھے، نتیجتاً سانول شاہ نے حتمی قدم اٹھالیا۔ دوست تو گاؤں میں بھی کم نہیں تھے اس کے، پھر بھی شہر سے کئی غنڈے بلوائے تھے اس نے تاہم اس کے اقدام کی خبر اس کے بھائی کو ہو گئی تھی اور اس نے بھی طیش میں آ کر تیاری مکمل کر لی۔

آپا کی نہ پہلے کوئی اہمیت تھی نہ اس وقت ہی وہ کچھ کر سکیں۔ وہ چوہدری خاندان جس نے صرف بے بس نادار لوگوں پر ظلم کرنا سیکھا تھا اب اسی کا تماشہ لگا تھا اور گاؤں کے بے بس نادار لوگ تماشائی تھے۔

دونوں طرف برابر کی جنگ تھی کہ اچانک منظر بدل گیا۔

سانول شاہ کے بھائی کے پستل سے نکلنے والی دو گولیاں جو سانول کے وجود میں اترتی تھیں، ساری کہانی کا پانسہ پلٹ گئی تھیں۔ دونوں طرف طاقت کا تصادم تھا اور اس تصادم میں ہار سانول شاہ کا مقدر بن گئی تھی۔

❖ ❖ ❖

”اب گڑیا کی طبیعت کبسی ہے؟“

رات بھر جاگ کر اپنی بیٹی کے سر ہانے بیٹھے رہنے کے بعد وہ صبح تھوڑی دیر کے لیے کمرے سے باہر گیا تھا جب امامہ نے اس سے پوچھا۔ وہ رات دیر تک گڑیا کے پاس بیٹھ کر اسے مختلف کہانیاں سناتی رہی تھی۔ کل فجر سے لے کر پورا دن اور پوری رات گڑیا نے اسے اپنے ساتھ ہی مصروف رکھا تھا۔ اس اثناء میں کئی بار ارسلان کا فون آیا تھا اور اس نے اسے شجاع کو وہ دوا دینے پر مجبور کیا تھا جو اس نے خود امامہ کو دی تھی۔

جانے کیا بات تھی کہ کل سے اب تک وہ اسے ٹال رہی تھی شاید گڑیا کی طبیعت کی وجہ سے مگر اب جب کہ وہ خفا ہونے لگا تھا تو اس نے ہمت باندھ لی۔

قدرت اللہ صاحب ابھی کمرے سے نہیں نکلے تھے اس نے شجاع کو کچن میں ہی روک لیا۔

”پہلے سے بہتر ہے۔“

بناس کی طرف دیکھتے وہ جواب دے کر کچن سے نکلنے لگا تھا جب اس نے پھر پکار لیا۔

”سنیں! میں ناشتہ تیار کر رہی ہوں پلیز آج کر کے جائیے گا۔“

”کوئی ضرورت نہیں اس گھر میں ہر کام کے لیے لازم موجود ہیں آپ کو کسی بھی رحمت کی کوئی ضرورت

نہیں مس امامہ! ہاں اباجی چیک اپ کے لیے آپا کے ساتھ ہی بیرون ملک جا رہے ہیں، ہفتہ دو ہفتہ کے لیے ان کا سامان بیک کر دیتے گا۔ دوپہر میں گاڑی آئے گی انہیں لینے۔“

”آپ نہیں آئیں گے۔“ اس کے احکامات کے جواب میں فوری اس نے پوچھا تھا جب وہ بولا۔

”نہیں.....“ اور وہ مایوس ہو کر رہ گئی۔

دوپہر سے پہلے ہی فائزہ آپا سے ملنے چلی آئیں۔ وہی ان کا بیاروہی شجاع کی باتیں اور وہی اسے بار بار اپنا خیال رکھنے کی ہدایت، وہ عورت مجسم بیاروہی۔ امامہ کو ان سے باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ وہ رخصت ہو گئی تھیں قدرت اللہ صاحب بھی جاتے ہوئے اسے خوب پیار کر کے گئے تھے۔ وہ لگتی ہی دران کے جانے کے بعد آ زردہ سی بیٹھی رہی پھر ارسلان کی کال آ گئی تو نئے سرے سے بے کلی کا شکار ہو کر رہ گئی۔

شجاع شام میں جلد لوٹ آیا تھا وجہ گڑیا کی طبیعت کی خرابی تھی، وہ کھانا کھا کر آیا تھا۔ امامہ نے اسے شربت کا گلاس اٹھمایا۔

”تھک کر آئے ہیں میرے ہاتھ کا پانی تو پی ہی سکتے ہیں آپ۔“

شجاع کے دیکھنے پر اس نے فوری وضاحت دی تھی جواب میں وہ گلاس تھام کر ایک ہی سانس میں خالی کر گیا۔

”شکریہ!“

مشروب پی کر فوراً اٹھتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا جب کہ وہ گہری سانس بھر کر باہر لان کی طرف چلی آئی جہاں اس نے ارسلان کو کال کی تھی۔

”ہیلو ارسلان! خوش ہو جاؤ، میں نے شجاع کو وہ دوا پلا دی۔“

”شاباش! کب پلائی؟“ فوری کال پک کرتے ہوئے وہ بے تحاشا خوش ہوا تھا۔ جب وہ بولی۔

”ابھی دو منٹ پہلے، بتاؤ اب کیا کرنا ہے؟“

”انتظار! ایس پی شجاع حسن کی موت کا انتظار۔“

”کیا مطلب؟“ اس کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔ دوسری طرف وہ دل کھول کر ہنسا۔

”مطلب تھوڑی ہی دیر میں اس کی زندگی کا چراغ گل ہو جائے گا، کیونکہ تم نے اسے بے ہوشی کی دوا نہیں

زہر پلایا ہے جان! اب دیکھنا ساری کہانی ٹھیک ہو جائے گی۔“

وہ خوش ہو رہا تھا۔ امامہ کے ہاتھ سے موبائل گر پڑا۔ یہ کیا ہو گیا تھا اس کے ہاتھوں۔ وہ چکراتے سر کو تھامتی وہیں بیٹھ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ انشا اللہ)



# محبت کی صورت

غزالہ عزیز

دلوں میں دوریاں اتنی نہیں تھیں  
بظاہر ہم میں جتنے فاصلے تھے

اسے معلوم کیا، ہم اس کی خاطر  
چراغوں کی طرح شب بھر جلے تھے

”کسی سراب کے پیچھے بھاگتے رہتا جبکہ منزل ملنے کی امید بھی نہ ہو تو کیا یہ اپنی قیمتی زندگی کا زیاں نہیں.....؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم انسان ناممکن کو ممکن بنانے کی لالچ حاصل سعی کرنے کے بجائے سمجھوتا کرتے ہوئے کسی ایسے بڑھے ہوئے ہاتھ کو قہام لیں جو پورے خلوص اور محبت کے ساتھ ہماری جانب بڑھایا گیا ہو؟“ میں نے شاکی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ جو ساحل سمندر پر ہوا کے سرد جھونکے سے جھرجھری لیتے ہوئے دونوں یازدوں کا حصار اپنے گرد بے خیالی میں باندھ رہی تھی شاید سردی کے شدید احساس کو زائل کرنے کے لیے..... مگر اس کی اس بے دھیانی پر مجھے غصہ آنے لگا کہ وہ اتنی بڑی بڑی باتیں اتنی آسانی سے کیسے کہہ جاتی ہے؟ کیا میرا دل، میرا نقصان اتنا چھوٹا اور بے معنی ہے کہ وہ مجھے سلی بھی ایسے دے رہی ہے جیسے محبت کرنا، اسے کھونا اور ہنستے ہوئے یہ کہہ کر آگے بڑھ جانا کہ ”یہی ہماری تقدیر میں درج تھا کہ وہ ہمارے نصیب کی نہیں تھی۔ تو معید حسن! تم بھی اسے بھول کر

خوابوں کی ریت اڑاتے ہوئے کسی اور منزل کی جانب آگے بڑھ جاؤ۔“ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ ان دنوں میں کس ذہنی اذیت سے گزر رہا تھا اور وہ مجھ سے سیر اعلیٰ کو بھول جانے کی بات کر رہی تھی تب میں نے طنز یہ لہجے میں کہا تھا۔

”ہاں! تم تو یہی کہو گی۔ تمہارے لیے یہ سب کہنا بہت آسان جو ہے حالانکہ تم میری بہترین دوست ہو۔ مجھے تم سے ہرگز یہ امید نہیں تھی کہ تم بھی سب گھر والوں کی طرح مجھے سب کچھ بھول جاؤ یا مٹی پاؤ کا سبق دو گی؟“ میں سچ مچ اس سے ناراض ہو گیا۔

”پلیز معید حسن! میرا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا۔ نا ہی میں تمہیں اسے بھول جانے کے لیے کہہ رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں، کسی کو بھول جانا۔ وہ جو آپ کو اس دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہو، آسان نہیں ہوتا۔“ وہ بہت دھیمے دھیمے اور افسردہ لہجے میں کہہ رہی تھی اور میں یک دم ہی اس کے انداز ہی نہیں لفظوں کی اداسی پر بھی ٹھنکا تھا۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ واقعی وہ میرے لیے افسردہ اور دکھائی

دے رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ سر اٹھا کے براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ کر بات کرے مگر وہ سر جھکائے شاید ہمارے قدموں کے نیچے اچھلتی کودتی لہروں کو دیکھ رہی تھی۔ بہر حال مجھے اس کے ان چند لفظوں نے ہی دلاسا دیا تھا۔

”میں تو صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ تمہارے سوگ منانے یا پڑھائی کے ساتھ ساتھ تمام ضروری کاموں کو چھوڑ دینے سے اگر میرا اعلیٰ تمہیں مل جائے گی تو ضرور ایسا کرو مگر ایسا سب کچھ کرنے کے بعد بھی میرا اعلیٰ تمہیں نہیں ملے گی۔ اسے تمہاری طرف لوٹنا ہوتا تو کبھی اپنے ماں باپ کے طے کردہ رشتے پر سر جھکا کے چپ چاپ کسی اور سے شادی پر تیار ہرگز نہیں ہوتی اور بد قسمتی سے ایسا ہو چکا ہے۔ وہ کسی اور کی ہونے جارہی ہے۔ اب تمہارا اس پر کوئی حق نہیں رہا پھر اپنی زندگی برباد کرنے پر کیوں بغض ہو معید حسن!“ اس بار وہ سر اٹھا ئے خفا نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور نجانے اچانک مجھے کیا ہوا کہ بے اختیار سامنے کھڑی اس کاٹنی سے لڑکی کے دونوں بازو اپنی مضبوط گرفت میں جکڑتے ہوئے انتہائی طیش کے عالم میں بولا۔

”یہ سب تم اس لیے کہہ رہی ہونا کہ تم نے خود کبھی محبت نہیں کی۔ تم بے حس ہو مایا! تم پتھر کی طرح سخت اور برف کی طرح سرد احساسات کی مالک ہو ورنہ اس تکلیف کی گھڑی میں تم میرے ساتھ بیٹھ کر یہاں نصیحتیں کرنے کے بجائے میرے دکھ میں میرے ساتھ مل کر روئی نظر آتیں۔“ پھر میں نے جھٹکے سے اسے برے دھکیلا تھا۔ وہ شدید حیرانی اور دکھ کے ساتھ مجھے ساکت کھڑی دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھیں..... اس وقت اس کی آنکھوں میں میرے لیے صرف دکھ نہیں بلکہ کچھ اور بھی تھا۔ میں نے

چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا مگر وہ یک دم بی وہاں سے بھاگتی ہوئی میرے احساسات کو چھوٹی بہت دور نکلتی چلی گئی۔ میں وہیں ساحل پر ساکت کھڑا تھا۔ یکا یک پانی کی زوردار لہر نے میرے قدموں کو ڈمگایا تو میں بوس کی دنیا میں واپس آ کے بے اختیار ہی اس کے قدموں کے نشانوں پر قدم رکھتا کسی تھکے ماندے مسافر کی طرح سڑک کے کنارے کھڑی اپنی گاڑی کی جانب چل دیا۔

سست رفتار میں گاڑی چلاتے ہوئے میرا دماغ اس تھکی میں الجھ کر رہ گیا کہ اچانک مایا کو کیا ہو گیا؟ ٹھیک ہے میں یک دم بہت الجھ ہو گیا تھا اس کے ساتھ لیکن اگلے لمحے اپنی شدید زیادتی کا احساس ہوتے ہی میں اس سے معذرت کرنا چاہ رہا تھا لیکن وہ..... مجھے سمجھ نہیں آ رہا۔ مایا نے ایسا رد عمل کیوں دیا اور اس کی آنکھیں..... اس کی آنکھوں میں اس لمحے کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس پریشانی میں مجھ سے کوئی حادثہ سرزد ہوتا۔ میں نے پوری توجہ راہیونک پر مرکوز کرتے ہوئے ذہن کو ہر شے سے آزاد کر دیا۔ مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اس روز کے بعد مایا سے کبھی نہیں مل سکوں گا۔ میری بہترین دوست مجھے چھوڑ کے اور مجھ سے خفا ہو کر جانے کہاں چلی گئی؟



”یہاں رہ کر کوئی تمنا کرنا سے بہتر ہے کہ تم عرفان کے پاس برطانیہ چل جاؤ۔ تمہارے ویزے اور ٹکٹ کا انتظام ہو چکا ہے۔“ ابو نے اس سے پہلے کبھی مجھ سے اتنے سخت اور دونوک لیے میں بات نہیں کی تھی اور میں جوان کی طرف سے تسلی یادلا سے کی امید کر رہا تھا، ان کے بے رحمانہ فیصلے پر غصے میں آ گیا۔ وہ جانتے تھے کہ اس وقت مجھے سب گھر

والوں کی ہمدردی کی ضرورت ہے مگر انہوں نے تو جیسے میرے لیے سزا تجویز کر دی تھی۔ اسی لیے میں بھی غصے میں پھرا تھا۔

”میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ ہرگز نہیں جاؤں گا۔“

”جب تک تم ہماری عزت کا جنازہ نہیں نکال دیتے۔ خاندان بھر میں ہمیں ذلت اور رسوائی سے دوچار نہیں کر دیتے۔“

”ابو میں تو صرف.....“

”بکو اس بند کرو۔ یہ رشتے داری کا معاملہ ہے۔ ہم بھی بیٹی کے ماں باپ ہیں۔ کسی کی بیٹی کی عزت پر حرف آئے..... ہرگز نہیں! اگر تم سمجھ رہے ہو کہ تم عین سمیرا کی شادی والے روز کوئی قسم کا ہنگامہ کرو گے تو یاد رکھنا میں اپنے ہاتھوں سے گولی مار دوں گا۔“ ابو غصے سے کانپنے لگے تھے۔ تب ہی امی نے تیزی سے انہیں تھام کر صوفے پر بٹھایا تھا۔

”ابو پلیز! میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا.....“

والوں کے اصرار اور امی کی التجا پر مجھے اپنا فیصلہ بدلنا پڑا اور سمیرا کی شادی والے روز، جب اس کا نکاح تھا..... مجھے اچھی طرح یاد ہے اس روز بہت بارش ہو رہی تھی شاید آسمان بھی میرے دکھ پر رو رہا تھا تب میں بارش اور اپنے آنسوؤں میں جھپکتا ایئر پورٹ روانہ ہو گیا۔ جہاز میں بیٹھ کر میں نے عہد کیا تھا کہ اب میں کبھی اس ملک میں لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ وہ ملک جہاں میری محبت نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہی ملک جہاں میری سب سے اچھی دوست مجھ سے روٹھ کر چلی گئی تھی۔



لندن کی بھاگتی دوڑتی اور مصروف زندگی میں میں جلد ہی کھو گیا۔ لندن شہر میں عرفان چاچو کا ذاتی اسٹور تھا۔ انہوں نے رہائش کے ساتھ ساتھ میری نوکری کا مسئلہ بھی جلد ہی حل کر دیا۔ میں تعلیم مکمل نہ ہونے کی وجہ سے دن بھر ان کے اسٹور پر سیکرٹین کی نوکری کرتا۔ شام کو ان کے گھر کے آؤٹ ہاؤس میں آ کر لندن کی راتوں میں خون نمجد کرتی ٹھنڈ سے بچنے کے لیے چمڑے کا لمبا کوٹ پہن کر سڑکوں پر رات گئے تک آوارہ گردی کرنے نکل جاتا۔ بس دنوں، ہفتوں اور مہینوں کے گزرتے میرا یہی معمول بنتا چلا گیا۔ دن بھر کام کرتا اور شام گہری ہونے کے بعد بخ بستہ راتوں کی دھند میں کھو جاتا۔ چاچو مجھے اپنے ریستورنٹ میں مینیجر کی حیثیت سے بھیجتا جاتے تھے مگر میں نے انہیں منع کر دیا تو انہوں نے مجھے اسٹور کا انچارج بنا دیا یوں میری ذمے داری ضرور بڑھی مگر اب پہلے جیسی محنت نہیں کرنی پڑتی تھی البتہ لندن کے معمولات نے مجھے جکڑ لیا تھا مگر یہاں کی آزاد منش زندگی میرے لیے اس ملک تو کیا اس شہر سے بھی قدم باہر نہیں نکالوں گا لیکن گھر





تازہ شماره شائع ہو گیا ہے

ممتاز مفکر و دانشور مشاق احمد قریشی کی زیر ادا رت

## قیمت: 20 روپے

دینی مسائل کا حل: مولانا سعید احمد جلال پوری

روحانی مسائل: حافظ شبیر احمد

خوابوں کی تعبیر: حافظ عبد القیوم نعمانی

اسلام اخوت بھائی چارے اور جذبہ شہادت کی کاغذ ہے۔  
 اسے دین کو جاننا اور سمجھنا ہر مسلمان ہر فرقہ میں ہے۔  
 اسلام ایک کلمہ مضامین و خطابت ہے، یہاں اس کی سمجھنے کی ضرورت ہے۔  
 اس میں غلوں کے گمراہی، ہم غلوں میں غلو یا حاصل کر سکتے ہیں۔  
 ہم ان کی مشکلات کو دھڑکھڑکاتے ہوئے اسلام میں چمکا کر اپنے مسئلوں کو حل کر سکتے ہیں۔  
 جہاں جہاں ہے، ہم لوگوں کو دینی اصلاح میں شہادت دے سکتے ہیں۔

دنیاۓ اسلام کے تمام مسالک متعلق  
علماء کرام کی نگارشات اور آراء پر مشتمل

وہ سب کچھ کتاب جاننا اور پڑھنا چاہتے ہیں

پتا: کمرہ نمبر 7 فرید حیمبرز عبداللہ بارون روڈ کراچی

فون: 35260771/2 فیکس: 35260773

alislamkhi@gmail.com

فراہوش کر چکا تھا۔ میں تو شاید بابا کو بھی فراہوش کر چکا تھا۔ میرا پاکستان جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہاں کے سرد موسم اور ایک دوسرے سے بے گانے اپنی زندگی میں مست بے حس لوگوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے میں بھی شاید جذبات و احساسات سے عاری ہوتا جا رہا تھا۔ چاچو اور چچی جان سے میری خاصی بے تکلفی تھی۔ وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتے تھے اگرچہ چچی جان نے ایک دو بار مجھے شادی کے لیے راضی کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن میرے صاف انکار کے بعد انہوں نے مزید اصرار کرنا چھوڑ دیا ان کے بچے چھوٹے تھے پھر وہ جاب بھی کر رہی تھیں۔ چاچو کے ساتھ مل کر باقاعدہ ریسٹورنٹ کی ساری مینجمنٹ کا کام سنبھال رکھا تھا۔ ان دونوں کی اپنی زندگی کے معمولات بہت لگے بندھے اور مبصر و فہم تھے وہ اس میں مگن رہتے۔ میرے لیے یہی کافی تھا کہ دیارِ غیر میں مجھے نوکری کے ساتھ اپنے سکے رشتوں کا ساتھ بھی میسر تھا۔ بہر حال اگلے روز پاکستان سے آنے والی کال نے میرے ارادے اور فیصلے کی پتھر ملی دیوار میں دراڑ ڈال دی۔

رمشہ کا فون آیا تھا۔ وہ رورہی تھی۔ ابواسپتال میں تھے۔ انہیں انجانا کا کانٹا لگا ہوا تھا۔ وہ مجھے یاد کر رہے تھے۔ مجھ سے ملنا چاہتے تھے حالانکہ میں ابھی ان کا ڈیلا بیٹا نہیں رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے پھوٹے دریدے سب سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ سنی کہ اکوئی بیٹی رمشہ سے بھی انہیں بہت پیار تھا۔ اس لیے شاید میرے لیے گنجائش نہیں رہی تھی یا پھر یہ شخص میری سوچ تھی۔ میں نے رمشہ کو ڈھیروں لپی لی تھی۔ اگرچہ اتنی جلدی اور اچانک واپسی اتنی سنان نہ تھی تاہم میں نے اس سے جلد پہنچنے کا وعدہ لیا۔ اسی کو بھی حوصلہ دیا تھا۔ وہ ابو کی وجہ سے حد

چلو چھوڑو محبت کو!  
اور تم یہ جھوٹا  
دوستی نے ہاتھ بڑھا  
تمہیں حاناں!

برستی بارشوں نے بھرا بلایا ہے  
وہ گلیاں، وہ رستے  
وہ لہجے، وہ چہرے  
سب ہی تم کو یاد کرتے ہیں  
چلے بھی آؤ اب جاناں!  
مارشوں کے موسم میں  
کسی سے روضا نہیں اچھا  
سنو! اب سارے جھگڑے بھول  
سنو! تم لوٹ آؤ نا!  
سنو! تم لوٹ آؤ نا!

”سنبھلو! تم لوٹ آؤ نا؟“ میں نے زیر لب دہرایا۔  
 ”کون ہو سکتا ہے یہ..... کیا میرا؟ نہیں وہ کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ شادی کے بعد بہت خوش تھی اور ایک سال بعد ہی اٹلی چلی گئی تھی اور اسے معلوم ہی کب ہے کہ میں لندن میں ہوں پھر کون ہے یہ.....؟“ ہاتھ میں گلابی کاغذ تھا میری نگاہیں کسی کی التجا پر ٹھہر گئی تھیں۔ کوئی گزارش تھی.....!

سنو! تم لوٹ آؤنا!  
سنو! تم سارے جھگڑے بھول جاؤنا!

میں نے گلابی کاغذ احتیاط سے تہہ کر کے اپنی ڈائری میں رکھ لیا۔ اگر بارش نہ ہو رہی ہوتی تو اس وقت میں یقیناً لندن کی کبر آلود سڑکوں پر آوارہ گردی کر رہا ہوتا مگر اب آتش دان کے سامنے بیٹھا ماضی کی راکھ کریدنے لگا۔ آج بھی میں صرف سیر اعلیٰ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ محبت آج بھی اک خوب صورت باد بن کر میرے پاس تھی اور دوستی کو میں

سروی اور سیرا کی بے وفائی کا دکھ مل کر کبھی کبھی مجھے  
بے بس کر دیتے تھے حالانکہ امی نے چلتے وقت کتنی  
تعلیقات کی تھیں مگر میں بس اس ایک نصیحت پر عمل نہ  
کر سکا تھا۔

اس روز بارش ہو رہی تھی۔ شام سات بجے اسٹور بند کر کے میں گھر چلا آیا تھا تب چچی نے مجھے بتایا کہ پاکستان سے میری ڈاک آئی ہے۔ مجھے حیرانی ہوئی تھی۔ فون اور میٹ کے توسط سے گھر میں سب سے بات ہو جاتی تھی پھر یہ خط بھیجنے والا عزیز کون تھا.....؟ بہر حال پہلے ٹھنڈے پنچنے کے لیے میں نے کچن میں جا کر اپنے لیے کافی بنائی تھی۔ پھر آؤٹ ہاؤس میں اسنے کمرے میں آتش دان کے پاس بیٹھا وہ گلابی رنگ کا قافز کھولنے لگا جو پاکستان سے میرے نام آیا تھا لیکن یہ کیا.....! یہ خط نہیں تھا۔ صرف ایک نظم تھی اور بھیجنے والے نے اپنا نام بتا نہیں لکھا تھا۔

بارشوں کے موسم میں  
لوگ روٹھ جاتے ہیں  
یوں ہی باتوں باتوں میں  
دل بھی ٹوٹ جاتے ہیں  
اک ذرا سی رنجش سے  
اک ذرا سی غمی سے

ساتھ چھوٹ جاتے ہیں!  
جن لوگوں سے تقدیر نہیں ہلاتی

پھر وہی لوگ کیوں  
دل میں بس جاتے ہیں؟

بات گردل کی ہے!  
تم سے پھر یہ کہنا ہے

اگر چہ تم کو مجھ سے محبت نہیں ہے!  
مگر تمہیں معلوم ہے، اکبر!

کہ تم برسوں سے آرزو ہو اس دل کی

”تم نے شادی کر لی مایا؟“  
ہم اپنا سامان لینے کے بعد عریضی کافی شاپ میں  
چلے آئے تھے۔ اس وقت پاکستان میں شام کے چھ  
بج رہے تھے لیکن باہر بارش کی وجہ سے رات کا سا  
سماں تھا۔ بادلوں نے آسمان کے شفاف سینے کو

207 | آنجل

جولائی ۲۰۱۱ء

# السبب پکوان

پاکستانی انڈین چائنیز اور کانٹینیٹل کھانوں کے ایکسپٹ

ذائقہ جو مدتوں یاد رہے

نقرب خواہ بیٹی کی لھو بادعوت ولیمہ باآپ کے لخت جگر کی سالگرہ

دعوت نیاز ہو یادعوت حلیم یا پھر افطار پارٹی

ماہانہ کے مسالوں کے ذریعہ صبح صبح سے بستر کو دلچسپ بنائیں گے

ڈسکاؤنٹ کے ساتھ

رابطہ: السید پکوان سینٹر اقبال پارا 1 دکان نمبر 25-C سیکٹر 1-C-11

نزد قیاض شیر مال ناگن چورنگی نارنگی کراچی

فون: 021-36932206/0332-3580243  
0321-2048430/0300-2830961

نوٹ: ہمارے پاس تمام کھانے حفظان صحت کے  
اصولوں کے مطابق تیار کیے جاتے ہیں

بن سکا۔ میں نے آپ کے اور امی کے ساتھ بالکل اچھا نہیں کیا۔ یہ بات تو شاید بہت پہلے سے طے تھی کہ میرا میرے نصیب میں نہیں ہے پھر کیوں میں دوسروں کو اس بات کا ذمے دار سمجھتا ہوں آپ لوگوں کو قصور وار گردانتا رہا؟

میں اسپتال کے کمرے میں ابو کے سامنے بیٹھا اپنی زیادتیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کر رہا تھا۔ میں نے تو اپنا سامان بھی چیک نہیں کیا تھا۔ درید کے ساتھ سیدھا اسپتال ہی چلا آیا تھا مگر جب ابو نے محبت سے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھامنا تو مجھے لگا کہ میں واقعی بد نصیب تھا جو ایک محبت کی خاطر اتنی ساری محبتوں کو بھلائے بیٹھا تھا۔

”نہیں بیٹا! قصور تمہارا نہیں ہے۔ شاید کسی کا بھی نہیں۔ سوائے ہماری قسمت کے۔ جس طرح دنیا میں کچھ چیزیں ہمارے لیے نہیں ہوتیں اسی طرح کچھ لوگ بھی ہمارے لیے نہیں ہوتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی اور کے بخت میں لکھ رکھا ہوتا ہے لیکن ہمارے لیے بھی کہیں نہ کہیں ہمارے حصے کی محبت ضرور رکھی ہوتی ہے جو وقت آنے پر ہمیں انعام کی طرح مل جاتی ہے تب ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ یہی ہمارے لیے بہترین ہے۔ کیونکہ اسے ہمارے لیے ہمارے رب نے منتخب کیا ہے۔“

”ابو پلیز!! بھی آپ بات مت کریں۔ ڈاکٹر نے آپ کو آرام کرنے کے لیے کہا ہے۔ اب میں آگیا ہوں۔ ہم بعد میں بہت سی باتیں کریں گے۔“ میں نے ابو کو روکنا چاہا مگر انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

”نہیں بیٹا! اب میں ٹھیک ہوں۔ تم سے اسی وقت ضروری باتیں کر لیتی ہیں۔ آج میں تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ ایک ایسا

اعتراف جو شاید میں نے کبھی تمہاری ماں کے سامنے بھی نہیں کیا۔“ ابو اب میرے ہاتھ کے سہارے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے جلدی سے انہیں سہارا دے کر بیٹھنے میں مدد دی تھی۔

”بیٹا! تم نے میرا سے محبت کی مگر وہ تمہارے نصیب میں نہیں تھی۔ جس طرح سدرہ میری محبت ہو کر بھی میرا نصیب نہیں بن سکی۔“ میں حیرت سے ابو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ میرا کی امی کا نام لے رہے تھے۔ انہوں نے اپنی حراماں نصیبی کی تمام داستان میرے سامنے کھول کر رکھ دی تھی۔ اف میرے خدا! تقدیر نے کتنا برا مذاق کیا تھا ہمارے ساتھ۔ ابو نے سدرہ آئی کو چاہا لیکن قسمت میں ان کا ساتھ نہیں لکھا تھا۔ کچھ خاندانی رنجشوں اور اختلافات کے باعث وہ دونوں چاہ کر بھی ایک نہ ہو سکے اور اب اتنے برسوں بعد تاریخ نے ایک بار پھر خود کو دہرایا تھا۔ میں اور میرا بھی ایک دوسرے کو بے حد چاہنے کے باوجود ایک دوسرے کو مانہ سکے۔ وجود ہی خاندانی رنجش، اختلافات اور آپس کی ناراضگی..... ابو چاہ کر بھی میرا مقدمہ لڑنے کے باوجود جیت نہ سکے شاید تقدیر کا لکھا اسی کو کہتے ہیں۔ وہ میرے سامنے یہ سارے انکشافات کر رہے تھے۔ انہوں نے میرے لیے کوشش کی تھی اور میں ان سے بدگمان تھا.....؟ انہوں نے میری خاطر میرا گھر والوں کی طرف سے میرے رشتہ کے لیے صاف انکار کی بے عزتی بھی برداشت کی..... کاش! میں امی ابو کو مجبور نہ کرتا تو شاید رد کیے جانے کی بے عزتی ان سب کو نہ بھیلنی پڑتی۔ صرف میری وجہ سے..... میری خاطر.....! کیوں کہ محبتیں اعزاز کی طرح وصول کی جاتی ہیں، بھیک میں مانگنے کی محبتیں اپنی قدر کھودیتی ہیں۔ میں نے لمحوں میں



انہیں ہر الزام سے بری کر دیا۔ وہ تمام جرائم جو قسمت نے از خود اپنی رضا سے ان کے کھاتے میں ڈال دیے تھے۔

”بیٹا! مجھے اندازہ ہے انسان جسے شدت سے چاہتا ہے اسے پائے سکے تو قسمی تکلیف ہوتی ہے لیکن ہم تقدیر سے لڑ نہیں سکتے اس لیے میں نے بڑے مان سے تمہارے لیے ایک فیصلہ کیا ہے۔ کیا میں امید رکھوں کہ تم اس بار میرا مان رکھو گے؟“ وہ مجھ سے یقیناً کوئی شبیدہ بات کرنا چاہ رہے تھے اور اب میرے لیے ان کا مان توڑنا تو دور، ان کی کسی ادنیٰ خواہش کو رد کرنا بھی مشکل تھا۔

”ابو! اب میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گا۔“ میں نے ان کے ہاتھوں کو تھام کر آنکھوں سے لگایا تھا۔

”اپنے بہت اچھے دوست کی بیٹی سے میں نے تمہاری شادی طے کر دی ہے۔ تمام تیاریاں مکمل ہیں۔ ایک ہفتے بعد تمہاری شادی ہے۔ بس! یہ مت پوچھنا کہ یہ سب اتنی جلدی کیوں کر ہو گیا؟ اس کی تفصیل میں پھر کبھی تمہیں بتاؤں گا، اگر زندگی نے وفا کی تو.....“

”پلیز ابو! اللہ آپ کا سایہ ہم سب پر ہمیشہ قائم رکھے۔“

”ہاں میاں! ابھی تمہارے بچوں کو بھی تو کھانا ہے ہم نے۔“ وہ شرارت سے مسکرائے تھے اور میں بھی۔ شادی کے معاملے میں اب میری کوئی مرضی یا پسند نہیں رہی تھی یا شاید میں واقعی میرا اس کی محبت کو بھلا بیٹھا تھا۔ اس لیے میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ دل میں کہیں اک اطمینان اور سکون جاگزیں ہوا تھا۔



چند روز بعد ابو کو ہسپتال سے رخصت کر دیا گیا۔ یہ میری شادی سے دو روز پہلے کی بات ہے جب میں اپنے کمرے میں بیٹھا اپنا سامان چیک کر رہا تھا مگر یہ کیا! جیجز اور ٹریس کے بجائے لیڈز کرتے اور جیجز کے ساتھ اسکارف، پرفیومز، کا سٹیکس کا سامان.....! او خدا! میں حیرت سے سب کچھ دیکھ رہا تھا اور پھر میں نے پورا بیگ الٹ دیا تب ہی ایک عنابی رنگ کی ڈائری گری تھی۔ ایئر پورٹ پر میرا سامان تبدیل ہو گیا تھا مگر کس کے سامان کے ساتھ.....؟ یکدم ہی مجھے سامنے پڑی ڈائری کا خیال آیا شاید اس میں اس سامان کے مالکان کا کچھ اتنا پتال جائے۔ میں نے فوراً ڈائری اٹھائی تھی لیکن کاش! میں اسے نہ کھولتا۔

بارشوں کے موسم میں

لوگ روٹھ جاتے ہیں

یوں ہی باتوں باتوں میں

دل بھی ٹوٹ جاتے ہیں

اک ذرا سی پرچش سے

اک ذرا سی غمی پر

ساتھ جھوٹ جاتے ہیں

جن لوگوں سے تقدیر نہیں ملتی

پھر وہی لوگ کیوں

دل میں بس جاتے ہیں؟

بات گردل کی ہے!

تم سے پھر یہ کہتا ہے

اگرچہ تم کو مجھ سے محبت نہیں ہے!

مگر تمہیں معلوم ہی کب ہے!

کہ تم برسوں سے آرزو ہو اس دل کی

چلو چھوڑو محبت کو!

اور تم یہ سمجھو!

دوستی نے ہاتھ بڑھایا ہے

تمہیں جاننا!

برسی بارشوں نے پھر بلایا ہے

وہ گلیاں، وہ رستے

وہ لہجے، وہ چہرے

سب ہی تم کو یاد کرتے ہیں

چلے بھی آؤ اب جاننا!

بارشوں کے موسم میں

کسی سے روٹھنا نہیں اچھا

سنو! اب سارے جھگڑے بھول جاؤ نا!

سنو! تم لوٹ آؤ نا!

سنو! تم لوٹ آؤ نا!

ڈائری میرے ہاتھوں سے جھوٹ کر بیڈ پر گری

تھی۔ ”اف، میرے خدا! یہ میں نے کیا کر دیا؟“

کاش! میں اب ابو سے انکار کرنے کی ہمت کر پاتا یا

پھر کاش! میں یہ ڈائری بھی نہ پڑھتا۔“

مجھے ساحل سمندر پر اپنی مایا سے آخری ملاقات کی

وہ سرمئی شام پوری شدت سے یاد آئی تھی جب میرا

کی شادی ہو رہی تھی اور اس نے اپنے گھر والوں کے

خلاف میرا ساتھ دینے سے صاف انکار کرتے

ہوئے کہا کہ میں اسے بھول کر سنے سرے سے اپنی

زندگی شروع کروں اس کی طرح کیونکہ شاید اس کے

لیے یہ آسان تھا، بہت آسان! تب مایا میری بہترین

دوست مجھے حوصلہ دے رہی تھی۔ مجھے وہ باتیں سمجھا

رہی تھی جو مجھے آج اتنے سالوں بعد جا کر سمجھ آئی ہیں

اور جسے میں اپنی بہترین دوست سمجھتا تھا وہ میری

اچھی دوست ہونے کے ساتھ مجھ سے بے حد محبت

بھی کرتی تھی لیکن میں کبھی سمجھ ہی نہیں سکا۔ کچھ دن

پہلے مجھے یہ نظم پاکستان سے آنے والی ڈاک سے

موصول ہوئی تھی اور میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ

مایا ہوگی۔ کیوں؟ میں اس کے ہاتھ کی لکھائی بھی پہچان نہیں سکا یا پھر سمیرا کی محبت میری آنکھوں کا پردہ بن گئی تھی؟ میری سوچ کی اڑان اس تک نہ پہنچ سکی۔ میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھپا رہا تھا۔ ایک محبت تقدیر نے مجھ سے چھینی تھی، دوسری میرے ہاتھوں سے ریت کی مانند پھسل گئی تھی۔

”ہمیشہ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے.....“ ہر وہ چیز جو مجھے چاہیے ہوتی ہے یا جسے میرے پاس ہونا چاہیے وہ قریب آ کر میری دسترس سے دور ہو جاتی ہے۔ کیوں..... آخر کیوں ہوتا ہے ایسا؟“

میں واقعی بہت رنجیدہ ہو رہا تھا۔ جہاز میں مایا

سے اپنی ملاقات کو یاد کر رہا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ

اس کی شادی ہو رہی ہے اب میں چاہوں بھی تو اسے

پا نہیں سکتا تھا مگر شاید ابو کی باتوں اور محبت نے مجھے

”جھوٹا کرنا سکھا دیا تھا۔ اس لیے اگلے لمحے میں نے

خود کو سنبھال کر سارا سامان واپس بیگ میں ڈالا اور

اب مایا کو اسے واپس کرنے جا رہا تھا۔ اب پانچ

سالوں میں اس کے گھر کا پتا تو مجھے یاد ہی تھا۔ اسے

میں کیسے بھول سکتا تھا!



آج ایک بار پھر جل جھل کا سماں تھا! میں تقریباً

بھٹکتا ہوا مایا کے گھر کے صدر دروازے تک پہنچا تھا۔

بارش زوروں پر تھی۔ پتا نہیں باہر کی بارش کا زور زیادہ

تھا یا پھر میرے اندر.....! مگر میں نے خود کو پوری

طرح سنبھال رکھا تھا۔ میں مایا کے سامنے کمزور پڑنا

نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ اس بار مجھے اپنے دل کی نہیں

سننی تھی۔ مجھے ابو کا مان رکھنا تھا۔ اتفاق سے مایا ہی

دروازہ کھولنے آئی تھی۔

”ارے! اتنی صبح صبح کون آگیا ہے؟ سارا گھر

سورہا ہے۔ کسی کو دروازے پر جتنی گھنٹی سنائی نہیں

دے رہی۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی آئی اور اب دروازہ کھولے میرے سامنے تھی۔

”اس لیے کہ بارش میں گھنٹی کی آواز سنائی نہیں دے سکتی۔“ میں نے بے ساختہ کہا تھا اور وہ حیران گم صم صم کھڑی تھی۔ اس نے مایوں کا پیلا جوڑا پہنا ہوا تھا۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے اور میں پھر بھی ہونقوں کی طرح کھڑا اسے تنگ رہا تھا۔

”تم! یہاں..... اس وقت.....؟ کسی نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔“

”کیا مطلب؟ میں تو تمہارا سامان لوٹانے آیا ہوں اور تم انہیں بتا سکتی ہو کہ میں تمہارا دوست ہوں۔ اس میں گھبرانے والی کیا بات ہے؟“ میں نے اس کے ایک دم پریشان ہونے پر کہا تو وہ ہلکے ہلکے مسکرائی تھی۔

”ہاں..... ہاں..... بہترین دوست ہو مگر اس وقت رات بھر ت جگا کر کے سب سو رہے ہیں۔ پلیز! تم چپ چاپ میرے کمرے میں چلے آؤ۔“

اس نے بے ساختہ میرا ہاتھ پکڑ کے اندر گھسنا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں اس کے سامنے بیٹھا گرم گرم چائے پی رہا تھا۔ مجھے بارش میں بھیگا دیکھ کر مایا کو یہی سوچا تھا کہ وہ مجھے بٹھا کر چائے بنانے چلی گئی تھی اور میں خود پر رشک کر رہا تھا کہ کسی کی مایوں کی دہن میرے لیے اپنے ہاتھوں سے چائے بنانے لگی تھی۔

”آئی ایم سوری! میں نے تمہاری ڈائری پڑھ لی ہے۔“ میں نے سچ شرمندہ لہجے میں معذرت کی تھی مگر مجھے لگا جیسے وہ اپنی شادی پر بہت خوش ہے حالانکہ اسے تو میری طرح.....

”تم یہی سوچ رہے ہو کہ میں اتنی خوش اور مطمئن کیوں نظر آ رہی ہوں حالانکہ میں.....“ ایک دم ہی

کچھ کہتے کہتے اس کی پلکیں حیا سے جھپکی چلی گئیں۔ یہ کتنا دلکش منظر تھا کہ کوئی میرے دل سے پوچھتا۔

”کاش! یہ سب میرے لیے ہوتا۔“ میرے دل نے بے اختیار ایک پاگل سی خواہش کی تھی۔ سیرا جانے کہاں چلی گئی تھی..... یہاں تو ہر طرف صرف مایا تھی۔ ”تو کیا محبت ایک بار پھر نئے سرے سے میرے دل کو اسیر کر رہی ہے؟“ میں اپنے اندر اٹھنے والے سوالوں میں الجھ رہا تھا اور مایا مسکرا رہی تھی۔

”میں معذرت چاہتا ہوں مایا! میں نے بہت دیر کر دی۔ میں کبھی سوچ ہی نہیں سکا کہ دوستی کبھی محبت میں بھی بدل سکتی ہے۔ جاتی ہو، جب میں پاکستان سے جا رہا تھا تو یہی بارشوں کا موسم تھا اور میرا میرے ذہن اور دل پر چھائی ہوئی مگر کیا تم یقین کرو گی کہ جب میں پانچ سال بعد واپس پاکستان آیا ہوں تو یہی بارشوں کا موسم ہے لیکن میرے دل میں تمہاری یاد ہے۔ تمہاری محبت ہے مایا!“

میں نے بے اختیار ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ پلکیں اٹھائے ایک تنگ میری طرف دیکھ رہی تھی تب ہی کوئی تیزی سے دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔

”ہیں! یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟ ابھی نکاح ہوا نہیں ہے اور تم دونوں اتنے دھڑلے سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بیٹھے ہو؟“ ایک دلکش لڑکی ہم دونوں کو کھڑی گھور رہی تھی۔ میں نے بے ساختہ مایا کا ہاتھ چھوڑا تھا اور گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”وہ..... بھابی!“

”وہ کیا بھابی.....؟“

مایا شاید وضاحت دینا چاہ رہی تھی اور میں تنگ سا کھڑا دیکھ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ.....

”اور تم! شام کو تو نکاح ہو رہا ہے۔ تم شام

تک صبر نہیں کر سکتے تھے؟ نکاح کے بعد مل لیتے مگر نہیں! تم نے سوچا ہو گا رات کو رت جگا کر کے سب پڑے سو رہے ہوں گے، اس لیے صبح صبح موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ہے نا!“ مایا کی بھابی بے تکلفی سے میری کلاس لے رہی تھیں اور اب یہ ساری صورت حال اچھی خاصی مجھے سمجھ آ گئی تھی گویا مایا ہی ابو کے قریبی دوست کی بیٹی ہے..... مگر اسے کیسے پتا چلا کہ میں.....

”پلیز بھابی! انہیں کچھ مت کہیں۔ انہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ معید حسن کو یہ تک پتا نہیں کہ اس کی شادی تم سے ہو رہی ہے؟“

”جی بھابی! معید حسن کو واقعی نہیں پتا۔ میں تو بس انہیں سر پرانز دینا چاہ رہی تھی۔“ مایا نے مجرموں کی طرح سر جھکایا تھا۔

”اچھا! تو اسے پہلے ہی سے سب حقیقت کا علم تھا اور یہ مجھے آحق بنائی رہی۔“ میں نے خود دکھائی کی تھی۔

”تم نے کچھ کہا کیا؟“ بھابی نے میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔

”نہیں بھابی! مایا مذاق نہیں کر رہی۔ دراصل اس نے ہی مجھے فون کر کے اس وقت بلایا ہے۔ کہہ رہی تھی کہ سب گھر والے سو رہے ہیں۔ موقع اچھا ہے۔“

میں نے صاف جھوٹ بولا تھا کیونکہ مایا کی شہزادہ میری سمجھ میں آ چکی تھی اور اب میری باری تھی۔ مایا حیران سی میری طرف رو بہا ہو کر دیکھ رہی تھی۔

”نہیں تو بھابی! وہ.....“

”اچھا چھوڑو اس قصے کو۔ بس پانچ منٹ دے

رہی ہوں تم دونوں کو۔ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ لو۔“ رخصتی والے دن تک..... میں تب تک باہر کھڑی پہرہ دے رہی ہوں۔ کوئی ادھر آ گیا تو ہم بیٹیوں کی خیر نہیں ہوگی۔“

بھابی چلی گئیں تو میں دونوں ہاتھوں کو پھانسی کے پھندے کی طرح دائرہ بنائے مایا کی طرف بڑھا تھا۔

”تمہیں سب کچھ پتا تھا پھر بھی مجھے ستارہ تھیں؟ اب دیکھنا سارے حساب برابر کروں گا تمہارے ساتھ.....“

وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹی تھی اور میں نے بڑھ کر اس کے ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔

”کیا کر رہے ہو۔ بھابی پھر سے آ جائیں گی۔“

”تمہارے ہاتھوں کی لکیروں میں اپنا نام دیکھ رہا ہوں۔ اگر یہ یہاں لکھا تھا تو پہلے مجھے نظر کیوں نہیں آیا؟“ میں اس کے ہاتھ کی پتھیلی تھامے غور سے دیکھ رہا تھا۔

”اس لیے کہ تمہیں بالآخر تقدیر پر اعتبار آ جائے۔ کیونکہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔“ وہ خوشی سے مسکرائی اور میں سوچ رہا تھا کہ اس سے زیادہ دلکش منظر اور کیا ہوگا؟

”وہ..... بھابی آ گئیں.....“ میں نے بے ساختہ مڑ کے دیکھا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا مگر مایا ہنستے ہوئے دروازے کی جانب بھاگتے ہوئے ایک بار پھر مجھے بے وقوف بنائی تھی اور اب میں ساری عمر اس کے ہاتھوں بے وقوف بننے رہنے کے لیے دل و جان سے تیار تھا۔ واقعی ایک نیا دن ہمیں ہمارے حصے کی محبت مل کر رہتی ہے۔ ابو کے فلسفے پر مجھے یقین آ گیا تھا۔ میں نے آسودگی سے مسکراتے ہوئے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔







## روحانی مسائل اور ان کا حل

بے دینی کا ماحول ہمارے معاشرے میں ناسور کی طرح سرایت کرتا جا رہا ہے اور ہم اپنے اصل مقام سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لیے ذہنی پریشانی، بیماری، تکلیف، خاندانی اختلاف و افتراق اور معاشی تنگ دستی میں ہم ہر وہ کام کر جاتے ہیں جس کی دین و شریعت ہمیں اجازت نہیں دیتے، بلکہ بعض اوقات دین و ایمان اور عزت و ناموس کو بھی خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اسی بات کے پیش نظر ہم ماہنامہ آنچل کے قارئین کی راہ نمائی کے لیے روحانی مسائل پر مبنی علاج بالقرآن کالم کا آغاز کر رہے ہیں۔ آپ اپنے سوالات صفحہ کے ایک جانب ہر ماہ کی ۵ تاریخ تک دفتر کے پتے پر ارسال کریں۔ صرف وہ ای میل شامل اشاعت کی جائیں گی جو اردو یا رومن میں ہوں گی ای میل کی سہولت صرف بیرون ملک قارئین کے لیے ہے۔ اندرون ملک (پاکستان) کے لیے صرف کوپن قابل قبول ہوگا۔ ایک کوپن ایک سوال کے لیے ہی کارآمد ہوگا۔ سوال کے لیے کاپی کا ایک صاف سترہ صفحہ استعمال کریں ایک صفحہ پر ایک ہی سوال درج کریں۔ ایک سے زائد سوالات کے جوابات نہیں دیئے جائیں گے۔ ٹیلی فون پر رابطہ کی زحمت نہ فرمائیں۔ لفافہ کے اوپر روحانی مسائل اور ان کا حل لازمی لکھیں۔

جولائی 2011

کوپن

گھر کا مکمل پتہ

والدہ کا نام

نام

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں

ای میل rohanimasail@aanchal.com.pk

پتہ: ماہنامہ آنچل 8 فرید جیمبر عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی



اے ایس صدیقی

ٹالنے والی چیز لگے۔ اس جگہ خلوص کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ وہ تعریف جس میں خلوص نہیں ہوتا فقیر کی دعا جیسی ہوتی ہے۔

اگر آپ ماں باپ ہیں تو اپنے بچوں کی کاوشوں کو وقتاً فوقتاً سراہیں اس سے ان کے اندر بہتر کام کرنے کی لگن پیدا ہوتی ہے۔ آفس میں ہیں تو اپنے ماتحتوں کی عمدہ کاوشوں کا ذکر کریں کسی نے تعریف کے ضمن میں کہا ہے کہ آدمی کی تعریف اس کی زندگی میں کرنی چاہیے۔ بھلا قبر پر کتبہ لگانے سے کیا فائدہ۔

تعریف کے پیچھے ہمیشہ نیک مقصد ہونا چاہیے۔ صرف ہمت افزائی کے بہانے غلط قسم کی تعریف کرنے والے معاشرتی مجرم ہوتے ہیں۔ اس سے بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں کو جو بچہ تعریف کے مستحق ہوتے ہیں۔ آپ نے وہ مثل تو سنی ہوگی گھوڑے گدھے ایک ساتھ باندھنے والی۔ تعریف کے ضمن میں انصاف کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔

جب آپ کسی کی تعریف کرتے ہیں اور یہ تعریف حقائق پر مبنی ہوتی ہے۔ تو جس شخص کی تعریف کی جاتی ہے ایک طرح سے آپ اسے جیت لیتے ہیں۔ وہ بعد میں آپ کی شہرت کا ذریعہ بنتا ہے۔

تعریف سن کر سب خوش ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں تعریف کی جائے تو بھینس بھی دودھ زیادہ دیتی ہے۔

تخفے، تحائف دینے کا معاملہ بھی شخصیت کی زینت بڑھا رہا ہے۔ اس سے دلوں میں محبتیں جنم

دل پسند شخصیت بننے کے لیے جہاں بہت سی باتیں ہیں وہیں دو باتیں اور بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

ان کا تعلق آپ کے سماجی رویے سے ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ہم تخفے اور تعریف کی اہمیت پر آج بات کریں گے۔

سب سے پہلے تو یہ جان لیں کہ تحفہ دینے کے دو مقصد ہوتے ہیں ایک تو کوئی ذاتی مفاد ہوتا ہے اور دوسرا صرف خوشی بانٹنے کا جذبہ۔ اسی طرح تعریف کے بھی دو مقاصد ہوتے ہیں۔ اپنا کوئی کام نکالنے کے لیے کی جائے یا یہ واقعی سچی اور بے غرض ہو۔

یہاں واضح طور پر یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ دونوں کام جب صرف منہ کی مقاصد کے لیے کیے جاتے ہیں تو شخصیت کے حسن میں کوئی اضافہ نہیں کرتے بلکہ یہ اسے داغ دار بناتے ہیں کیونکہ مصنوعی باتیں دیر تک اپنا تلخ قائم نہیں رکھ پاتیں۔ لہذا اگر مقصد شخصیت کی اثر پذیری ہے تو پھر یہ کام مثبت انداز میں کرنے ہوں گے ورنہ کوئی فائدہ نہیں۔

تعریف سے آغاز کرتے ہیں۔ تعریف کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ یہ حقیقی ہو بناوٹی نہ ہو۔ ایسی نہ ہو کہ خوشامد محسوس ہو۔ نہ ہی اتنی سرسری ہو کہ کوئی

یعنی ہیں۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر کسی کے گھر جاؤ تو ساتھ میں کوئی چھوٹا مونا تھخہ ضرور لے جاؤ۔

تھخنوں کے ضمن میں تعریف کی طرح کئی باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے ورنہ آپ کا یہ اچھا سا عمل بجائے اس کے کہ کوئی فائدہ دے آپ کی شخصیت کے لیے ضرر رساں بھی بن سکتا ہے۔

تھخہ دیتے وقت ہمیشہ دھیان رکھیں کہ جسے تھخہ دیا جا رہا ہے۔ اس کا مزاج کیا ہے؟ اس کی مالی پوزیشن کیا ہے؟ اس کی ترجیحات کیا ہیں؟ تھخہ دیتے وقت ان باتوں کے علاوہ یہ بھی دھیان میں رکھیں کہ آپ کا دیا ہوا تھخہ ایسا ہے جو کارآمد ہے۔ یہاں ایک چھوٹی سی مثال دیکھیں۔ مشکوں سے بنے ہوئے زیورات ہار کڑے وغیرہ عموماً استعمال نہیں کیے جاتے۔ زیادہ مہنگے نہیں ہوتے۔ ایک محترمہ کو ان کی سہیلی نے یہ زیورات تھخے میں دیے۔ انہوں نے لے لیے لیکن بعد میں اٹھا کر اسے انہوں نے اپنی ماسی کو دے دیا۔ کیا فائدہ ہوا اس تھخے کا۔ اس کے برخلاف دوسری سہیلی نے خوش بو کی ایک چھوٹی شیشی تھخے میں دی جو مالیت میں زیورات سے کم تھی اسے بڑے چاؤ سے لیا گیا۔ استعمال میں بھی لایا گیا۔

تھخے کا انتخاب دراصل آپ کی سوجھ بوجھ کا امتحان ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اس سے اس کا بھی پتا چلتا ہے کہ آپ میں دوسروں کو سمجھنے کی کتنی لیاقت ہے۔

جنہیں عمدہ کتابوں کا شوق ہوتا ہے۔ انہیں کوئی اچھی کتاب پیش کر کے بھی خوش کیا جاسکتا

ہے۔

بچوں کے لیے تھخہ لے جانا ہو تو ان کی عمر کا خاص خیال رکھیں۔ بعض کھلونوں پر لکھا بھی ہوتا ہے کہ یہ کھلونا کتنی عمر کے بچے کے لیے ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ تھخے میں ایسا کھلونا دے دیا گیا جو بچے کی عمر سے مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ عموماً یہ تھخے یا تو ضائع ہوتے ہیں یا ان کا مقصد ہی پورا نہیں ہوتا۔ یعنی خوشی تھخنے سے یہ تھخہ قاصر رہتا ہے۔

اگر آپ ایک خاوند ہیں تو سالگرہ کے موقع پر اپنی شریک حیات کو کوئی تھخہ دینا نہ بھولیں۔ اسی طرح اگر آپ ایک بیوی ہیں تو خاوند کی سالگرہ پر اس کے لیے کچھ نہ کچھ اہتمام ضرور کریں۔

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ شخصیت کی تعمیر کا کام تو زندگی بھر جاری رہنے والا کام ہوتا ہے۔ یہ ایک عمارت کی تعمیر کا سا عمل ہوتا ہے۔ ٹکڑے ٹکڑے کر کے یا گے بڑھتا ہے۔ اس میں رکسنے کا کوئی لمحہ نہیں ہوتا۔

بڑی بڑی باتوں کی طرح چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ہماری شخصیت میں رنگ بھرتی ہیں۔ انہیں کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔



ہومیوڈاکٹر محمد ہاشم مرزا

نورہ ہجرات سے لکھتی ہیں کہ خطا شائع کیے بغیر جواب دیں آپ میری امید کی آخری کرن ہیں۔

محترمہ آپ CINAMOM-30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ لیں۔ 1300 روپے کا نسخی آرڈر میرے کلینک کے نام پتے پر ارسال کر دیں۔ بالوں سے متعلق دونوں ادویہ ارسال کر دی جائیں گی نسخی آرڈر فارم کے آخر میں دونوں دواؤں کے نام ایفرو ڈاٹس اور ہیئر گروٹر ضرور لکھیں۔

عائشہ انجم یمن میر پور خاص سے لکھتی ہیں کہ میرا دور دوست کا مسئلہ ہے شائع کیے بغیر جواب دیں۔

محترمہ آپ دوست کو SABALSERULATUM-Q کے دس قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ دیں اور مبلغ 550 روپے میرے کلینک کے نام پتے پر نسخی آرڈر کر دیں۔ نسخی آرڈر فارم کے آخر میں کوپن پر مطلوبہ دوا کا نام B.BEAUTY ضرور لکھیں۔ اسی طرح آپ HAIR GROWER کے لیے 600 روپے کا نسخی آرڈر ارسال کر دیں۔ دونوں دواؤں آپ کے گھر پہنچ جائیں گی۔

عمر حیدر منڈی بہاؤ الدین سے لکھتے ہیں کہ آپ کی بہت تعریف سنی ہے میں بہت پریشان ہوں میرا مسئلہ شائع کیے بغیر دوا تجویز کر دیں۔

محترمہ آپ STAPHISGARIA 30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ لیں۔ کرن رانا خانیوال سے لکھتی ہیں کہ آپ میرے مسئلے کا موثر حل اور علاج کے لیے رہنمائی فرمائیں۔

محترمہ آپ APISMELL 30 کے پانچ قطرے

آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ کھانے سے پہلے لیں۔ مکمل شفا پائی تک دوا کا استعمال جاری رکھیں۔

مسز عباس صحتی ہیں کہ دو بچوں کو دودھ پلانے کی وجہ سے میرے بریسٹ بالکل لٹک گئے ہیں اور مر جھا کر چھوٹے ہو گئے ہیں۔

محترمہ آپ JODUM-30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ لیں اور اس کے علاوہ BREASTBEAUTY کا استعمال جاری رکھیں۔

عائشہ بتول سرگودھا سے لکھتی ہیں کہ میں بہت پریشان ہوں مسئلہ شائع کیے بغیر علاج بتائیں۔

محترمہ آپ فکر نہ کریں باہر سے تھوڑا نقصان ہوا ہے جو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

افشاں بتول لکھتی ہیں کہ میرے چہرے پر جھانیاں پڑ گئی ہیں۔ اس کا علاج بتائیں۔

محترمہ آپ BERBARISAQUIF-Q کے دس قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں۔

آمنہ لاہور سے لکھتی ہیں کہ میں اپنی بیٹی کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔

محترمہ آپ OVATESTA 3X کی ایک گولی تین وقت روزانہ کھلائیں۔ ان شاء اللہ تمام مسئلے حل ہو جائیں گے۔

ایڈنا جہلم سے لکھتی ہیں کہ میری کھائی کے جوڑ پر گھٹی نکل آئی ہے۔ ڈاکٹر آپریشن بتاتے ہیں۔ دوسرے میری عمر 26 سال ہے۔ نسوانی حسن نہ ہونے کے برابر ہے۔

محترمہ آپ RUTA-30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پی لیا کریں۔

دوسرے مسئلہ 26 سال کی عمر میں کوئی حل نہیں ہے۔

طیبہ نذر ہجرات سے لکھتی ہیں کہ ادی کو دس سال سے شوگر ہے کھانوں میں بھی خارش ہے اور الرمی بھی ہے۔

محترمہ اس کا علاج مقامی معالج سے جاری رکھیں۔ اور دھڑکھڑکی دوا نہ لیں بہتر یہی ہے۔

معنیہ الطاف کھاڑا سے لکھتی ہیں کہ جسم پر گہرے بھورے داغ ہیں دوسرے میرے شوہر کا مسئلہ ہے۔ دونوں کے لیے کوئی دوا بتائیں۔

محترمہ آپ SEPIA 30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ کس اور پانی سے شہر کو STAPHISGARIA-30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ دیں۔

گلناز ہری پور سے لکھتی ہیں کہ میری امی اور باقی کوحد سے زیادہ ناپا پسند میرا جسم ٹھیک ہے مگر بیٹ بڑھاؤا ہے۔

محترمہ آپ CALCIUM FLOUR 6X کی چار گولی تین وقت روزانہ کھائیں اور امی باقی کو PHYTOLACCA-Q کے دس قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ دیں۔ HAIR GROWER کے لیے 600 روپے اور APHRODITE کے لیے 700 روپے کا نسخہ آرڈر ارسال کریں۔ مٹی آرڈر فارم کے آخری کوپن پر مطلوبہ دوا کا نام ضرور لکھیں۔ ان شاء اللہ ایک ہفتے میں دونوں چیزیں آپ کے گھر پہنچ جائیں گی۔

سونیا خان گجرات سے لکھتی ہیں کہ میرے چہرے پر جھائیاں ہیں اس کا علاج بتائیں۔

محترمہ آپ BERBARIS AQUIFOLIA کے دس قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ لیں۔ جھائیاں ختم ہونے پر دوا کا استعمال بند کر دیں۔

مسز سحان لکھتی ہیں کہ میری آنکھوں سے مستقل پانی بہتا ہے آنکھیں سرخ رہتی ہے۔ کوئی ڈراپ لکھیں۔

محترمہ آپ EUPHRASIA آئی ڈراپس روزانہ سوتے وقت ڈال لیا کریں اور EUPHRASIA-6 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پی لیا کریں۔

اقرا بٹ سیالکوٹ سے لکھتی ہیں کہ میرے پورے جسم پر لکیروں جیسے نشانات ہیں۔

محترمہ اس کا علاج دیکھنے کے بعد ہو سکتا ہے۔

دانیال رینب حسن ابدال سے لکھتی ہیں کہ میرے بچے بہت کمزور مر جھائے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے کوئی دوا بتائیں۔ مجھے لیکوریا کا مرض ہے اس کا علاج بتائیں۔

محترمہ آپ بچوں کو FIVEPHOS 6X کی چار گولی تین وقت روزانہ کھائیں اور آپ BORAX 30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین مرتبہ روزانہ لیں۔ ان شاء اللہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

نبیلہ بیگم حسن ابدال سے لکھتی ہیں کہ میرے چہرے پر تل ہیں اور اب میری بچیوں کے چہرے پر بھی تل ہو گئے ہیں۔ بچیوں کی نظر بھی کمزور ہے اس کا حل بتائیں۔

محترمہ تل ختم کرنے کے لیے THUJA-Q کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پی لیا کریں اور اسی کوکون پر لگا کریں۔ نظر کی کمزوری کے لیے CENERARIA آنکھوں کے ذراپس جرمنی کے ایک قطرہ روزانہ سوتے وقت آنکھوں میں ڈالیں۔

انعم حسن فیصل آباد سے لکھتی ہیں کہ میرا اور امی کا مسئلہ ہے۔ شائع کیے بغیر دوا بتائیں۔

محترمہ آپ PITUITRIN-30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پی کریں۔ آپ کے دونوں مسئلے حل ہوں گے۔ امی کو

PHYTOLACCA-Q کے دس قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پلائیں۔ مبلغ 700 روپے کا نسخہ آرڈر میرے کلینک کے نام پتے پر جو آخر میں لکھا ہوا ہے ارسال کر دیں۔ آپ کو APHRODITE ارسال کر دیا جائے گا۔

مرزا محمد فیصل بیگ فیصل آباد سے لکھتے ہیں کہ میں اپنی صحت بر باد کر چکا ہوں کوئی دوا تجویز کر دیں۔

محترمہ آپ ACIDPHOS 3X کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پی لیا کریں۔

شائزہ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لکھتی ہیں کہ میرا مسئلہ شائع کیے بغیر جواب دیں۔

محترمہ آپ TEUCRIUM-3X کے پانچ قطرے

آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پی لیا کریں۔ اپنی بہن کو NATRUM CARB-30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پلائیں۔

تنویر احمد خان سکھر سے لکھتے ہیں کہ میرا سر گھبرا ہوا ہے۔ صرف ساندوں پر بال رہ گئے ہیں۔ جب کہ میری عمر ابھی 35 سال ہے بال بھی سفید ہو گئے ہیں۔

محترمہ آپ میرے کلینک کے نام پتے پر 600 روپے کا نسخہ آرڈر ارسال کر دیں۔ مٹی آرڈر فارم پر اپنا پتا مکمل لکھیں اور آخری کوپن پر HAIR GROWER ضرور لکھیں آپ کو یہ دوا گھر پہنچ جائے گی۔ اس کے استعمال سے قدرتی بالی مصلحہ طور پر پیدا ہوں گے۔

فرسلطانیہ سیالکوٹ سے لکھتی ہیں کہ حسن نواس کی کمی ہے۔ میں بہت پریشان ہوں کوئی دوا بتائیں۔

محترمہ آپ SABALSERRULATA-Q کے دس قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین مرتبہ روزانہ پی لیا کریں اور مبلغ 550 روپے کا نسخہ آرڈر میرے کلینک کے نام پتے پر ارسال کر دیں۔ مٹی آرڈر فارم کے آخری کوپن پر مطلوبہ دوا BREAST BEAUTY ضرور لکھیں۔ دوا آپ کے گھر پہنچ جائے گی۔ ان شاء اللہ

آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ سلسلی شہزاد سرگودھا سے لکھتی ہیں کہ میرا وزن بہت بڑھ گیا ہے چہرے پر بھورے رنگ کے تل ہیں بچوں کو دودھ پلانے کی وجہ سے ریٹ لٹک گئے ہیں کیا بچوں کو دودھ پلانے کے دوران BREAST BEAUTY استعمال کر سکتی ہوں۔

محترمہ آپ PHYTOLACCA-Q کے دس قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پی کریں۔ دودھ پلانے کے دوران BREAST BEAUTY استعمال کر سکتی ہیں اس میں کوئی نقصان وہ اجزاء شامل نہیں ہیں۔

ناصر علی بھادپور سے لکھتے ہیں کہ مسئلہ شائع کیے بغیر میری دوا تجویز کر دیں۔

محترمہ آپ ACIDPHOS 3X کے پانچ قطرے تین وقت روزانہ پی لیا کریں۔

محمد عبداللہ خان کراچی سے لکھتے ہیں کہ مسئلہ شائع کیے بغیر جواب دیں۔

محترمہ ایسا دوا استعمال کرتے رہیں۔ 3 ماہ مکمل کر لیں۔ دوسرے مسئلہ کوئی حل نہیں ہے یہ قدرتی ہوتے ہیں۔

مریم بٹ لکھتی ہیں کہ میرا بیٹ بہت بڑا ہے۔ آپ نے جو دوا بتائی تھی وہ میں نے عظیم سے منگائی تھی۔ اس نے قطرے دیے تھے اس سے فرق نہیں پڑا۔

محترمہ آپ CALCIUM FLOUR 6X کی چار چار گولی تین وقت روزانہ کھائیں اور CALCIUM CARB 200 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر ہر آٹھویں دن لیں۔ یہ ادویات مٹی ہو سکتی ہیں۔

خاتون لکھتی ہیں کہ میری چار بیٹیاں ہیں اور چاروں کے سر میں بے حد جوبیں ہیں کسی طرح صاف نہیں ہوتیں۔

میری بیٹی کی عمر 14 سال ہے اس کے بازو اور چہرے پر بال پیدا ہو رہے ہیں۔ جیسے لڑکیوں کی موچھیں ہوتی ہیں۔ اس کا بھی حل بتائیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔

محترمہ آپ بچیوں کے سر دھونے کے بعد ایک لونا پانی میں SABADILA-Q ایک ڈرام ڈال لیں اور آخر میں اس پانی سے سر دھلائیں۔ روزانہ ایک بار

کریں۔ خالو پالوں کو ختم کرنے کے لیے میرے کلینک سے APHRODITE منگائیں۔ اس کے لیے 700 روپے کا نسخہ آرڈر ڈاکٹر ہاشم مرزا کلینک کے نام پتے پر

ارسال کر دیں۔ مٹی آرڈر فارم کے آخری کوپن پر اپنا مکمل پتا اور مطلوبہ دوا کا نام APHRODITE ضرور لکھیں

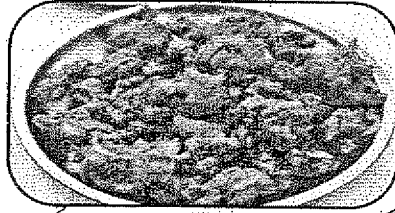
دوا آپ کے گھر پہنچ جائے گی۔

شہر دز عالم حیدر آباد سے لکھتے ہیں کہ میرا وزن 86 کلو ہے وزن کم کرنے کی دوا بتائیں۔

محترمہ آپ PHYTOLACCA-Q کے دس قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پی لیا کریں۔



پسا ہوا دھنیا 125 گرام ایک چائے کا چمچ  
 میسن کئی ہوئی رس بیری کئی ہوئی بلو بیری  
 لہسن پسا ہوا ایک چائے کا چمچ کٹا ہوا آم  
 آدھا کپ آدھا کپ آدھا کپ آدھا کپ  
 چری ترکیب:-



گرم سالہ پسا ہوا ایک چائے کا چمچ  
 پسا ہوا زیرہ ایک چائے کا چمچ  
 میٹھا سوڈا ایک چمچ  
 نمک حسب ضرورت  
 تیل (تلنے کے لیے) حسب ضرورت  
 ترکیب:-

پیاز، سبز دھنیا، سبز مرچ، باریک کٹی ہوئی، ایک پیالے میں میسن ڈال کر اس میں ملا لیں۔ دھنیا پاؤڈر زیرہ، لہسن، گرم سالہ، سرخ مرچ، نمک، میٹھا سوڈا پاؤڈر بھی شامل کر لیں۔ اب اس میں چکن کے ٹکڑے ڈالیں اور اچھی طرح مکس کر لیں تاکہ چکن پر میسن کی تہہ بن جائے۔ گرم آئل میں سرخ ہونے تک تلیں۔ کچپ کے ساتھ پیش کریں۔  
 نجم، نجم، انجم، انجم..... کراچی فریش فروٹ وٹا کس کریم

اجزاء:-

دودھ تین عدد  
 انڈے تین عدد  
 تازہ کریم آدھا لیٹر  
 لسی ہوئی چینی ایک کپ  
 وینلا ایسنس چند قطرے  
 کٹی ہوئی اسٹرابیری آدھا کپ

انڈے میں تھوڑا سا دودھ ڈال کر پھینٹ لیں۔ باقی دودھ کو دھیمی آگ پر پکائیں پھر اس میں چینی اور انڈے شامل کر کے مزید چند منٹ پکائیں پھر پیالے میں ڈال کر ڈھک دیں، ٹھنڈا ہونے کے بعد کریم شامل کر کے الیکٹرک بیٹر سے اچھی طرح پھینٹ لیں وینلا ایسنس اور کٹے ہوئی پھلوں کی آدھی مقدار ملائیں پھر اسے فریزر میں ٹھنڈا کرنے کو رکھ دیں۔ جب آئس کریم جم جائے تو کریم اور پھلوں سے سجا کر فریزر میں رکھیں اچھی طرح سے فریز ہونے کے بعد پیش کریں۔

نہرت، جینن، فیاض..... کراچی  
 خوبانی کا شربت

اشیاء:  
 خوبانی تیار کی ہوئی ایک کلو  
 عرق گلاب دو لیٹر  
 چینی ایک کلو

ترکیب:-  
 عمدہ قسم کی خوبانی لے کر دھو لیں۔ بیج نکال دیں ایک کلو خوبانی لے کر ایک لیٹر عرق گلاب میں پکائیں۔ جب خوب گل جائے تو اسے ملل کے گپڑے سے چھان لیں اب باقی عرق گلاب میں خوبانی کا عرق اور چینی ڈال کر پکائیں اور آٹھ دھیمی رکھیں جب تیار ہو جائے تو اتار لیں اور ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

صبا..... سرگودھا

عابدہ لکھتی ہیں کہ میرے چہرے اور تھوڑی بریال ہیں۔ کیا میں APHRODITE استعمال کر سکتی ہوں۔ اس کے منگنے کا طریقہ کیا ہے۔  
 محترم آپ 700 روپے کا نمٹی آرڈر میرے کینک کے نام پرے پر ارسال کر دیں۔ اپنا پتہ مکمل لکھیں۔ آپ کو دوا گھر پہنچ جائے گی۔ اس کے استعمال سے فالٹو ہال ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے۔  
 عرفان غوری کہہ رہے ہیں کہ لکھتے ہیں کہ بھائی کا قد چھوٹا ہے اور میرا مسئلہ بھی ہے۔  
 محترم آپ بھائی کو CALCIUM PHOS 6X کی چار گولی تین وقت روزانہ کھلائیں اور BARIUM CARB 200 کے پانچ قطرے ہر آٹھویں دن پلائیں اور آپ خود AGNUS CAST 30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں۔  
 دسم خان اودھی فیصل آباد سے لکھتے ہیں کہ اپنی میڈیکل رپورٹ بھیج رہا ہوں۔ میرے لیے کوئی دوا تجویز کر دیں۔  
 محترم آپ DAMIAXIA-Q کے دس قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پی لیا کریں۔  
 حورین غور غشتی سے لکھتی ہیں کہ میرے چہرے پر کالے لہلہ ہیں۔ اس کا علاج بتائیں۔  
 محترم آپ THUJA-Q کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ پیا کریں اور اسی کو تلوں پر لگایا کریں۔ مٹاپے کے لیے PHYTOLACCA-Q کے دس قطرے تین وقت روزانہ پی لیا کریں۔  
 محمد ریاض فوجی سرگودھا سے لکھتے ہیں کہ میں بہت پریشان ہوں میرے مسئلے کا حل بتائیں۔  
 محترم آپ STAPHISGARIA-30 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر تین وقت روزانہ

آپ کے پاس آئس کریم بنانے کی مشین ہے تو اس میں چار کلو کے قریب برف اور آدھا کلو سا رہ کا نمک ڈال کر برف جمائیں۔ آئس کریم فریج میں بھی تیار کی جاتی ہے مرکب تیار کرنے کے بعد سانچے میں ڈالیں اور فریجز میں رکھ دیں۔ ایک گھنٹے بعد اسے نکال کر خوب اچھی طرح پھینٹیں اور فریجز میں رکھ دیں دو تین بار یہ عمل دہرائیں تقریباً چار گھنٹے میں آئس کریم جم جائے گی۔

صائمہ شوکت..... ساہیوال  
ہاٹ چکن پلیٹرز

اشیاء:

مرغی (بغیر ہڈی) 6-8 ٹکڑے  
چائیز نمک 1/2 کھانے کا چمچ  
لیموں کا رس 1 کھانے کا چمچ  
سویا ساس 1 کھانے کا چمچ  
نمک حسب ذائقہ  
سفید مرچ 1 چائے کا چمچ  
انڈے 1/2 کپ  
تیل حسب ضرورت

ترکیب:

مرغی کے ٹکڑوں پر چائیز نمک، سفید مرچ، لیموں کا رس، سویا ساس لگا کر دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اب انڈے پھینٹ لیں اور چکن کے ٹکڑوں کو اس میں ڈپ کریں پھر بریڈ کر مرز میں لپیٹ کر تلتے جائیں۔ جب سنہری ہو جائیں تو نکال لیں مڑے دار چکن پلیٹرز تیار ہیں۔

آنسہ جاوید..... فیصل آباد  
سادہ لوجاٹ

اشیاء:

آٹا (بلی ٹریڈر کاٹ لیں) دو کپ

پیاز (چوپ کر لیں) ایک عدد  
ہرا دھنیا پودینہ ہری ایک چائے کا چمچ  
مرچوں کا پیسٹ  
اٹلی کی چٹنی  
چوتھائی چائے کا چمچ  
سرخ مرچ پاؤڈر 1/2 چائے کا چمچ  
زیرہ پاؤڈر 1/2 چائے کا چمچ  
چاٹ مسالہ 1/2 چائے کا چمچ  
لیموں کا رس ایک چائے کا چمچ  
دہی دو چائے کے کپچ  
نمک حسب ذائقہ  
تیل حسب ضرورت

ترکیب: آلو کو گرم تیل میں ڈال کر ڈیپ فرائی کر لیں اور نکال کر بکن پیپر پر رکھ دیں تاکہ اضافی تیل جذب ہو جائے، ایک پیالے میں آلو پیاز ہرا



دھنیا پودینہ ہری مرچوں کا پیسٹ اٹلی کی چٹنی سرخ مرچ پاؤڈر زیرہ پاؤڈر چاٹ مسالہ نمک لیموں کا رس اور دہی ڈال کر اچھی طرح ملا لیں۔ ہرے دھنیے سے سیجا کر پیش کریں۔  
پروین افضل شاہین..... بہاولنگر  
چکن پکوڑے

اشیاء:

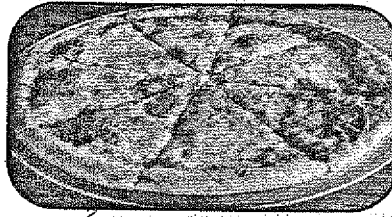
چکن (بغیر ہڈی کے ٹکڑے) 325 گرام  
پیاز (باریک کٹی ہوئی) ایک درمیانہ سائز  
سبز مرچ سبز دھنیا  
سرخ مرچ پاؤڈر ایک چائے کا چمچ

## چکن پکڑا

طلعت آغاز  
چکن پیزا

اشیاء:

میدہ  
تیل  
چاراؤنس  
ایک چائے کا چمچ



نمک 1/4 چائے کا چمچ  
خیر 1/4 چائے کا چمچ  
چٹنی 1/4 چائے کا چمچ  
پانی 1/4 کپ  
مرغی اٹلی ہوئی اور ریٹے ایک کپ  
کٹے ہوئے

ٹماٹو کچپ دو کھانے کے کپچ  
مرچ پیس ہوئی 1/4 چائے کا چمچ  
رائی پیس ہوئی 1/4 چائے کا چمچ  
تیل دو کھانے کے کپچ

ترکیب:

خیر کو پانی میں ملا لیں اور دس منٹ کے لیے چھوڑ دیں پھر اس میں میڈہ نمک چٹنی اور ایک چائے کا چمچ تیل ملا لیں اور اچھی طرح گوند لیں۔ آٹا نرم ہونا چاہیے گوندھنے کے لیے پانی بھی استعمال کر سکتی ہیں پھر اسے نرم کپڑے سے ڈھانپ دیں۔ جب تک کہ پھول کر دو گنا نہ ہو جائے۔ اب مرغی میں تمام

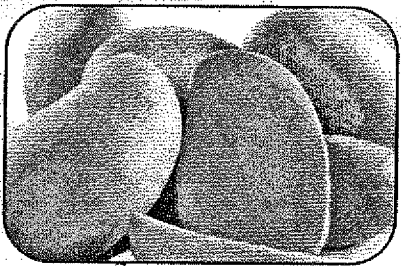
مسالے ملا دیں۔ تیل گرم کریں اور اس میں مرغی کو تلیں پھر کچپ ڈال کر گاڑھا گاڑھا بھون لیں۔ روٹی کو پیزا ٹرے میں رکھیں تھوڑا سا ٹماٹو کچپ پھیلائیں پھر مرغی کو پھیلائیں آخر میں پیئر کے ٹکڑے کر کے اوپر پھیلائیں۔ اوون میں آدھے گھنٹے تک بیک کریں۔

نوشین اقبال نوشی..... گاؤں بدرمرجان  
آم کی آئس کریم

اشیاء:

دودھ  
کسٹرڈ پاؤڈر 4 بڑے کپچے  
چٹنی  
قلمی والے آم  
ایک باؤ  
1/2 کلو

دودھ آبال لیں اس میں چٹنی ملا دیں۔ آدھا کپ ٹھنڈے دودھ میں کسٹرڈ پاؤڈر گھول کر دودھ میں

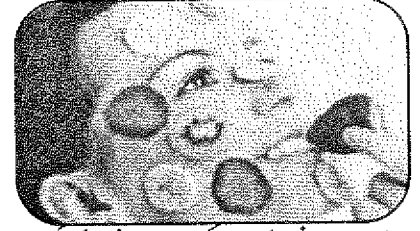


ملا دیں۔ کسٹرڈ پاؤڈر ڈالتے وقت کچھ برابر چلاتے رہیں تاکہ گھٹلی نہ بنے پھر اچھی طرح جچہ چلائیں۔ جب عمل ہو جائے تو دہی آٹا کر ٹھنڈا ہونے دیں۔ آم کا چھلکا اتار لیں اور باریک باریک ٹکڑے کاٹ لیں۔ گھٹلی الگ کر لیں اب اس گودے کو خوب پھینٹیں۔ کسٹرڈ ٹھنڈا ہونے پر اس میں آم شامل کر دیں۔ اب اس مرکب کو پھر سے خوب پھینٹیں اگر



## جلد کی حفاظت کا ضامن

جلد کی حفاظت کے سلسلے میں ماسک کا استعمال آج کل اگرچہ عام ہے۔ تاہم یہ کوئی انقلاب انگیز تصور نہیں



ہے جسے ہم ماسی کے دھندلوں میں تلاش نہ کر سکیں۔ ممکنہ طور پر ماسک کسی نہ کسی شکل میں صدیوں سے استعمال ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ماسک کے موجودہ فیشن کے ابتدائی دنوں میں بہت کم درازیں میں یہ دستیاب ہوتے تھے مگر اب ان کا حصول کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ بازار کے بازار ان سے بھرے پڑے ہیں۔ خاص طور پر مغربی ممالک میں طرح طرح کے ماسک آسانی مل جاتے ہیں۔

اب اصل مسئلہ ماسک تلاش کرنے کا نہیں بلکہ اس کے انتخاب کا ہے۔ کاروباری نقطہ نظر سے ماسک کے استعمال سے چہرے کی دلکشی میں اضافہ کے بارے میں پروپیگنڈے کے ڈھنگ سے پمپنگ کی جا رہی ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ چہرے کے ماسک کوئی جادوئی چیز نہیں ہیں کہ پلک جھپکتے میں چہرے کو دلکشی سے ہمکنار کر دیں اس کا بنیادی استعمال چہرے کی جلد میں داخل ہو جانے والی مٹی اور دھول کے ذرات کو نکال بھیجتا ہے۔ زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ یہ چہرے کی جلد کو مزید کھچاؤ دے اور اس میں دلکشی پیدا کرے۔

عام طور پر ماسک خوش گوشت مہک رکھتے ہیں ان کے استعمال سے چہرے کی جلد میں بڑے ہونے میں مدد ملتی ہے۔ مٹ جاتے ہیں اور جلد صاف ہو جاتی ہے۔ ماسک کی دنیا میں دلکشی کے حصول کے لیے ماسک کا استعمال بہت تیزی سے مقبولیت حاصل کرتا جا رہا ہے مگر یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کے قابل ہے کہ ماسک کی مدد سے چہرے کی دلکشی تو برقرار رکھی جاسکتی ہے۔ لیکن نوجوانی کو واپس نہیں لایا جاسکتا۔

ماسک کے استعمال کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان کی مدد سے جلد کو کھرچے بغیر فاضل خلیات کو دور کیا جاسکتا ہے اور یوں چہرے کی دلکشی کو برقرار رکھنے میں غیر معمولی سہولت دیتی ہے۔ ان کی مدد سے ان ماسک کو بند کیا جاسکتا ہے۔ جو چہرے میں غیر ضروری رطوبت پیدا کرتے ہیں۔ بھڑکیوں کو کم کرنے یا غیر نمایاں کرنے میں بھی ماسک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ رگڑ رگڑ کر صاف کرنے والوں کے لیے ماسک ایک راستہ ہے۔

### ماسک کی اقسام

یوں بازار میں کئی اقسام کے ماسک دستیاب ہیں تاہم انہیں بنیادی طور پر دو اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ ماسک جنہیں آپ جلد کو کھرچنے کے لیے استعمال کر سکتی ہیں۔

۲: دوسرے وہ ماسک جنہیں آپ سوکھنے پر دھو سکتی ہیں۔

بیوٹی سلیوز میں استعمال ہونے والے سرد یا گرم ماسک بیوٹی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔

گھروں میں بنائے جانے والے ماسک اگر ماسک گھر میں بنائے جائیں تو اس میں ایک فائدہ ضرور ہے اور وہ یہ کہ آپ کو اپنی جلد کے تقاضوں کے مطابق اس میں پگھلے رکھنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔ آج کل گھریلو ماسک استعمال کرنے کا رجحان بہت تیزی سے فروغ پا رہا ہے۔ تاہم گھر میں ماسک تیار کرنے کے سلسلے میں سب سے زیادہ پریشان کن مرحلہ یہ طے کرنے

کا ہوتا ہے کہ آپ کی جلد کس نوعیت کی ہے اور اس کے تقاضے کیا کیا ہیں؟

اس بات کے طے ہونے پر ہی یہ بتا جاسکتا ہے کہ گھر میں ماسک کی تیاری کے سلسلے میں کن کن چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ بہت سے ماسک پھلوں، سبز یوں، آندوں، دودھ اور وٹامن سے بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ انڈوں کا ماسک کے طور پر استعمال کرنے کا رجحان اس لیے زیادہ ہے کہ انڈے ہر قسم کی جلد پر طے جاسکتے ہیں اور پھر یہ بہت آسان طریقے سے استعمال ہوتا ہے۔ تازہ پھلوں مثلاً اسٹرابیری کو بھی ماسک کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسٹرابیری کو کاٹنے یا اسے اچھی طرح پھل کر چہرے پر ملنے اس طرح کیلئے کو بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کیلے میں وٹامنز، کیلشیم، فاسفورس اور یونٹیم کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ لہذا انہیں استعمال کرنے کا رجحان بھی عام ہے۔ عام طور پر کیلے حساس جلد کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ٹماٹر، پیچھے، دہی، بالائی والے دودھ، شہد کو بھی چہرے کی جلد کی حفاظت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

تجارتی بنانے پر تیار کیے جانے والے ماسک بازار میں دستیاب ماسک زیادہ مقبول اس لیے ہیں کہ انہیں استعمال کرنے میں بہت سہولت دیتی ہے۔ گھر میں ماسک کی تیاری کے لیے اجزائے ترکیبی کے حصول کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی ہے اور اس میں وقت بھی بہت ضائع ہو جاتا ہے۔ بازار میں دستیاب ماسک مختلف کمپنیاں برسوں کی تحقیق اور اچھی طرح سوچ بچار کے بعد بناتی ہیں۔ اس سلسلے میں لیبارٹری کی چیکنگ کا طریقہ کار مستند ہے اور یوں بازار میں دستیاب ماسک بہت اچھے نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔

آئیے بازار میں دستیاب چند ایک ماسک کا جائزہ لیں اور آپ کی جلد کے مطابق ان کا انتخاب کریں۔ ویسے تو بازار میں دستیاب ماسک بہت اچھے ہوتے ہیں۔ تاہم

چند "خانہ ساز" فارمولے بھی قابل ذکر ہیں تاکہ آپ کو اپنے طور پر کچھ کرنے کا موقع بھی ملے۔

### اسٹرابیری ماسک

نرم اور چمک دار جلد کے لیے یہ بہت مفید ثابت ہوتے ہیں ان کی تیاری کا فارمولا یہ ہے کہ ٹھیک بھر تازہ پکی ہوئی اسٹرابیری، لیموں ایک کپ میں آئینس ڈال کر اچھی طرح گاڑھا کر لیں پھر اسے چہرے اور گردن پر مل کر



سوکھنے دیں بعد میں اسے نیم گرم پانی کی مدد سے صاف کر لیں اس سے جلد میں تازگی اور چستی پیدا ہوگی۔ یہ ماسک بازار میں تیار صورت میں بھی دستیاب ہیں۔

### ککڑی کا ماسک

ککڑی میں سلفر اور کئی کان کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ خاص طور پر شام کے وقت جلد میں پیدا ہو جانے والی جھکن اور پر مڑوگی کو دور کرنے کے سلسلے میں یہ بہت مفید ہے اس کا فارمولا یہ ہے کہ ککڑی کے چند ٹکڑے لے کر دو چمچے پاؤڈر ملک اور ایک انڈے کے ساتھ اسے پھینیں۔ اسے چہرے اور گردن پر اچھی طرح ملیں، سوکھنے پر اسے نیم گرم پانی سے دھو لیں بعد میں چہرے اور گردن پر شہد پالی ڈالیں اور سوکھنے دیں۔

(باقی آئندہ ماہ)





تمہیں مجھ سے "محبت" ہے

غزل

کام دنیا کے پونہی ہم تو کیے جائیں گے  
کہاں کسی پل مگر ہم تجھ کو بھلائیں گے  
یاد رکھیں کے سدا تجھ سے ہی بھائیں گے  
ہم تو جاناں تجھ کو فقط تجھ کو ہی چاہیں گے  
دل دکھے گا روح گرلائے گی جب ہماری  
غم دل کس کو مگر جا کے ہم سنائیں گے  
کہیں پناہ نہیں ملتی، تیری چاہ نہیں ملتی  
بھلا کیسے خود کو ہم دکھ سے تیرے بچائیں گے  
تیری یادیں، چاہتیں، تحریریں، تصویریں  
کیا کیا نہ ہم دل پریشان کو دکھائیں گے  
ایک بار پھر تجھ جئے جو وہ ملتا ہے پھر کہاں  
دن تیرے زندگی مگر ہم کیسے جی پائیں گے؟  
طیہ شیریں، کوری خدا بخش، جل رہی ہوں میں اک بے نام سی پیش سے  
بس اک بار کہہ دونا!

بس اک بار کہہ دونا

اے میرے دوست!

پُچھ کیوں ہو.....؟

کچھ تو بولو.....

اداسیوں کی ردا میں لپٹا ہوا چاند

جگمگاتے ستارے

اور رات کا پھیلا آئینہ

تم سے ایک ہی سوال کر رہے ہیں

تم اتنے اداس کیوں ہو؟

جاننا جانا!

اب تو ان کے خول سے

باہر نکل آؤ

بس اک بار کہہ دونا

غزل

نہیں ہے جس کا جواب آج  
محبت ہے وہ سوال آج  
جس نے بکھیرے رنگ و بو  
پیار ہے وہ خواب آج  
زندہ تو ہے ہر کوئی لیکن  
زندگی کی تلاش ہے آج  
آنکھوں کے گہرے سمندر میں  
خوشیوں کی آس ہے آج  
ہنستا تو ہے ہر کوئی ہے  
ہنسی میں بھی پیاس ہے آج  
سحرش رانا

غزل

میرے شعروں میں رنگ بھر دو تم  
دل کی آنکھوں سے ہاں بھی کر دو تم  
میری سوچیں کشادہ ہو جائیں  
پس احساس بحر و بر دو تم  
دشمن فرقت میں ابر چھا جائے  
مجھ کو جو پیار کی نظر دو تم  
میں تمہارے لیے سنور جاؤں  
مجھ کو چاہت کا ایسا گھر دو تم  
مجھ میں کچھ اس ادا سے بس جاؤ  
صورتِ انجمن ہی کر دو تم  
اُڑ کے پہنچوں تمہارے دل تک میں  
اپنی الفت کا کوئی پر دو تم  
رہ نہ پاؤں تمہارے دن خانم  
مجھ کو ہی اپنے نام کر دو تم  
فریدہ خانم - لاہور

اے کہنا

رات سے پہلے شام کے بعد

آتی ہے ہر روز مجھے تیری یاد

ایچھے لمحے جو بیت گئے

جو ہاتھوں سے ریت کی مانند پھسل گئے

جب سوچوں تو آتی ہے بس تیری یاد

رات سے پہلے شام کے بعد

جدھر دیکھوں تو ہی ہے رو برو

ویران ہوں آنکھیں یا ہو پلکوں کی بھیگی باڑھ

اے کہنا

رات سے پہلے شام کے بعد

چاہوں بھی تو بھلا نہ پاؤں

ہ باتیں، ملاقاتیں، وہ چاہت کی برساتیں

تو پھر گز گیا جب سے بس یادیں ہیں میرے ساتھ  
رات سے پہلے شام کے بعد  
مدیر نورین مدوح - پرنالی  
موت بھی ضروری ہے

ذکیہ تبسم - جھنگ

تقدیر  
ہر قلم سے میری تحریر ہے  
ہر چہرے میں تیری تصویر ہے  
جانے کیوں مجھے ضدی ہے مقدر سے  
کہ تو ہی  
بس تو ہی میری تقدیر ہے  
رمضہ نازمین، حیدرآباد



میمونہ تاج

biazdill@aanchal.com.pk

فریدہ فری..... لاہور

یا مسیحائی اے بھول گئی ہے محسن  
یا پھر ایسا ہے کہ میرا زخم ہی گہرا ہوگا  
کنیز فاطمہ..... فیصل آباد

کوئی دھوکا نہیں ایسا جو نہ کھایا نہ ہم نے  
زندگی بھر ہی تیرا ساتھ نبھایا ہم نے  
بکھی محنت کا صلہ اپنی نہ پایا ہم نے  
چھاؤں اوروں کو ملی پیڑ لگایا ہم نے  
شانہ امین راجپوت..... کوٹ رادھا کیشن

بے فائدہ ہے زیست میں احباب کا ہجوم  
ہو پیکر خلوص تو کافی ہے ایک شخص  
صفیہ الطاف..... بستی گھاڑو

وہی محفوظ رکھے گا میرے گھر کو بلاؤں سے  
جو بارش میں شجر سے گھونسلے گرنے نہیں دیتا  
پاکیزہ محرم..... تلہ گنگ سکھر

زندگی میں آرزو کی طرح ہر سانس میں خوش بو کی طرح  
وہ میرے انگ انگ میں بسا ہے گویا روح کی طرح  
یاسمین عندلیب..... شور کوٹ کینٹ

تو چھڑا تو احساس ہوا تیرے سنگ تھی ہر خوشی  
میری پہچان کے جاناں سارے تجھ سے حوالے تھے  
نایلہ اشفاق..... کوٹ غلام محمد

مجھ سے نفرت کی عجب راہ نکالی اس نے  
ہنستا ہستا دل کر دیا خالی اس نے  
میرے گھر کی روایت سے وہ خوب واقف تھا

جدائی مانگ لی بن کر سوالی اس نے  
عائفہ خالدہ..... منڈی بہاؤ الدین  
تم بہت سال رہ لیے اپنے  
اب میرے، صرف میرے ہو کے رہو  
سعدیہ اجمل..... گوجرانوالہ

کوئی وعدہ نہیں پھر بھی انتظار تھا  
دور ہونے پر بھی اپنے پیار پر اعتبار تھا  
نہ جانے کیوں بے رخی کی اس نے ہم سے  
کیا ہم سے بھی زیادہ کوئی اس کا طلب گار تھا  
سیدہ جیانتوی..... تلہ گنگ

جس شخص کو آغوش محبت میں لیا ہے  
اس شخص نے ہر موڑ پہ دھوکا ہی دیا ہے  
میں وقت کی چوکھٹ پہ کھڑا دکھ رہا ہوں  
انسان کے کردار سے انسان خفا ہے  
طلہ ہما..... فیصل آباد

کیا خبر اس کے تعاقب میں ہوں کتنی سوچیں  
اپنا انداز تو اوروں سے جدا رکھنا تھا  
چاندنی بند کواڑوں میں کہاں اترے گی  
اک دریچہ تو بھرے گھر میں کھلا رکھنا تھا  
رخسانہ قاسم..... کراچی

تم سے کب ہم نے ملاقات کا وعدہ چاہا  
دور رہ کر تجھے کچھ اور زیادہ چاہا  
یاد آئی ہے تیری اور بھی شدت سے ہمیں  
بھول جانے کا تجھے جب بھی ارادہ چاہا  
ثمینہ مغزل..... ایبٹ آباد

مزا برسات اکا چاہو تو ان آنکھوں میں آ بیٹھو  
وہ برسوں میں کبھی برسیں، یہ برسوں سے برسی ہیں  
سمیرا بانو ندیم..... اسلام آباد

بہت خوش نصیب کل کی رات گزری  
کچھ تنہا پر کچھ خاص گزری

غزل

نہیں در کھولنا دل کا مجھے ہر ایک آہٹ پر  
اپنے نام کی خوش بو سے مہر کا جاؤ  
بوا آنکھیلیاں کرنے لگی ہے گھر کی چوکھٹ پر  
میں تم سے محبت کرتی ہوں  
تیری پلکیوں کی ڈالی پر ستارے جب چمکتے ہیں  
تم میری محبت بن جاؤ  
کوئی دل بیٹھ جاتا ہے پھر ان کی جھللاہٹ پر  
بس میری محبت بن جاؤ  
کبھی منزل سے پہلے حوصلہ گر ہار جائے تو  
رستے مسکراتے ہیں مسافر کی تھکاوٹ پر  
پہاں جب سانس لینے کو ہوا خالص نہیں ملتی  
وہ دن وہ راتیں  
تجرب کس لیے کرنا محبت میں ملاوٹ پر  
وہ ہماری الجھی سی باتیں  
وہ جس نے خاک کے پتلے کو پھر سے خاک کر ڈالا  
ان ہی باتوں میں ایسی بات کہہ دینا  
اسی کا نام لکھا ہے ہمارے دل کے لاکٹ پر  
جس کا کوئی معنی نہ ہو  
گلابی ہونٹ ایسے ہیں کہ جیسے پگھڑی گل کی  
بڑی بڑی باتیں  
میں دل کو ہار بیٹھا ہوں تمہاری مسکراہٹ پر  
چٹکیوں میں اڑا دینا  
یہ شام زیست ڈھلنے تک رہیں گی منتظر آنکھیں  
خودرونا، خود ہی ہنستا  
صبا پیغام لائی ہے کہ وہ آئے گی پگھٹ پر  
کہاں گئے وہ دن  
عجب سی تیرگی پھیلی ہوئی ہے چار سو ارشد  
کہاں گئیں وہ راتیں  
دکھائی کچھ نہیں دیتا مگر ہیں کان آہٹ پر  
وہ ہماری ساری بے معنی سی باتیں  
ارشد محمود ارشد۔ سرگودھا  
کسی کو نہ بتانا نہ کسی سے پوچھنا  
شاید وہ ہی لمحے  
ہاں وہی لمحے کا سیاب تھے

انجم خان۔ ہری پور ہزارہ

جس طرح  
ہر دل میں محبت ہوتی ہے  
ہر سانس محبت ہوتی ہے  
ہر دھڑکن محبت کہتی ہے  
اسی طرح  
میرا دل، میری سانس، میری دھڑکن، میرے سپنے  
بس تم سے محبت کرتے ہیں  
پھر آئے تم  
میرے دل کی دھڑکن بن جاؤ  
میری سانس محبت کر جاؤ

کنیز فاطمہ، فیصل آباد

بہت مایوس لمحوں میں  
اک امید کا جگنو  
کتنی مشکل سے چمکا تھا  
جو تم نے روند ڈالا ہے  
بتاؤ اب ہمارے پاس  
جننے کے لیے ہدم!  
کیا کوئی حوالہ ہے؟

سباس گل۔ رحیم یار خان

نہ نیند آئی نہ خواب کوئی  
بس تیرے خیالوں کے ساتھ گزری  
اسماء عطاریہ..... لیاقت آباد کراچی  
ان کی آنکھوں میں بھی ہلکی سی نمی رہتی ہے  
بات کرتے ہیں جو ادوروں کو ہنسانے کے لیے  
قسم ناز..... گوجرانوالہ  
تیرے فراق میں دل کی اداس گلیوں میں  
عجب حشر سا برپا دکھائی دیتا ہے  
کتاب کھول کر دیکھوں تو آنکھ روتی ہے  
ورق ورق تیرا چہرہ دکھائی دیتا ہے  
مقدس رباب..... چکوال  
ابھرتے ڈوبتے سورج سے توڑ لوں رشتہ  
میں شام اوڑھ کے سو جاؤں اور سحر نہ کروں  
اب اس سے بڑھ کر بھلا کیا ہو احتیاط وفا  
میں تیرے شہر سے گزروں، تجھے خبر نہ کروں  
یا مبین کنول..... پسرور  
وہ جو بوڑھا گلگی میں رہتا ہے  
حال پوچھو تو بس دعا دے گا  
سارہ لکڑیاں..... سیال موڑ  
زندگی تو کب کی ہو گئی خاموش  
دل تو بس عادتاً دھڑکتا ہے  
راشدہ شریف چوہدری..... اوکاڑہ  
سانسوں کا ٹوٹ جانا تو عام سی بات ہے محسن  
جہاں اپنے یاد کرنا چھوڑ دیں موت اس کو کہتے ہیں  
مسز نگہت عقیقا..... کراچی  
حد اور اک سے آگے بھی تیری قرب کی شام  
ڈھونڈھنے تجھ کو کہاں چاند ستارے جاتے  
تجھ سے منسوب ہوئے ہیں تو یہ حسرت ہی رہی  
ہم بھی اپنے حوالے سے پکارے جاتے  
شگفتہ خان..... بھلوال

کتاب سے دلیل دوں یا خود کو سامنے رکھ دوں  
وہ مجھ سے لوجھ بیضا ہے محبت کس کو کہتے ہیں  
سلطنتی ملک..... قادر پور راس  
پیار ہو جائے تو اظہار نہ کرنا  
خود کو کسی کے لیے بے قرار نہ کرنا  
قدم قدم تجھے دھوکے ملے گا سلطنتی  
کبھی کسی تجھبی کا اعتبار نہ کرنا  
اقرا اسما..... جنگو جہلم  
تم مجھے خاک بھی سمجھو تو کوئی بات نہیں  
خاک اڑتی ہے تو آنکھوں میں سما جاتی ہے  
دیپلی..... میر پور آزاد کشمیر  
تجھے اکیلے پڑھوں کوئی ہم اسب نہ رہے  
میں چاہتا ہوں کہ تجھ پہ کسی کا حق نہ رہے  
سارہ وڑائچ..... اوکاڑہ  
اک دن میں نے اس سے پوچھا تیرا منشا کیا ہے  
اس نے ریت پہ میرا نام لکھا اور مٹا دیا  
خواجہ عرفانہ محبوب..... جٹوٹی  
روز ڈھلتا ہوا سورج یہ مجھ سے کہتا ہے فراز  
آج اس کو بے وفا ہوئے اک اور دن گزر گیا  
سحرش رانا..... ننڈی بھٹیاں  
کسی نے کہا ہے کسی سے نہ کہنا  
لگے چوٹ دل پہ تو خاموش رہنا  
کہو گے کسی سے بے گار زمانہ  
مگر اس ادا سے کہ رو دے زمانہ  
احم خان..... کھلاٹ کالونی  
اس دل کے چند اناٹوں میں اک موسم ہے برساتوں کا  
اک صحرا اجڑی راتوں کا اک جنگل وصل کے خوابوں کا  
اس چوہوں رات کے سائے میں جب آخری بار ملے تھے ہم  
پاگل دل کب بھولتا ہے وہ باغ سفید گلابوں کا  
شگفتہ خان..... بھلوال



جویریہ طاہر

yaadgar@aanchal.com.pk

القرآن

ان لوگوں کے راستے پر جن پر ٹوٹنے اپنا (فصل  
اور) انعام کیا (جو لوگ قبول شریعت کے ساتھ چلے  
سلوک کھڑے، میں رہے۔ جمال نعمت باطن سے فیض  
یاب ہوئے محمد میں آگئے یعنی یسوع ہو کر خدا کا  
نام لے کر خدا کے حکم پر چلے رہے۔ جن پر نہ تیرا  
غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔ (مکتوب سے عاصی  
اور ضالین سے بد عقیدہ و ناقص لوگ مراد ہیں)۔  
(البقرہ ۶ تا ۷)

حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”تین باتیں  
نجات دینے والی ہیں اور تین باتیں ہلاکت میں  
ڈالنے والی ہیں۔ نجات دینے والی تین باتیں یہ ہیں:  
۱۔ کھلے اور چھپے اللہ کا تقویٰ اختیار کرنا۔ ۲۔ خوشی اور  
ناخوشی (ہر صورت) میں حق بات کہنا۔ ۳۔ ناداری ہو  
یا خوش حالی (ہر حالت میں) اعتدال اور میانہ روی  
کی راہ پر چلنا۔ ہلاکت میں ڈالنے والی تین باتیں یہ  
ہیں: ۱۔ ایسی خواہش جس کا انسان تابع اور غلام بن  
کر رہ جائے۔ ۲۔ ایسی حرص جسے مقتدا اور پیشوا مان لیا  
جائے۔ ۳۔ خود پسندی فرمایا یہ بیماری ان تینوں میں  
زیادہ خطرناک ہے۔“

(بیہقی)

اعمال موقی

جب دوست مانگے تو کل کا سوال ہی نہیں ہوتا۔  
جی بات کہنے سے پہلے اگر اسے بار بار تولا جائے

تو اس کا وزن گھٹ جاتا ہے۔  
خاموشی اعلیٰ ترین نقد ہے۔  
ایک لمبی زبان عمر کو چھوٹا کر دیتی ہے۔  
پتو مارنے کے لیے قالین نہ جلاؤ۔  
جس کا بیٹ بھرا ہودہ کچھ نہیں سیکھتا۔

شدید خواہشات لا حاصل ہوتی ہیں اور یہ ان  
لوگوں کا مقدر بنتی ہیں جنہوں نے کبھی ان کی حسرت  
بھی نہ کی ہو۔

تنہائی میں کوئی بھی شخص کبھی گھٹن کا شکار نہیں ہوتا  
کیونکہ اس وقت اپنی پسند کے کبھی لوگوں کا جھوم ہوتا  
ہے۔

عشق وہ مقام ہے جہاں ”کچھ پانے“ کے  
بجائے ”سب کچھ لٹانے“ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔  
بعض رشتے ایسے ہوتے جنہیں نبھاتے ہوئے  
پل صراط سے گزرنے کا گمان ہوتا ہے۔

کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جنہیں جوڑے رکھنا  
توڑ دینے سے زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔

کچھ لوگ ان گھروں کی طرح ہوتے ہیں جن  
میں رہنے کو دل کرتا ہے۔

انا شاہ زاد..... گجرات  
عظیم رہنما

قائد ملت نواب لیاقت علی خان آل انڈیا مسلم  
لیگ کا حصہ بنے تو انہوں نے اپنی تمام جائیداد اور  
دولت مسلم لیگ کو دے دی۔ شہادت کے بعد جب  
ان کا بیٹک اکاؤنٹ دیکھا گیا تو اس میں صرف بیس  
روپے تھے۔

سمیر امین ملک..... اسلام آباد  
ماں کی عظمت

☆ جو جنت کا طالب ہے اسے چاہیے کہ وہ ماں  
کی خدمت کرے۔ (شیخ سعدی)

☆ اس کائنات میں صرف ماں وہ ہستی ہے جس  
کی دعا بچوں کے حق میں جلد قبول ہوتی ہے۔ (حکیم)



☆ جس کی ماں مر جائے وہ اس کائنات کا مفلس ترین شخص ہے۔ (گوئے)

☆ ماں کی محبت کبھی بھی دکھاوے کے لیے نہیں ہوتی۔ (نپولین)

☆ کتنا بد قسمت ہے وہ شخص جسے ماں کے ہوتے ہوئے بھی اس کی محبت حاصل نہ ہو۔ (کارلائل)

☆ ماں سے زیادہ ہمدرد ہستی اس دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔ (خلیل جبران)

☆ ماں کے بغیر گھر قبرستان کی طرح ہے۔ (اورنگ زیب)

گلزار زمان گل..... مان

یادیں

”یادیں“ جو تین الفاظ کا مجموعہ ہے۔ کیا ہوتی ہیں یادیں کہ ساری عمر انسان کا چھٹا نہیں چھوڑتیں جب یادوں کے دریچے کھلتے ہیں تو کھلتے ہی چلے جاتے ہیں۔ یادیں سچ بھی ہوتی ہیں اور شیریں بھی۔ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جس کے پاس یہ خزانہ نہ ہو۔ آنسوؤں کا یاد سے گہرا تعلق ہے جب دل روتا ہے تو آنکھ بھرتی ہے لیکن بعض اوقات کچھ لوگ اپنے چہروں پر ایسی خوب صورتی سے مسکراہٹ سجا کر رکھتے ہیں کہ دوسروں کو احساس تک نہیں ہوتا کہ اس کے اندر کتنا طوفان چھپا ہے۔ یادوں کو دوست بھی کہا جاتا ہے کہ یہ انسان کو زندگی کے کسی بھی لمحے تنہا نہیں ہونے دیتیں۔ کچھ لوگ یادوں کے سہارے زندہ رہتے ہیں یادیں تو نعمت ہیں رب کی جو انسان کو عطا کی گئی ہے۔

رانی اسلام..... گوجرانوالہ

دنیا صرف لڑکیوں کے لیے ہے

لڑکی زور سے ہنستے تو خوب صورتی۔

لڑکا زور سے ہنستے تو ڈنکر۔

اگر لڑکی بیٹھا بولے تو پیاری لگے۔

لڑکا بیٹھا بولے تو فریادیا۔

لڑکی شایگ کرے تو رواج۔

لڑکا شایگ کرے حرام دے پیسے جو ہونے۔

لڑکی خاموش رہے تو عمل کمین۔

لڑکا خاموش رہے تو تنوں کی موت یہ گئی ہے۔

لڑکیاں مل کے چلیں تو گر روپ۔

لڑکے ل کر چلیں تو بے غیرتاں داٹولا۔

درخشاں بی..... چوناہ

اچھی بات

نیکی کر کے اسے بھول جایا کرو۔

جیسے گناہ کے وقت اپنے رب کو بھول جاتے ہو!!

طیبہ طاہرہ سعیدہ طاہرہ..... صدر گجرات

کشف

ہونٹ بے بات ہنسے

زلف بے وجہ کھلی

خواب دکھلا کے مجھے

کس سمت چلی

خوش و لبرانی

میرے کان میں سرگوشی کی

اپنی شرمیلی ہنسی میں نے ہنسی

اور پھر جان گئی

میری آنکھوں میں

تیرے نام کا تارہ چکا

تسلیم چوہدری..... آکسفورڈ یو کے

میری زندگی سچی ہے دو آنکھوں سے اے دوست!

اک یہ میرا آنچل اک تُو میرا ”آنچل“

تجھے لوں تو ڈانٹ پڑتی ہے نہ لوں تو ڈانٹ

اب کیا کرے کاہل کچھ تُو ہی بتا ”آنچل“

سمیرا کاہل صدیقی..... جنڈانوالہ بھکر

اعتاد

چھتری بارش کو نہیں روک سکتی مگر اس کی وجہ سے

ہم بارش میں بھیکے بغیر کھڑے ہونے کے قابل

ہوتے ہیں۔ اعتاد ہمیں کامیابی نہیں دلاتا مگر ہمیں وہ قوت دیتا ہے جس کے ذریعے ہم مشکلات کا سامنا کر سکتے ہیں۔

انتخاب: دعا زاہد حسین ہاشمی..... فصل آباد

مزاحیات

ایک موٹی عورت کے گھر چور گھس گیا۔ چور چوری

کر کے بھاگ رہا تھا کہ برتن گرنے کی آواز سے

موٹی عورت جاگ کئی اور چور کے اوپر بیٹھ گئی۔ میاں

سے کہنے لگی۔

”جاؤ پولیس کو بلاؤ۔“

شوہر: ”مجھے جوتے نہیں مل رہے۔“

چور کراہتے ہوئے: ”اے میری چنبل پہن کر

جلدی جا! میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

عشاء اہل..... جہلم

اچھی بات

ہمارے دلوں میں اتنی تھوڑی جگہ کیوں ہے کہ ہم

تمام رشتوں سے ایک جیسی محبت نہیں کرتے۔

(فرحت اشتیاق)

جو کسی کی چھوٹی سی غلطی معاف نہیں کر سکتا وہ کیسے

یہ یقین کر لے کہ خدا اس کے بڑے بڑے گناہ

معاف کر دے گا۔

(عمیرہ احمد)

جن سے محبت کی جاتی ہے ان کے لیے دل میں

ایک قبرستان بھی بنا دیا جاتا ہے جس میں اپنے محبوب

کی ساری خامیاں دفن کر دی جاتی ہیں اور ان پر کتبے

بھی نہیں لگائے جاتے۔

(نمرہ احمد)

جو کسی کا ”سرف“ ہوتا ہے وہ کسی کا ”سب“ کچھ

ہوتا ہے۔

(رفعت سراج)

کبھی بڑوں کو بھی چھوٹوں کے آگے جھک جانا

چاہیے اس سے ان کی عزت میں فرق نہیں آتا بلکہ

چھوٹوں کو بھی بھکانا آ جاتا ہے۔

(عمیرہ احمد)

کبھی کبھی تقدیر ہمیں مٹی کے پیالے میں امرت

پیش کرتی ہے مگر ہم مٹی کے پیالے کو حقارت سے

دیکھتے ہوئے ہنسنے لگتے ہیں۔

(راحت جبین)

ہر زمین اڑیاں رگڑنے کے لیے نہیں کیونکہ ہر

زمین کے نیچے آب زم زم نہیں ہوتا۔

زمین انسان کا مسکن ہے جو اسے جھک کر نہیں

چھو تا وہ ٹوٹ کر زمین بوس ہو جاتا ہے۔

(زہرہ ممتاز)

اگر پہلے سفر کی صعوبتوں اور دکھوں کی وجہ سے

پاؤں آبلہ پا اور وجود تھکاوٹ سے پُور ہو تو کبھی

دوسرے سفر کا ارادہ فوراً نہیں کرنا چاہیے۔ منزل تک

رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔

(شگفتہ ہنسی)

نظم

ہم وہ پھول ہیں

جو روز نہیں کھلتے

وہ ہونٹ ہیں جو

کبھی نہیں ملتے

ہم سے بچھڑو گے

تو احساس ہوگا تمہیں

ہم وہ دوست ہیں

جو روز نہیں ملتے

نوشین عرفان..... نیورا جو پنڈی باغان

آپچل

آلا رام و سکون مہیا کرتا ہے۔

ن۔ نفرتوں کو دلوں سے مٹا دیتا ہے۔

ج۔ چاہتیں بکھرتا ہے ہر سو۔

ل۔ لا دو مجھے میرا آپچل۔

مہرین آصف بٹ..... سہنہ



نادیدہ عباس..... موسمی خلیل۔ پیارے اگل اور اچل اشاف کو میری طرف سے پُر خلوص اور محبتوں بھر  
سلام قبول ہو۔ یہ میرا اچل میں پہلا خلوص نامہ ہے۔ مجھے آچل بہت پسند ہے اور اس کا سلسلہ وار ناول ”یہ چاہتیں یہ  
شدتیں“ بہت پسند تھا۔ پیچہ زکی وجہ سے اس کی آخری مین اقتدا نہیں پڑھ سکی۔ بانی سب ناول بھی بہت اچھے ہیں اور اگلی قسط  
کا انتظار رہتا ہے۔ امید ہے آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے اور میری تحریروں کو اپنے آچل کے قیمتی صفحات میں جگہ دیں  
گے۔ اب ہر ماہ کچھ نہ کچھ ارسال کرتی رہوں گی۔ یہ شرط یہ کہ آپ میری تحریریں شامل اشاعت کر کے میری حوصلہ افزائی  
کریں۔ مجھے شدت سے اگلے شمارے کا انتظار ہے جس میں میری تحریریں شامل ہوں گی۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔  
سانسوں نے وفا کی تو پھر ملیں گے۔ اللہ حافظ۔

منسز ارم جاوید احمد..... کراچی۔ سلام دوستانہ! سب کیسے ہو؟ بہت عرصے بعد خط لکھ رہی ہوں۔ میرا تم نے  
ناول کا اختتام اتنا اچھا کیا ہے کہ مجھے قلم اٹھانا ہی پڑا۔ راحت و فانی بھی بہت اچھا اختتام کیا پڑھ کر مزہ آ گیا۔ عشاقی! آپ کا  
ناول بھی بہترین جا رہا ہے۔ نازیہ کی پلیز امامہ کو ٹھیک کر دیں۔ بہت بے وقوفی کر رہی ہے وہ۔ وہ شجاع کے ساتھ ہی بچے کی  
پلیز! انسا نے سب ہی بہترین رہے۔ عالیہ حرا کی ”روشنی اور راستہ“ اچھی لگی۔ حسین انجم انصاری کا مکمل ناول بھی بہترین رہا۔  
سروے کا سلسلہ بہت اچھا لگا اچھا اجازت فی امان اللہ۔

علیہا رانا عقیلہ شاہ..... تلمیہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اس دفعہ آچل میں 21  
تاریخ کو ناول کا آغاز ”پتھروں کی پکلیوں پر“ سے کیا۔ امامہ پہ بہت ہی زیادہ غصا یا دل نے کہا جہات بار کرکٹ گم کر دیں۔  
شجاع کے ساتھ نا انصافی ہوئی۔ ایمان کی بہت خوشی ہوئی۔ عباد پہ بہت زیادہ غصا یا کہ اس نے صاعقہ کو دھوکا دیا اور ہادیہ کو پوز  
کر دیا۔ پلیز عباد کو صاعقہ سے دور نہ کریں۔ ورنہ..... اس کے بعد ہم نے چھانگ لگائی ”اور کچھ خواب“ یہ پہنچ گئے۔ اچانک آنے  
والے ایمان کے ساتھ اچھا نہیں کیا اور پلیز پلیز یاسا کے مافی والا سپنس ختم کر دیں اور عدنان سے ملا دیں اور ناول سوسو تھے۔ اقراء  
صغیر احمد کے ”بیکس پکلیوں پر“ پہلی قسط اچھی لگی۔ امید ہے باقی بھی اچھی ہوں گی۔ پاکیزہ محرمی غزل ”وہ کہتا تھا“ بڑی پسند آئی۔

ندیلہ انجم عقیلہ شبنام ذیل..... فیصل آباد۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ و مغفرت۔ شہلا آبی اور اچل  
اشاف کیسے ہیں آپ؟ قارئین کرام میں بھولی تو نہیں لوگوں کو نہیں ہیں آپ سب؟ جی امید ہے سب خیریت سے ہوں گی۔ ہم  
آپ سب کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہیں۔ ایک تو میں مصروف ہی دور ایشی آچل اشاف سے ناراض تھی کیونکہ مجھے لگا  
تھا میں کبھی بھی ان کے دلوں میں جگہ نہیں بنا سکتی۔ اس لیے اب لکھنا چھوڑ رہی تھی لیکن اس دفعہ امید کی کرن نظر آئی کہ کدو فی  
آچل اشاف کو طرف نہیں۔ اس دفعہ آچل 24 مئی کو ہی خلاف معمول مل گیا اور ایک ہی رات میں سارا چٹ کر ڈالا۔ آچل ہاتھ  
میں لیے ہی سب سے پہلے ”سُرگوشیاں صمد وفت“ سے دل اور روح کو سیراب کیا۔ پھر شاہدہ جمیل اور ذہنی رانا سے ملاقات ہوئی۔  
بھئی شاہدہ آپ کا تعارف بڑا اچھا تھا۔ ہمیشہ ہی انسان کو خوش اخلاق اور نیک دل ہونا چاہیے۔ ذہنی رانا کی بہت خوشی ہوئی آپ  
سے مل کر۔ عربی پڑھ رہی ہیں اور فت خواں ہیں آپ کا تعارف تو میرے دل کو بھرا گیا۔ دل چاہتا ہے کہ اڈ کر آپ کے پاس  
آ جاؤں مگر ڈر لگتا ہے کہ کہیں آپ بچپانے سے انکار نہ کریں۔ (بھلا میری کیا عزت رہ جائے گی) جی بالکل اجازت ہے آپ کو  
دوستوں کے حلقے میں آنے کی۔ پیاری آبی میرا جی آپ نے ”یہ چاہتیں یہ شدتیں“ کا بہت پیارا اختتام کیا میری دعا ہے کہ اللہ  
تعالیٰ آپ کو جلدی سے اچھا کر دے۔ آپ کی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے۔ حسین انجم انصاری! آپ نے تو کمال کر دیا۔

دفعہ سنا ہوگا۔ ناامیدی گناہ ہے۔ امید اور بھروسہ یہ وہ  
لفظ ہیں جن کے سہارے ہم لوگ زندگی گزارتے  
ہیں۔ امید ایک ایسا دیا ہے جو اس وقت تک جلتا رہتا  
ہے جب تک انسان کے دل میں امید کی شمع جلتی  
ہے۔ جب یہ شمع بجھ جاتی ہے تو امید کا دیا بھی انسان  
کی زندگی میں اندھیرا کر دیتا ہے۔ امید کا اختتام کبھی  
نہیں ہوتا۔ جب تک انسان چاہے اسے زندہ رکھ سکے  
ہے۔ انسان کو کوئی بھی کام کرتے ہوئے امید کی رسی  
کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ خود پر بھروسہ رکھ کر امید کا  
دامن پکڑے رہنا چاہیے۔ ناامیدی جب حد سے  
زیادہ بڑھتی ہے تب جان دینے کی نوبت آتی ہے۔  
یہ تو امید ہی ہے جو جان جانے نہیں دیتی۔ ورنہ کیا پتا  
دنیا میں قیامت ہی قیامت ہوتی۔

نمرہ انور..... گوجرانولہ  
ایک اچھی بات

سب سے جلدی راضی ہونے والی ہستی اللہ کی  
ذات ہے۔ ہماری ندامت کا ایک آنسو اسے ہمارا  
بہت قریبی دوست بنا سکتا ہے اور جس کا سب سے  
قریبی اللہ ہو تو اس کا کوئی کام کیسے رک سکتا ہے؟  
فرزاند اکرام..... سرگودھا



انتباہ  
ماہنامہ آچل میں شائع کیے جانے والے فرمان الہی  
اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ادارہ مستند حوالوں  
کے ساتھ خود شائع کرتا ہے۔ لہذا قارئین کرام سے  
گزارش ہے کہ وہ کوئی بھی فرمان الہی و احادیث  
ادارے ارسال کرنے سے گریز کریں۔  
ادارہ

آنسو  
چار حرف پر مشتمل یہ لفظ یہ نمکین پانی کے چند  
قطرے جن کو ہم لوگ ”آنسو“ کہتے ہیں۔ اپنے اندر  
غم اور خوشی دونوں سیٹھے ہوئے ہیں۔ غم کے موقع پر  
آنسو ٹپکنا ایک عام سی بات ہے کیونکہ آنسو ہی غم کا  
اظہار ہے اور یہ آنسو ہی غم میں انسان کا ساتھ دیتے  
ہیں مگر بہت زیادہ خوشی ملنے پر بھی آنسو ٹپکتے پڑتے  
ہیں۔ وہ آنسو خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ آنسو بھی  
بچپلوں کی مانند ہیں جو غم اور خوشی دونوں میں ہی  
انسان کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہ مختلف انداز میں  
آنکھوں سے بہتے ہیں۔ کسی کے کچھڑنے پر کسی کی  
جدائی پر یا کسی کے اچانک مل جانے پر یا آنسو موتیوں  
کی طرح ہماری آنکھوں سے بہنے لگتے ہیں اور ان دو  
دھاروں میں ہماری زندگی بہتی چلی جاتی ہے۔  
طیبہ نذیر..... مہجرات

مزاحیات  
مشہور مسائنندگان آئن اسٹائن ایک دفعہ بس میں  
سفر کر رہے تھے وہ کچھ ضروری کاغذات بس میں  
پڑھنا چاہتے تھے۔ کاغذات نکالے تو انہیں یاد آیا کہ  
عینک تو گھر پر ہی بھولی آئے ہیں اس لیے انہوں نے  
اپنے پاس بیٹھے ہوئے مسافر سے درخواست کی کہ  
ازراہ کرم یہ کاغذ پڑھ دیں۔

اس پر مسافر نے جمل کر کہا۔ ”معاف کیجیے میں  
بھی آپ کی طرح جاہل ہوں۔“

شبانہ امین راجپوت..... کوٹ رادھا کشن  
گناہ گار  
گناہ کو پھیلانے کا ذریعہ کبھی مت بنو کیونکہ ہو سکتا  
ہے تم تو تو بہرہ لو پر جس کو تم نے گناہ پر لگایا وہ تمہاری  
آخرت کی تباہی کا سبب بن جائے۔

مریم جبین..... نکال  
امید  
امید پر ہی دنیا قائم ہے۔ یہ جملہ ہم نے بہت

انسان کو کبھی بھی اپنے حسن پر ناز نہیں کرتا چاہیے۔ بے وقوف ہیں وہ لوگ جو اپنے حسن پر ناز کرتے ہیں۔ فاروق کا کردار بہت اچھا تھا۔ نرم دل، نرم مزاج، عالیٰ کی "روشنی اور راستہ" بھی اچھی تھی۔ اچھا ہوا اور اورادیں سزا کے قابل تھے۔ "اور کچھ خواب" شکر ہے اس دفعہ ان کا تھوڑا سا لائق بنائی۔ "پتھروں کی پلکوں پر" امامہ کی قدر سر بھری لڑکی سے دل تو کرتا ہے میرے سامنے ہوتا اس کے منہ پر دو پتھر لگا دوں۔ باقی سب کہانیاں معمول کے مطابق اچھی تھیں۔ اس دفعہ "بیاض دل اور آپ کی پسند" میں آنا چاہتی ہوں دین کی جگہ۔ "یادگار لکھے" بہت اچھے تھے۔ باقی رسالہ ابھی پڑھنے والا ہے اس لیے اس کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتی۔ میرے لیے اور میری دوست کے لیے دعا کرتا پلیر اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے امتحان میں کامیاب کر دے اور اللہ تعالیٰ باقی سب کو بھی دینا اور آخرت کے امتحانوں میں آسانیاں فرمائے آمین۔ کراچی شہر اور ہمارے پیارے ملک پاکستان، کشمیر، فلسطین کو حق عطا فرمائے۔ اب اجازت چاہوں گی خلوص دل سے دعاؤں اور نیک نواؤں کے ساتھ خدا کے اللہ حافظ۔

تذنیہ قذریل..... حافظ آباد۔ اسلام علیکم! ایشیا ٹیلی ویژن کی آپ اور آنجل اشاف۔ آج میں پورے ایک سال کے بعد لکھ رہی ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں نے آنجل سے رابطہ ہی ختم کر دیا ہے۔ ہر مہینہ کا آنجل تو میں پڑھتی رہی لیکن لکھنے کی بہت اس لیے نہیں کی کہ انسان کبھی بھی معاملات زندگی میں مصروف ہوتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس دوران بہت سے ناول اپنے اختتام کو پہنچے جن میں "زندگی دھوپ تم گھنا سائیہ"، "دشت آرزو"، "یہ جاں نہیں یہ شہنشاہ" سر فہرست ہیں۔ سب راسخ زرنے بہت اچھا اختتام کیا ہے اور اس کے علاوہ کچھ تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں آنجل میں جو کہ بہت ہی اچھا ہوا ہے۔ "آنجل کے ہمراہ" کا سلسلہ تو بہت ہی اچھا ہے۔ سلسلہ وار ناول "پتھروں کی پلکوں پر" پلیر انوش کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونی چاہیے اب اور امامہ کو کب عقل آئے گی آخر اس کے علاوہ سب ہی سلسلے پہلے کی طرح زبردست جا رہے ہیں۔ خدا کرے آنجل پوری ہمیشہ ترقی کرتا رہے آمین۔ ہم سب کو مل کر اپنے ملک کی سلامتی کے لیے بھی دعا کرنی چاہیے تاکہ ہمارا ملک دشمنوں کے چنگل سے نکل سکے۔ خدا ہمارے ملک کو ہمیشہ قائم رکھے آمین آنجل اور آنجل کے پورے اشاف کو سلام اور پڑھنے والوں کو بھی خدا حافظ۔

صدیچہ اشفاق..... گجرات۔ اسلام علیکم! آنجل اشاف اینڈ قارئین کہے ہیں آپ امید کرتی ہوں کہ سب خیریت سے ہوں گے آمین۔ اس ماہ کا آنجل پہلی مرتبہ 22 تاریخ کو ناول خوش ہو گیا۔ "حمود لغت" کی پڑھنے سے اپنے دل و دماغ کو منور کیا پھر آگے بڑھے "ہمارا آنجل" میں شاید جمل اور زونی رانا سے ملاقات کی جو کہ بہت اچھی تھی۔ مزہ آیا۔ مجھے آنجل کا یہ سلسلہ بہت پسند ہے آگے بڑھے تو اچھے تصویر دیکھی تو بہت اچھا لکھ کی خواہش تھی جو پوری ہوئی۔ پلیر اب ماؤں کی بیکپر مت لگائیے گا۔ اپنی پسندیدہ راسخ کے ناول کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ "بھنگی پلکوں پر" نام تو اچھا لگا اور دعا ہے کہ یہ ناول بھی بہت اچھا ہو اور اللہ تعالیٰ جی کو مزید کامیابیوں سے نوازے آمین۔ ابھی پڑھا نہیں ہے دو چار قسط پڑھ کر پھر تبصرہ کروں گی۔ پھر اپنے نہایت پسندیدہ ناول "اور کچھ خواب" پڑھا نہ جانتی زبردست ہر بار قسط پڑھ کر مزہ آ جاتا ہے۔ بہت عرصے بعد ملکی کہانی پڑھ رہے ہیں۔ آپ اسی طرح لکھتی رہیے گا اور پلیر دامیان اور انہما کی ناراضگی ختم کر دوں گی۔ یہ دونوں میرے پسندیدہ ہیں۔ "نور شمع" بری پور ہزارہ والی بات کی خبر دار جو کسی کی بات پر کان دھرے۔ "پتھروں کی پلکوں پر" ناز ہی بہت اچھا لکھ رہی ہیں آپ۔ مگر اس دفعہ صفحات کم تھے ابھی پڑھا شروع کیا تھا اور ختم بھی ہو گیا پلیر ہم پر رحم کریں اور تھوڑا زیادہ لکھا کریں۔ اتنے دن جتنی مشکل سے گزرے ہیں وہ آپ ہم سے پوچھیے اور پلیر نازی سانول شاہ کو اچھا کر کے دے دیا نہیں ہے بلکہ اس کی اور نازل کی شادی کروا دیے گا اور امامہ کو کھوڑی سی عقل دین گھر چھوڑ کر جاری ہے۔ اچھا نہیں کر رہی بہت پیچھتائے گی۔ اس ماہ کا سروے "آنجل کے ہمراہ" بہت اچھا تھا مزہ آیا۔ سوال بہت اچھے تھے۔ پلیر ایسے سلسلے جاری رکھیے گا۔ باقی شمارہ ابھی نہیں پڑھا۔ سندھ ماہ تک کے لیے خدا حافظ اگر زندگی نے ساتھ دیا تو پھر ملیں گے اس دعا کے ساتھ کہ آنجل بہت بہت ترقی کرے۔ اور خدا میرے ملک پاکستان کو اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔

شمساذیلہ رباب..... راولپنڈی۔ اسلام علیکم! تمام آنجل اشاف اور پڑھنے والوں کو سلام قبول ہو۔ ماہ جون 2011ء کا

آنجل 24 تاریخ کو ملا۔ سب سے پہلے حمود لغت پڑھی اور دل کوراحت ہوئی۔ اس کے بعد سلسلہ وار ناول "اور کچھ خواب" عشنا کوثر سر دار کا بہت اچھا تھا۔ باقی بہنوں نے بھی بہت خوب لکھا۔ آنجل کے تمام سلسلے ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھے۔ آنجل میں میری تحریر شامل کرنے کا شکریہ۔ اللہ حافظ۔

طیبہ طاہرہ..... صبیور۔ اہل آنجل کو محبتوں بھر اسلام جون کا شمارہ 23 مئی کو ملا۔ حمود لغت پڑھا۔ نیند میں اپنا کلس دیکھنے کی کوشش کی لیکن ہمارا تو نام و نشان بھی نہیں۔ طیبیں پھر کبھی سہی.....! شاید جمل اور زونی رانا سے ملاقات کی۔ اچھا لگا "بیاض دل" میں سب اچھے اشعار تھے مگر سیدہ جیانتوی کا شعر دل پر لگا۔ کام کی باتیں و آزاری میں نوٹ لیں۔ باقی آنجل زیر مطالعہ ہے۔ تمام بہنوں سے گزارش ہے کہ میرے لیے دعا کریں۔ زندگی رچی تو اگلے ماہ لمبے سے تبصرے کے ساتھ حاضری دوں گی کیونکہ پیچہ زکی وجہ سے کچھ مصروف ہوں۔ خدا حافظ۔

مہوش ہلک..... گنگا پور۔ اسلام علیکم! کیا حال ہے سب ٹھیک ٹھاک ہیں نا؟ اللہ کے کرم سے میں بھی بالکل فٹ فاٹ ہوں۔ لیس جی! اتنی شدید گرمی اور اوپر سے یہ ٹھوڑی لٹو شینڈل مگر بھلا ہوا اس بھندے نرم مزاج آنجل کا کہ دماغ کو سکین اور دل کو آرام پہنچانے کا کوئی تو دلچسپ ذریعہ ہے ہمارے پاس۔ کچی ناناؤں کا ٹائل گرل ایک آنجل نہیں بھائی مجھے۔ بہت غور سے دیکھنے کے بعد بھی نہ پتا چل سکا کہ ٹائل کی ناپسندیدگی کی وجہ آخر ہے کیا؟ سب سے پہلے "سرگوشیاں" پڑھیں۔ مشتاق اکل ہے بات صمدی صمدی ہے کہ اس وقت جو ملکی حالات ہیں ہر بندہ خوف و ہراس میں مبتلا ہے سبھی زندگی گزار رہا ہے۔ عوام تو کچھ پتیلیوں کی طرح بے رحم حکمرانوں کی انگلیوں پہ ناز رہے ہیں۔ بس ایسے مشکل وقت میں اپنے رب سے یہی دعا ہے کہ ہمارے وطن کو اللہ رب العزت اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔ "ہمارا آنجل" میں زونی رانا کو دیکھ کر دل ملیوں آنجل پڑا۔ بات تو ویسے ہی بڑی پیاری اور اچھی لڑکی ہو۔ اب یہ ساری خوبیاں دیکھ کر میرا مطلب ہے پڑھ کر میں تو اور پرستار ہو گئی ہوں تمہاری۔ اپنی قاری بہنوں کو زونی کے حوالے سے بتائی چلوں نا شاء اللہ اس نے تفسیر پڑھی ہے اور پڑھا بھی رہی ہے۔ میری دعا ہے کہ کم خوش رہو ہمیشہ آمین۔ "آنجل کے ہمراہ" میں سوالات جتنے کمال کے جوابات اس سے بھی بڑھ کر میرے علاوہ سارے نے چیرے تھے۔ سب نے دلچسپ جواب دیے۔ اب سیدھا لینڈ کرتے ہیں اقرار صغیر جی کے نئے ناول "بھنگی پلکوں پر" میری شدید خواہش ہے کہ یہ ناول اس قدر زبردست ہو کہ "دشت آرزو" جو میرے دماغ میں کالی کی طرح جم کے رہ گیا ہے اس کے اثر کو زائل کرنے میں کامیاب ہو۔ (اللہ کرے زور قلم اور عطا ہو) آمین۔ سب سے دلچسپ سلسلہ "آئینہ" دیکھتا ہے۔ ہر بار منظر و حسین چہرے کچھ خوشی سے اور کچھ غصے سے سرخ ہوتے چہرے۔ سب کی گپ شپ تنقید، تعریف ان سب ہی سے تو رونق ہے۔ واہ جی ہماری عشنا کوثر جی بھی آئینہ میں شریف لانی ہیں۔ عشنا جی! ہمارا نہیں شکر ہے تو آپ کا بنتا ہے۔ جو اتنا اچھا ناول لکھا ہمارے لیے۔ آپ کے ناول کی یہی تو خاص بات تھی کہ ہر کردار کی اپنی جگہ اور اہمیت تھی۔ بہر حال مجھے تو بہت پسند آیا۔ (اللہ کرے آپ جو بھی لکھیں وہ امر ہو جائے) آمین۔ نوشی نے بڑے دلچپ انداز میں تبصرہ پلےس تجزیہ کیا۔ (اسے کہتے ہیں تبصرہ) اقرار ساری شائیکہ طاہرہ یا سکین اور نام اور زرج رانی کے خط بھی زبردست تھے۔ خاص طور پر زرج کی بیخالی۔ "یادگار لکھے" میں گمن بلوچ طیبہ بند اور نسیم چوہدری نے اچھا لکھا۔ "بیاض دل" میں سلمیٰ فہیم گل نوشین اقبال نوشی اریہ شاہ ظل ہمارا انا احب کے اشعار کمال کے تھے۔ "دش مقابلے" میں ساری دشمن مقابلے پر تھیں۔ یار میں ٹھہری کھانے کی شوقین مجھے تو ہر اچھی اور لذیذ دُش پسند ہے۔ مگر وہ جو بناتے ہیں آسان ہو جیسے رانی اسلام کا لذیذ باری کیو۔ ویسے اگر نام دیکھوں تو مجھ کا تخم کارنگی گوشت اور ذراہٹ کے لڑکھا جائے میرا مطلب ہے منفرد دُش دیکھوں تو گار کار رائے "دعا" کا۔ "کام کی باتیں" ہم سے پوچھیے آپ کی شخصیت بیوٹی گائیڈ اور باقی سارے سلسلے زبردست تھے۔ لیکن کریں آدھی رات کا وقت ہے اور میں ان کاغذوں میں سر دیے لکھ رہی ہوں۔ خدا کے لیے طویل تبصرے کو وجہ بنا کر اس خط کو ردی کی ٹوکری کی زینت نہ بنا دیجیے گا۔ میری نعت کا کچھ تو پھل دیجیے گا۔ اللہ حافظ۔

شگفتہ خان..... بھلول۔ امید ہے آپ سب بخیریت ہوں گے سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کے نام لکھوں کہ میں تو اپنا



کے علاوہ کسی کو جانتی ہی نہیں ہوں۔ اس ماہ کا 25 کو میل گیا اور جلدی سے کھانا لگایا نام کہیں بھی نہیں ملا ایسا کیوں.....؟  
انکل کیا آپ یہ احساس دلاتا چاہ رہے ہیں کہ میری اپنائیں ہیں تو اب میں نہ لکھا کروں؟ اگر ایسا ہے تو مجھے بتادیں تاکہ میں نہ  
لکھوں اور تبصرہ میں نہیں لکھ پاؤں گی ایسا کہ بعد لفظوں کو ایک لڑی میں پرونا ممکن نہیں رہا سو اس کے لیے معذرت باقی سلسلوں  
میں ضرور شامل ہونا چاہوں گی اگر آپ شامل کرنا پسند کریں تو۔ آج کل ابھی تک نہیں پڑھا سوائے قسط وار کہانیوں کے نازیہ جی  
ساعتہ سرائے تعلیم مت گریں پلیئر اور شاہزادہ اور انوشہ کو ملا دو بار اور عشنا جی کیا کہوں آپ سے ابھی تک کہانی واضح نہیں ہو رہی۔  
دلچسپی بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ معذرت کے ساتھ اجازت دیں۔ باقی رسالہ پڑھنا نہیں ہے جو رائے دوں۔ سب کی خدمت میں  
درجہ بدرجہ سلام۔ اللہ حافظ۔

بہسا ایوب شلیخ..... عارف والا۔ ذہیر قارئین اور نجل اشاف السلام علیکم اسب سے خبریت کی امید کرتی ہوں۔  
آج کل ہاتھ میں ہے اور تبصرہ چاہتا ہے ناٹل اچھا تھا۔ ”محمد لغت“ اور ”شیطان کی حقیقت“ پڑھا۔ شاید نجل اور ذہیر قارئین  
کر اچھا لگا۔ ”آج کل کے ہمراہ جوابات پڑھنے خوب مزہ آیا۔ حسین انجم انصاری کی منہ پھٹ مگر شرعی ”چاندنی“ اچھی لگی۔ اقراء  
صغیر احمد کی آمد نے دل کو خوب سکون دیا۔ عالیہ حرا سے مل کر بھی اچھا لگا۔ فاروقی نے ایک اچھے موضوع پر قلم اٹھایا البتہ عائنہ  
خان کی سمجھ نہیں آئی مگر آئندہ کے لیے ہم امید کرتے ہیں کہ ناول مکمل کر سائے گا۔ مجموعی طور پر جولائی 2011 کا آج کل  
بہت اچھا رہا۔ ”یادگار لکھے بیاض“ آپ کی پسند آپ کی محنت کا کام کی باتیں۔ ”شاہزادہ چندا ستا بہت“ محنت خراہ میرا شریف طور  
جناں ہم آپ کو بہت یاد کر رہے ہیں۔ دوبارہ سے کسی اچھے سے سلسلے وار ناول یا کم از کم ناولٹ کے ذریعے ہی ہمیں اپنی موجودگی  
کا احساس دلا دیں۔ اس کے ساتھ ہی اجازت دیں۔ اللہ حافظ۔

تصویر العین..... او کا ذہ۔ السلام علیکم اسب سے پہلے تو شہلا آئی اور آج کل کے تمام اسلاف قارئین اور راسخ رکھانے  
والے رمضان اور یوم آزادی بہت بہت مبارک ہو۔ کیونکہ اس ماہ میرے پیپرز ہوں گے تو شاید اگست کے شمارے میں میرا نام  
شامل نہ ہو۔ آج کل کا ناٹل اوکاڑہ کے موسم کے حوالے سے پسند آیا کیونکہ رات ہی شدید طوفان کے ساتھ بارش ہوئی ہے اور آج  
آج کل ہمارے ہاتھ میں ہے۔ فہرست میں اقراء بی بی کا نام پڑھ کر تو اتنی دلی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر سے اور پھر سب سے پہلے  
انہیں ہی پڑھنا نہیں پوری امید ہے کہ ہمیشہ کی طرح ان کا یہ ناول بھی بہت زبردست ہوگا۔ اس دفعہ عشنا کو شہزادہ نے کہانی کو  
بڑھایا نہیں ابھی کہانی وہیں پر ہے پلیئر عشنا تو آج زیادہ لکھنے کی کوشش کیا کریں۔ نازیہ کو نول نازی مجھے امام کی سمجھ نہیں آئی کیا وہ  
محنت میں اتنی اندھی ہو رہی ہے اسے اچھا بی بی کی درمیان فرق نہیں پتا چلتا تو سر اسرے تو فونی ہے۔ ”چاندنی“ حسین انجم  
انصاری کی اچھی کہانی تھی۔ واقعی کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز میں نقص نکالے کیونکہ ہر انسان  
ایک شخصیت اور مزاج لے کر دنیا میں آتا ہے۔ ”روشنی اور راستہ“ عالیہ حرا کی رشتوں میں موجود حسد اور عداوتوں کو ظاہر کر رہی تھی۔

برائی جلدی جھٹکتی ہے اور اچھا بی بی ہوتا رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روشنی کی لکھی گئی اچھی اندھیرے کو چیر دیتی ہے۔ یہی سب  
سجاول کے ساتھ ہوا ہے۔ ”شہر ہوئے نیک“ عائنہ خان کے ناول کی باقی قسط کا انتظار رہے گا۔ ”بیاض دل“ میں قلم ہما سہلی، ”ہنیم  
گل“ فرزانہ اکرام اور بیاض بی بی بلوچ کے اشعار پسند آئے۔ ”یادگار لکھے“ کا صنفی تو ہمیشہ ہی اچھا ہوتا ہے لیکن مجھے ”اقبال تیرا  
دلہن“ غزل پسند آئی۔ ”آئینہ“ میں عشنا کو شہزادہ آپ کی موجودگی بہت پسند آئی خصوصاً آپ کی وہ بات کہ سبق آموز کہانیوں  
کے اور بہت سے رسالے ہیں۔ واقعی اتنے سخت حالات میں جب آئے دن ہم دھماکوں ڈرون حملوں اور شہادتوں کی خبریں آ رہی  
ہیں عوام کو کچھ تفریح کی ضرورت ہے لیکن آپ نے جو آسیر مرزا محنت خراہ کو آرام کا مشورہ دیا ہے میں اس سے متفق  
نہیں ہوں خود جوچیں کہ یہ آرام کتنا طویل ہو گیا ہے آسیر مرزا کا آخری ناول میرے خیال میں ”کچھ بیٹوں مرنا عاشق دی سی“  
تھا اور انہوں نے اب تک کوئی اور ناول نہیں لکھا کیا یہ قارئین کے ساتھ زیادتی نہیں کہ وہ ایک اچھی لکھاری کی نئی کاوش سے اب  
تک محروم ہیں اور محنت خراہ کو بھی تقریباً ایک سال ہو چکا ہے انہیں بھی اب دوبارہ میدان میں آنا چاہیے۔ ویسے عشنا اس سے  
ایک بات ضرور پتا چلی کہ آپ خود بھی آج کل کا مطالعہ اتنی ہی ذوق و شوق سے کرتی ہیں جتنے شوق سے ہم کرتے ہیں اور اپنے

چاہنے والوں کے سوالوں کے جواب بھی ضرور دیتی ہیں اور سب سے اچھا مجھے آج کل کا بیاض ”آج کل کے ہمراہ“ بے انتہا پسند آیا۔  
مجھ کو ایسا ہوا کہ جس کے ذریعے اپنی پسندیدہ راسخ رکھانے جذبات پہنچ سکے جس کے اللہ حافظ۔

مصباح کنول..... بہسا ولپیور۔ پیاری پیاری آئی اور آج کل اشاف السلام علیکم ایکلیں سی مکتبی پھولوں سی تازہ  
چڑیوں سی خوب صورت چھتی آئی شہلا! ایسی ہیں آپ اور کیسے ہیں بانی سب؟ آئی مجھے تو مجھ نہیں آ رہی کہ اس پیارے چہل کی  
تعریف کس سے اور کہاں سے شروع کروں۔ ”سرگوشیاں“ سے لے کر ”تندرستی نعمت“ تک بہت ہی زبردست ہے۔ آج کل  
صاحب سے بہت دفعہ کہا ہے کہ اگر ایک مینیجمنٹ میں دو دفعہ جایا کریں تو کیا ہی بات ہے اور اب آپ سے گزارش ہے کہ پلیئر کیا  
ایسا نہیں ہو سکتا کہ آج کل ڈائجسٹ کے مینیجمنٹ میں دو دفعہ شائع ہو جائیں ایک کو تو ہم ایک ہی دن میں پڑھ لیتے ہیں اور پھر وہی  
بار بار پورا ہینڈ چلتا ہے آئی کی بھی اور اسے میں میں پہلی دفعہ خط لکھ رہی ہوں پلیئر مجھے پاپس مت کیجیے گا۔ میرا خط شامل کیجیے گا  
کیونکہ اس سے پہلے میری بہن نے خط لکھا تھا اور اب میں لکھ رہی ہوں شامل ضرور کیجیے گا۔ آج کل پڑھنا مزہ ہی لکھا اور ہے۔  
سلسلے وار ناول بہت زبردست رہے ”اور کچھ خواب“ کی قوت سی نہ پوچھیں۔ عشنا جی نے بہت زبردست لکھا۔ ”جان جاں تو جو  
کے“ کی آخری قسط کا اختتام بہت اچھا ہوا۔ ”پتھروں کی جگہوں پر“ کی قسط نے بہت مزہ دیا۔ لیکن آئی اب انوشہ کو بھی کوئی خوش  
دکھادیں شاہزادہ پے پار فافہ کیا کہنے..... خبر ناول زبردست ہے۔ باقی سب سلسلے بھی بہت اچھے جا رہے ہیں۔ بہر حال آج کل  
ایک مکمل پرچہ ہے کیونکہ جو سبق ہم لائیاں کہانیوں سے کچھ سیکھتے ہیں وہ اپنی زندگی میں مثبت طریقے سے لائیں تو بہت اچھا ہے  
کیونکہ ایک ذمہ دار عورت ہو یا لڑکی کے لیے ضروری ہے کہ سمجھ داری سے کام لے اور یہ سمجھ داری ہم آج کل سے سیکھ سکتے ہیں۔

مسافرہ لنگڑکیاں..... مسیال موزی۔ السلام علیکم ایسی ہو رہی راز اور راسخ؟ اس دفعہ آج کل 25 کو نول گیا تھا خوش قسمتی  
سے ورنہ مجھے بہت دیر سے ملتا ہے۔ نازیہ کو نول نازی کا بھی ناول اچھا جا رہا ہے عشنا کو شہزادہ کا سلسلہ وار ناول مجھے اتنا زیادہ پسند  
نہیں (معذرت۔) یا کیرہ خرم نام پڑھ کر جھکا لگا (جس میں بتاؤں گی ٹھیک کی)۔ باقی سب ناول بھی اچھے تھے۔ آپ کی شخصیت میں  
اے ایس صدیقی کی باتیں بہت غور سے پڑھیں۔ نظمیں سب پسند آئی۔ ”بیاض دل“ کے اشعار پسند آئے۔ پتا نہیں کس کے شعر  
پر میرا نام اور میرے شہر کا نام لکھا ہوا تھا کیونکہ وہ میرا نہیں تھا میں ساڑھے لکڑکیاں کے نام سے تھی ہوں اچھا دوستوں اجازت  
چاہتی ہوں سب کو سلام اور دعا میں۔

حفصہ بنتول..... بہسا ولپیور۔ السلام علیکم ڈیڑ شہلا آئی پیاری باجوا نیوں اور پیاری پیاری فرینڈز کیسے ہیں آپ  
سب لوگ؟ امید ہے اللہ کے فضل و کرم سے ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ سب قارئین کی طرح آج کل میرا بھی پسندیدہ ڈائجسٹ  
ہے۔ اس کی تعریف کے لیے الفاظ کم پڑے ہیں اگر ایک طرح سے سمجھا جائے تو ان میں بعض تجاویز جوئی سسل کے لیے مشعل  
راہ ہوتی ہیں سو چاہی نہیں جاسکتا کہ آج کل کو پڑھنے والی کوئی بھی لڑکی بھٹک سکتی ہے۔ راسخ بہت زبردست طریقے سے زندگی  
کی تمام گنجائیاں عیاں کر دیتی ہیں کہ کتنی مکمل جانی ہیں۔ اس کے باوجود کوئی لڑکی بھٹک تو جرت ہے۔ خیر اب آئی ہوں تبصرے  
کی جانب تو سیرا شریف طور آئی کو اتنا زبردست ناول لکھنے کے لیے بے حد مبارک باد۔ آئی پلیئر آئندہ کسی ایسی ہی تحریر لے گا  
ہم منتظر رہیں گے۔ آپ کی محنت اور مشکلات کے لیے دعا گو ہوں۔ نازیہ کی ناول بھی بہترین جا رہا ہے۔ خصوصاً جیل کے  
حالات پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ یہ شاہزادہ صاحب کو کیا ہوا ہے نہ برہ کو چھوڑنے کو تیار ہوتا ہے اور نہ ہی انوشہ سے دستبرداری منظور  
ہے۔ آئی سانول شاہ کو اچھا کر دیتے گا پلیئر اور امامہ کو کچھ تو عقل دیں کوئی کردار کا اتنا بھی کمزور ہو سکتا ہے کہ اپنی سوانحیت کا ہی  
پاس نہ رہے۔ ارسلان کو کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے اور شجاع بے چارے کا کیا قصور ہے؟ عشنا آئی کا ناول ”اور کچھ خواب“ واہ  
آئی کیا بات ہے آپ کی۔ آئی اب انانیا اور معراج کا ویسہ کر ہی ڈالے اور یلماز اور بارسا یقیناً وہی ہیں جن کے بارے میں  
یونیورسٹی میں چو گونیاں ہوتی ہیں۔ آئی ایک بات تو بتائیے یہ دامیان شاہ سوری انگلس اور انتہا یہ کیا کیس میں فقط کاٹی  
کولڈ رنگ بابر گھوٹنے آتے ہیں پڑھائی ان کی کب ہوئی ہے (برا لگا ہو تو پلیئر سائنڈ مت کیجیے گا)۔ اقراء آئی کو بیگم کہتے ہیں۔  
امید ہے ناول اچھا ہوگا زندگی سے بھر پور۔ پلیئر پلیئر پیاری پیاری آبیوں دھکی اور روتے دھوتے ناول نہ لکھا کریں۔ پاکستان کے

مسائل کی وجہ سے پہلے ہی ہم پریشان ہوتے ہیں۔ دکنی ناول پڑھ کر دل مزید بوجھل ہو جاتا ہے۔ آخر میں قریبی مشکل سے گزارش کرنا چاہوں گی کہ شوہر اور دیگر شخصیات کے اندر یوزن آتے رہتے ہیں۔ قارئین کے لیے بھی کوئی نئی سلسلہ موجود ہوتا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ پلیز کوئی ایسا سلسلہ شروع کریں جو کہ ہماری مصنفین کے بارے میں ہو۔ ان کے خاندانی پس منظر، تعلیم ان کی پہلی تحریر کے شائع ہونے یا رد ہوجانے کا دلچسپ سا واقعہ اور قارئین کے لیے انجمنی نصیحت ہو۔ یہ تعارف اگر ہر ماہ ہو تو بہت اچھا رہے گا جس طرح ”ہمارا آئین“ میں تعارف ہوتے ہیں اس طرح کے مصنفین کے لیے بھی شروع کریں۔ میں اور تمام قارئین اپنی پسندیدہ رٹائرڈ کے بارے میں جاننے کے خواہش مند ہیں۔ یہ رٹائرڈ وہ بھی ہو سکتی ہیں جو لکھنا چھوڑ چکی ہیں۔ امید ہے کہ آپ میرے پہلے خط میں موجود پہلی گزارش کا جواب ضرور دیں گے والسلام۔

رائشدہ شریف چوہدری..... اوسکاؤڈ معزز قارئین اور آئین چل اسٹاف اسلام علیکم امید کرتی ہوں آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ سب سے پہلے فرحت آئی کے بارے میں جان کر بہت دکھ ہوا۔ بے شک وہ آئین کے لیے ایک شفیق ماں تھیں۔ خدا ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے آمین۔ اب آتے ہیں تبصرے کی جانب تو اس ماہ کا آئین 26 کوئل ہی گیا۔ سب سے پہلی نظر ورق پڑائی۔ ناٹل اچھا لگا پھر ایک نظر فہرست پڑائی اور اپنا تعارف دیکھ کر دھچک بھی ہوا مگر کہتے ہیں نا ”جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہی ہوتا ہے“ اور دوڑ لگائی اپنے پسندیدہ ترین ناول ”اور کچھ خواب“ کی طرف متوجہ آئی سب سے پہلے تو یہ کہ آپ کمال کا لکھی ہیں آپ کے ناول کے تمام کرداروں کے نام مجھے بے حد پسند ہیں اور میرے پسندیدہ کردار اتنا نیا ملک اور معاصر تعلق ہیں لیکن آپ ایک گزارش ہے کہ پلیز ناول کی رفتار را تیز کریں پلیز راحت و فساد اور میرا شریف طور کے ناؤ کا اختتام بہت زبردست رہا جیسا سوچا تھا بالکل ویسا ہی۔ آپ دونوں سے ایک گزارش ہے کہ آپ دونوں میں غائب مت ہو جانا بلکہ یونہی آئین میں حاضری دیتے رہیے اور میرا آئی آپ کی صحت کا جان کر دکھ ہوا اور خدا آپ کی صحت کے لیے دعا گو ہوں۔ مکمل ناول میں ٹھیک تھا۔ ناؤ اور افسانے دونوں ہی بہت اچھے تھے۔ آپ آتے ہیں اپنی جان سے پیاری آئی نازی آئی کے ناول کی طرف متوجہ آئی ناول بے حد اچھا جا رہا ہے۔ اس باریک قط بہت بڑھ چکی ہے آپ سے ایک شکایت ہے کہ آپ ناول کی قطع بہت چھوٹی لکھتی ہیں۔ پلیز آئی ذرا قطع کو لمبا کر دیں۔ آئی مجھے آپ سے ملنے کا بے حد شوق ہے۔ اللہ آپ کو لمبی زندگی اور صحت عطا فرمائے آمین۔ مستقل سلسلے سب ہی بہت اچھے تھے۔ یہ میرا آئین چل میں پہلا خط ہے۔ پلیز ضرور شائع کیجیے گا۔ تمام رٹائرڈ اور قاری بہنوں کو خدا حافظ۔ خدا ہمیں اور ہمارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔ فی امان اللہ۔

انشا نشاء زاد..... گنجرات اسلام علیکم! کیسے جناب کیسے ہیں آپ سب لوگ امید اور دعا ہے بخیر ہوں۔ 6 تاریخ کو آئین چل میاں جانی لے لا کر دیا۔ جی ہاں اب میں انا صاحب سے انا شاہ زاد ہوئی ہوں۔ 4 مارچ کو میری شادی ہو چکی ہے۔ ناٹل کچھ خاص نہیں لگا۔ سب سے پہلے قطع وار ناؤ پڑھے۔ جو سب کے سب سو پر ہیں باقی ابھی نہیں پڑھا۔ دعاؤں کی طلب گار۔

ایسہا..... بسا ہول پور۔ ڈیر شہلا عامر۔ پیاری پیاری آئی! محبت بھرا سلام قبول کریں۔ آئی! کسی بھی ادارے میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ اس سے پہلے سوچی ہی رہی کہ لکھوں یا نہیں معلوم نہیں شائع ہو یا نہ ہو۔ مجھے آئین چل پڑھتے ہوئے تقریباً تین چار سال ہو گئے۔ لیکن لکھنے کی بہت اب ہوئی ہے۔ ”آئین“ سارے کا سارا زبردست ہوتا ہے سب سے پہلے یہ کہ ہمارا ”آئین“ سب سے بہترین اور اعلیٰ معیار کا حال ہے اسی لیے تو کہتی ہوں ”کوئی آئین جیسا ہے تو سامنے آئے“۔ آئین چل میں تمام بہنیں بہت اچھا لکھتی ہیں۔ سیراجی نے ”یہ چائیں یہ شیں“ میں تو حد ہی کر دی۔ اتنا اچھا لکھا کہ تعریف بیان ہی نہیں۔ اس کے لیے مبارکباد۔ اب پلیز ایسا ہی ایک منفرد اور اچھا ناول اور بھی لکھیں۔ اس کا اختتام بھی نہایت زبردست ہوا۔ بہت مزہ آیا۔ اسی ناول نے مجھے لکھنے پر اکسایا اس کے بعد ”اور کچھ خواب“ بھی اچھا جا رہا ہے۔ معاصر تعلق اور اتنا نیا کہ کردار اچھے ہیں لیکن اب اتنا نیا کو تھیا ر چھینک دینے چاہئیں۔ خیر یہ تو لکھنے والا ہی بہتر جانتا ہے۔ آئی! میں بھی آئین چل میں لکھنا چاہتی ہوں اگر اجازت ہو تو خوش آمدید دعا گو ہوں کہ اللہ پاک ہمارے آئین چل کو دن دکنی رات چوٹی ترقی نصیب کرے آمین۔ آئی! میں نے بہت ڈرتے ڈرتے یہ خط لکھا ہے کہ یا یہ شرف قبولیت پاتا ہے یا نہیں۔ پلیز پلیز میرا خط ضرور شائع کیجیے گا۔ خرمیں پھر دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ

لکھنے اور پڑھنے والی تمام بہنوں کو صحت اور بہتر لکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے پاکستان کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے آمین۔ غوث..... لیٹہ۔ آئین چل کے تمام اسٹاف کو میری طرف سے سلام۔ اللہ آپ سب کو خوش رکھے۔ میں ایک عرصے سے آئین چل کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ مجھے کہانیاں پڑھ کر بہت مزہ آتا ہے۔ میری دعا ہے کہ آئین چل کے رٹائرڈ یونہی اپنے قلوب کو رواں رکھیں۔ آج کل کے معاشرے میں پائی جانے والی پریشانیوں کو حل کرنے میں اپنے قلم کے ذریعے مدد کریں۔ آج کل کے حالات کو مد نظر رکھ کر ہمارے معاشرے کی نوجوان نسل کو درست سمت کی طرف گامزن رکھیں۔ اللہ آپ سب کا حامی و ناصر ہو آمین۔

سارہ زہان..... ناران۔ یہ میری تیسری میل سب آئین چل کے بیاض میں بٹ فورسپائس۔ میں اب نہیں کروں گی اگر آپ نے میری میل شامل نہ کی۔ آئین چل اس دفعہ کا سوہنہ کچھ ناخوش۔ اب آپ نے اس کا معیار اونچے کر دیا ہے۔ پلیز اس میں تحریر کا مصنفین کی کہانیاں شامل کریں کیونکہ آئین چل ایک معیاری ڈائجسٹ ہے۔ دوسرا یہ کہ قیمت میں اضافہ ایک اور مسئلہ ہے۔ لیکن ہم خرید سکتے ہیں اگر اس کا معیار برقرار رکھیں۔ امید ہے آپ نے میرے تلخ الفاظ کا برا نہیں مانا ہوگا۔ کیونکہ میں آئین چل کو سب سے اوپر دیکھنا چاہتی ہوں۔ اللہ حافظ۔

مبینہ رشید..... لاہور۔ اللہ آپ کو اور آئین چل کو خوب ترقی دے۔ میں آئین چل کو بہت پسند کرتی ہوں اور کب سے آپ کو میل کرنا چاہ رہی تھی لیکن نیٹ نہیں تھا اب نیٹ لگ گیا ہے تو بہت دل کیا آپ کو میل کرنے کا۔ اس کے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ دعا ہے کہ آپ ہمیشہ خوش رہیں آمین۔

نشاء خان..... ایڈیٹ آباد۔ سلام ناول۔ آئین چل کے بارے میں میں بس اتنا کافی ہے کہ اس کے بغیر عورت نامکمل ہے۔ اس کا ہر دور میری جان ہے۔ مجھے اس سے وابستہ ہر چیز عزیز ہے۔ خدا سے ہمیشہ اتنا ہی عزیز رہنا ہے رکھے آمین۔

مساجدہ خادمہ..... بسا ہول پور۔ سب کی خدمت میں پیار بھرا سلام۔ امید کرتے ہیں کہ سب پڑھنے والے بھی ٹھیک ہوں گے۔ اس بار کا آئین 2 تاریخ کو لیا اور اسی دن پڑھ لیا۔ ارے حیران نہ ہوں ہم ایسے ہی جلد باز ہیں۔ جب ایک بار آئین پڑھا تو مجھے اسے تو پڑھ کر ہی چھیننا آتا ہے۔ اب آتے ہیں تبصرے کی جانب نازی کنول نازی کا ناول نیا سوڈا لایا ہے یہ کیا لامر کی عقل گھاس کھانے کی ہے؟ شاید اسے شوکر کھا کر ہی سمجھا گئے گی اور یہ عہاد صاحب صائمہ کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔ یقین تو ہمیں بھی نہیں آیا پڑھ کر خیر اب آتے ہیں اور کچھ خواب کی طرف پلیز اس کو تیز کریں تو ہوا۔ مجھے یہ اسٹوری پسند ہے کیونکہ اس کو پڑھ کر کشن ختم ہو جاتی ہے تو دیر کے لیے۔ لیکن پھر بھی میں یہی کہوں گی کہ اس کو تھوڑا تیز کریں۔ معاصر اور اتنا نیا ایک دوسرے کے ساتھ اب کھیل کھیلنا بند کریں۔ باقی اتر آئی نیا ناول لے کر آئی ہیں۔ آغاز تو اچھا ہے آگے دیکھئے۔ اتر آئی کا ناول باہوں کے سنگ سنگ میں سے نیٹ پر پڑھا اور ہم تو ان کی تحریر کے دیوانے ہو گئے مجھے یہ ناول بہت پسند آیا۔ مکمل ناول بھی اچھا تھا۔ کافی اچھا پیغام دیا رٹائرڈ نے کہ ہر چیز سونا نہیں ہوتی۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا اگر زندگی نے اجازت دی تو پھر ملاقات ہوگی آپ سب سے اللہ حافظ۔

افرا شہزادی..... اسپین۔ آپ کی شاعری بہت زبردست ہے میں کافی عرصے سے آئین چل پڑھ رہی ہوں اور یہاں بھی نیٹ سے پڑھتی ہوں۔ بہت زبردست ہے۔

آخر وہ خطوط جو شائع ہونے سے رہے گئے۔ پروین افضل شاہین بہاولنگر۔ گلزار مان گل مان۔ عمر انشاہین ڈھوک رانم۔ طیبہ طاہرہ صبور۔ مون تابانی۔ چیچہ پٹنی۔ سونیا اللہ رکھا کوٹ غلام محمد۔ اساء خان پور۔ روینہ جعفر خان۔ کلابٹ ناؤن شب۔ صدف سلیمان شوکر کوٹ۔ ثناء یعقوب احمد۔ شہرہ شریف۔ مسز سعید نسیم خان نیوال۔ ظاہر فضل آباد۔ رابعہ اکرم فضل آباد۔ مساجدہ زید و والدہ اجمہ۔ صبا جاوید بہاول پور۔ صدف گل گوہر خان۔



مشتاق بھٹا کے نام

کبھی کبھی کہیں سوچتی تھی کہ موت اپنی حقیقت ضرور منوالیتی ہے چاہے کوئی اسے قبول کرے یا نہ کرے۔ فرحت آتی جو میری خواہشوں میں ہمیشہ رہی ہیں لیکن کبھی ہمت ہی نہ ہوتی کہ ان سے اپنے جذبات کا اظہار کر لی اور یہ بھی سوچا نہ تھا کہ اس صورت میں کہوں گی کچھ ان کے بارے میں وہ جو ہر کونوں میں ہستی تھی اب صدا بھی دو تو اپنے ہی ہونٹ اجنبی لگتے ہیں۔

دل ہے درد سے آشنا اسے نا آشنا نہ جان اگر درد حد سے بڑھ جائے تو مجھوں میں ملتا ہے فرار یہ سچ ہے کہ کوئی کسی جانے والے کی جگہ نہیں لے سکتا خاص طور پر وہ جو دل میں بستے ہوں ان کو کوئی کیسے بھلائے مشتاق بھائی یقین ہی نہیں آتا اتنی محبتیں بکھیرنے والی ہستی یوں خاموشی سے آنکھیں میچ سکتی ہے میں تو سوچ رہی تھی کہ میں اپنے درد فرحت آتی سے کہوں گی تو وہ مہربان لفظوں کا مہم میرے نام لکھ دیں گی پر میں تو خالی ہاتھ ہی رہ گئی میرے پاس یا میرے نام تو ان کا کوئی جگنو بھی نہیں جسے میں سامنے رکھ کر اپنے آنسوؤں کو روک سکوں۔ اپنے بابا کی وفات کے بعد ظلم سے رشتہ جڑا بھی تو کیسے۔ سیاسی کل جی! آپ کے پاس تو ان کی یادوں کے کئی موتی ہوں گے ان کی یادوں کا ایک موتی مجھے بھی دے دو شاید اس طرح مجھے فرار آ جائے نہ ہانگلین! میں نے قرآن پاک شروع کیا ہے فرحت آتی کے ایصالِ ثواب کے لیے شاید اس طرح دل کو کچھ فرار آ جائے آخر میں ایک گزارش ہے کہ آپ میرے دکھ درد بانٹنے والے بھائی نہیں گے آنچل فرحت آتی اور آپ

میری دعاؤں میں ہمیشہ شامل رہو گے آپ کی اپنی! (دھڑکن بلوچ)

دل و جان سے عزیز قارئین کے نام

ڈیزیز قارئین! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے آپ سب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خیریت و عافیت سے ہوں گی۔ ایک طویل عرصے کے بعد آپ سے یہ مخاطب ہوں۔ گردشِ دوروں نے مجھے زیادہ لکھنے کا موقع نہیں دیا لیکن گاہے بگاہے جب بھی لکھا آپ نے کھلے دل سے پڑائی کی جس کے لیے دل کی گہرائیوں سے آپ کی ممنون ہوں کیونکہ آپ کی اسی پڑائی نے مجھے لکھنے کی ترغیب اور توانائی دی۔ میرا خیال تھا کہ میں اتنے لمبے وقفوں کے بعد بھی ہوں کہ قارئین مجھے بھول بھال جاتے ہوں گے لیکن آپ سے باچے سال قبل جب میری پہلی کتاب ”دیارِ عشق“ شائع ہوئی تو صرف ایک ہفتے میں اس کی دو سو کاپیوں کی فروخت نے مجھے بتایا کہ میرے قارئین مجھے بھولے نہیں اور یقین کیجیے اس کے بعد میں بھی آپ کو کبھی نہیں بھولی۔ آپ کی خوشیاں مجھے خوش اور آپ کے دکھ مجھے دکھ کر دیتے ہیں آپ کو شاید اس بات پر یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب بھی آپ لوگ اپنی کسی بیماری یا پریشانی کا ذکر کرتی ہیں میں نام لے کر آپ کے لیے دعا کرتی ہوں۔ ایک نہایت اہم بات جو میں آنچل کے توسط سے آپ سے کہنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ پلیر خود کو مایوسی سے بچائیں۔ مایوسی گناہ ہے ایک ایسا گناہ جو انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ انسان کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اس میں اپنی روح پھونکی ہے پھر بھلا انسان نا کام کیسے ہو سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ وہ خود کو مایوسی سے بچائے رکھے۔ جدائی نارسائی بیماری خواہوں گا ٹوٹ جانا یا امیدوں کا پورا نہ ہونا زندگی کے وہ حقائق ہیں جن کا سامنا ہر انسان کو زندگی کے کسی نہ کسی دور میں ضرور کرنا پڑتا ہے۔ حالات خواہ کیسے بھی ہوں زندگی کا سفر جاری رہتا ہے لیکن منزل صرف ان لوگوں کا مقدر بنتی ہے جو ہمت اور حوصلے کے

ساتھ حالات کو اپنے حق میں کر لینے کا عزم کر لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جیسے آگ سوئے کو کندھن بنا دیتی ہے ایسے ہی تکلیف پہناری دکھاوے کو بھی انسان کو کندھن بنا دیتے ہیں۔ اسے کامیابی و کامرانی کی اس منزل پر پہنچا دیتے ہیں جس پر عام حالات میں وہ شاید کبھی نہ پہنچ پاتا۔ اللہ کے ساتھ اس کا وہ تعلق استوار کر دیتے ہیں جو دوسرے شاید کبھی قائم نہ ہو پاتا بلکہ مجھے تو کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دکھ اور غم زندگی میں آتے ہی ہمیں اللہ کے قریب کرنے کے لیے ہیں اور جو چیز اللہ کے قریب کر دے وہ بری کیسے ہو سکتی ہے۔ بری تو وہ چیز ہوتی ہے جو انسان کو اللہ سے بھی دور کر دے اور اس کے بندوں سے بھی۔ دنیا سے بھی بے زار کر دے اور زندگی میں بھی اور مایوسی ایسا ہی کرتی ہے۔ کیا خیال ہے ڈیزیز قارئین! آپ مجھ سے اتفاق کرتے ہیں۔ یقیناً کرتے ہیں۔ تو آئیے یہ عہد کریں کہ زندگی میں خواہ کیسے بھی حالات کا سامنا کرنا پڑے کبھی مایوسی نہیں ہوں گے اور نہ دوسروں کو ہونے دیں گے۔ مایوسی کفر ہے اس لیے مومن کبھی مایوسی نہیں ہوتا۔ آپ سب کی صحت سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعا گو۔

عائشہ خان..... لاہور  
پیارے عامر بھائی اور کیوٹ حیمیر ابھائی کے نام شادی کی مبارک باد  
السلام علیکم! کیسے ہیں آپ دونوں؟ امید ہے کہ آپ ٹھیک ہوں گے۔ ہم نے سوچا کہ آپ کو آنچل کے ذریعے شادی کی مبارک باد دیں۔ آپ کو ہماری طرف سے شادی بہت بہت مبارک ہو۔ کیسا لگا آپ کو ہمارا یہ سر پرانز! اچھا تھا نا! ہم اللہ تعالیٰ سے آپ دونوں کی خوشیوں، زندگی کی پُرسرت مسکراہٹوں اور نیک خواہشات کی تکمیل کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا کرتے ہیں۔ اللہ آپ دونوں کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے (آمین)۔ بہت سی دعاؤں کے ساتھ آپ کی تندرست جٹ میلی۔  
ریحانہ عظمیٰ گزنیاسم شمرہ..... فیصل آباد

کچھ خاص باتوں کے نام  
”عطر و سکندر چندا مثیل ایند نازیہ کنول نازیہ“  
السلام علیکم! عطر و سکندر نازیہ کیسی ہوتی سب مجھے امید ہے تم سب بالکل ٹھیک ٹھاک اور فٹ فٹ ہوں گی۔ ارے (مابدولت) کی دعا میں جو تم لوگوں کے ساتھ ہیں۔ طوبی ایند چندا تم دونوں سے تو میں سخت ناراض ہوں لیکن پھر بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے پیغام لکھ رہی ہوں تم دونوں کہاں غائب ہو؟ نہ ”آئینہ“ میں نظر آتی ہو اور نہ ”دوست کا پیغام آئے“ میں میں نے تم دونوں کو ڈھونڈنے کے لیے آنچل کا ایک ایک کونا جھان مارا مگر تم دونوں نظر نہیں آئیں پلیر رحم لکھا کرو مجھ پر اور زیادہ سے زیادہ انشری دیا کرو۔ تم دونوں کے بغیر آنچل اور میں بہت اداس ہو جاتے ہیں۔ تم دونوں کو ایک بہت بڑی خوش خبری سنائی ہے۔ ارے ٹھہرو! (سائس تو لینے دو) خبر ہے ہی اتنی بڑی 30 اپریل کو ”میری چند جان صدقے“ نازیہ کنول نازیہ سے بات ہوئی تھی کیا خوب صورت لب و لہجہ تھا میں اتنی خوب صورت آواز کے بحر میں کھوئی تھی اور اتنی خوش ہوئی کہ (یاراں) خوشی سے میرے آنسو نکل آئے اور اس وقت میرے احساسات کیا تھے میں بتا نہیں سکتی آئی لو نازیہ! تم بہت فریڈی ہو یا راتھیں کیا جاتا کہ تم سے بات کر کے میری کتنی بڑی خواہش پوری ہوئی ہے۔ (طوبی! چندا) اب تم دونوں شرم کرو اور جلدی سے مبارک دینے آ جاؤ مجھے مضائقے کے ساتھ۔ اللہ تم تینوں کو اتنی خوشیاں دے کہ ان کو سمیٹنے سمیٹنے تم لوگوں کے دامن تنگ ہو جائیں اور اللہ تم تینوں کو ہمیشہ ہنستا مسکراتا رکھے اور بد نظروں کی بُری نظر سے بچائے (آمین)۔  
نرجس رانی..... ساہیوال  
عشنا کوثر سردار کے نام  
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! عشنا باجی آپ پر جواب فرض ہے۔ دے دیجئے گا لفظوں کو تلاش کرنا کتنا مشکل امر ہے۔ آپ یہ کام بخوبی کر رہی ہیں ”اور کچھ خواب“ اتنے زبردست کردار تخلیق کیے جنہیں آنکھیں پڑھ کر



دل کو سوچتی ہیں لیکن دماغ ابھی تک مفلوج ہے۔  
 ”معارج تعلق“ میری زندگی کا سب سے اٹوکھا لیکن  
 مزے دار کردار ہے۔ لیکن اس قدر اٹوکھا ہوا کہ سلجھانہ  
 پاؤں۔ میرا دماغ آپ پر اشک کراٹھا۔ ہر ماہ ایک نیا  
 انداز نئی قسط ”اور کچھ خواب“ اٹا نیا ملک کا معصوم انداز  
 معارج تعلق کا سخت گیر انداز، انا چاہیگی کی انا۔ دامیان  
 شاہ سوری کا دو طرفہ جھکاؤ، ملی میک کا شان دار کردار۔  
 پارسیا بلڈاز کمال کی منکوحہ ہے یا سنگیتر؟ جلد ہی پتا چل  
 جائے گا۔ آپ میری ناپ رائٹر میں سے نمبر ون پر  
 رہیں۔ معارف تعلق کی وجہ سے ہمیشہ نمبر ون پر رہے  
 گی۔ مجھے آپ کی تعریف کر کے قرض چکانا تھا کیا آپ  
 مجھ سے دوستی کریں گی؟ ہاں تو میرا نمبر مدیرہ سے لے  
 لیجیے۔ ویسے اگر میری بے خوفانہ باتوں پر توجہ نہیں کریں  
 گی تو بھی میرے لیے ایک دعا ضرور کرے گا کہ میں  
 درس نظامی مکمل کر کے دنیا و جہان میں معتبر ٹھہروں اور قلم  
 کی نوک سے کردار ایجاد کر کے رائٹر بن جاؤں۔  
 شہناز راجپوت..... گوجرانوالہ  
 سویت فرینڈ ”بلی“ کے نام  
 اسلام علیکم! کیسی ہو پیاری دوست؟ تمہاری بہت  
 خواہش تھی کہ میں تمہیں آچل کے توسط سے مخاطب  
 کروں اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میری جان سے پیاری بلی  
 کوئی فرمائش کرے اور میں نال دول؟ آج میں آچل  
 کے ذریعے ساری دنیا کے سامنے اعلان کرتی ہوں کہ میں  
 دنیا میں سب سے زیادہ پیارا اپنی بلی سے کرتی ہوں اور سنو  
 سویت ہارٹ! تمہارے لیے میری جان بھی حاضر ہے۔  
 جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو تو میں ایک ہی بات  
 سوچتی ہوں کہ میں نے ایسی کون سی نیکی کی ہوگی جس کا  
 اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا پیارا شرم دیا ہے۔ ”آئی یو یو سو سو سو  
 جی! اپنا ڈیویر سارا خیال رکھا کرو میرے لیے میری خاطر۔  
 اللہ تمہیں ہمیشہ اپنی پناہ میں رکھے آمین۔  
 سلمیٰ مسووش..... ملتان  
 شاہزاد کے نام

ڈیئر چارلس! حیران ہو رہے ہو۔ ہاں ہاں یہ میں  
 ہوں! ”انا شاہزاد“ منہ بند کرو! کا کروچ تمہاری پینٹ میں  
 ہے۔ ادھر آؤ ذرا رازے آؤ تو۔ دیکھو تمہاری شہرت کا بٹن  
 ٹوٹا ہوا ہے۔ میں نہیں لگا رہی جاؤ وہاں سے لگو آؤ کھانا  
 آئی سعدیہ سے کھاؤ اور باتیں اپنے دوستوں سے کرو اور  
 سونا چھتے جا کے اؤکے تمہاری میڈ ونا اور مانا پاپا دعا  
 اسامہ رجا یعنی اسل اسود آئی کس یو آئی یو سو سو جی۔  
 اللہ کرے تم سب ہمیشہ خوش رہو آمین۔  
 انا شاہزاد..... گجرات  
 پیاری نوشی کے نام  
 اسلام علیکم! کیسی ہو آپ؟ امید ہے کہ آپ بہت  
 ٹھیک اور خوش ہوں گی اور دعا ہے کہ یونہی آپ ہستی  
 مسکراتی رہو آمین۔ آپ کو بہت بہت سالگرہ مبارک  
 ہو۔ سوچا تھا کہ آپ کی سالگرہ یہ اچانک آپ کو بزدل  
 سر پرانز دوں گی آپ کے پاس آئے لیکن جو سوچو وہ کب  
 ہوتا ہے۔ ہوتا تو وہ ہے جو بھی آپ کے گمان میں بھی نہ  
 ہو۔ خیر آپ کو آپ کا ختم دن بہت مبارک ہو ہو سکے تو  
 معاف کرو دنیا پلیر ہمیشہ خوش رہنا آپ۔  
 تالی جو بددی..... آکسفورڈ یو کے  
 ہم سب کی پری اور اماں کی شہزادی کے نام  
 ہماری پیاری پھولوں سی بہن نوشی اقبال نوشی 27 جولائی کو  
 تمہاری سالگرہ ہے۔ بہت بہت مبارک ہو سب  
 گھر والوں کی طرف سے۔ اللہ کرے تم ہمیشہ خوش رہو  
 کوئی تم تمہاری زندگی میں نہ آئے۔ خوشیاں اور کامیابیاں  
 تمہارے قدم چومیں آمین۔ میری عزیزین اور اماں جی  
 کی دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔ تم تھوڑی دیر کے  
 لیے بھی گھر نہ ہو تو گھر میں کوئی خوشی کوئی رونق نہیں رہتی  
 (بقول اماں جی کے) ہمارے گھر کی ساری رونق میری  
 شہزادی یعنی نوشی کے وجود سے ہے اور واقعی ایسا ہی  
 ہے نوشی! ہماری محبتیں اور دعائیں ہر لمحہ تمہارے لیے  
 سایہ فکن ہیں۔ خوش رہو اور ہاں تمہاری گاؤں والی تمام  
 دوستوں کی طرف سے بھی تمہیں مبارک باد دے دوں

کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ آچل میں ہماری طرف سے  
 بھی نوشی کو مبارک باد دینا۔ سو تمہیں کتنا رضوانہ نوشی! نصیہ  
 صبا اور مصباح کی طرف سے بھی سالگرہ مبارک اور  
 ڈیروں دعا میں۔  
 نورین اقبال اور عزیزین اقبال..... گاؤں بدر مر جان  
 مانی سویت فرینڈ شہرہ کے نام  
 اسلام علیکم! کیسی ہو شہرہ؟ امید ہے تم ٹھیک ہی ہوگی  
 کیا ہوا۔ ہوگی نہ سر پرانز کے میں نے آچل کے  
 ذریعے تمہارا حال پوچھا؟ چلو اب تو مسکراؤ۔ شہرہ!  
 تم میری بہت اچھی اور پیاری دوست ہو۔ میری اللہ  
 رب العزت سے دعا ہے کہ وہ تمہیں اپنی تمام رحمتیں  
 برکتیں عطا کرے۔ تمام جہانوں کی خوشیاں عطا  
 فرمائے تمہیں زندگی میں کوئی پریشانی اور دکھ نہ  
 ملے۔ تم ہر دم ہستی مسکراتی رہو اور اللہ تمہاری ہر دلی  
 مراد پوری کرے آمین۔

مہر النساء..... بھوپا  
 سنی آکسفورڈ کے نام  
 اسلام علیکم! کیسی ہو خوش رہو۔ تم کو یاد ہوگا کہ تم نے  
 کچھ عرصہ پہلے ایک سوال پوچھا تھا۔ ویسے تو (صائمہ  
 قریشی..... آکسفورڈ) نے اس کا خاصا مفصل جواب دیا  
 تھا مگر میں مجھے لگا کہ مجھے بھی کہنا چاہیے پہلے تو معذرت  
 کہ اتنے عرصے بعد جواب دے رہی ہوں اصل میں کچھ تو  
 گھر بلیو مصروفیت اور کچھ میری ازلی سستی کے باعث اتنی  
 دیر ہوئی۔ تم نے پوچھا لڑکے عشق میں پاگل کیوں نہیں  
 ہوئے صرف لڑکیاں ہی کیوں پاگل ہوتی ہیں۔ تو کسی ڈیئر!  
 قصہ کچھ یوں ہے کہ عمو ہمارے رائٹر زعزورت کی صنف کو  
 بہت مظلوم بنا کر پیش کرتے ہیں ٹھیک ہے کہ لڑکیاں  
 جنونی ہوتی ہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ لڑکے بھی محبت میں اتنی  
 ہی شدت رکھتے ہیں جتنی لڑکیاں۔ کیونکہ یہ شدت کسی  
 صنف کے حزان میں نہیں یہ شدت تو محبت کے اپنے وجود  
 کی ہوتی ہے۔ محبت جتنی شدت رکھتی ہے یہ اتنی ہی جنونی  
 بھی ہوتی ہے۔ لڑکیاں فطرتاً نازک ہوتی ہیں یہ اس شدت

کو اپنے اندر سمو نہیں سکتیں مگر لڑکے اس شدت کے آگے  
 ہتھیار نہیں ڈالتے اور جب لڑکیاں اپنے کوکل وجود میں اس  
 شدت کو سمونے کی کوشش کرتی ہیں تو یقیناً وہ اختیار کو قبول  
 ہیں اور جہاں تک تعلق ہے مرد کے انتظار کرنے کا تو ڈیئر  
 یہ ہمارے رائٹر کی کوتاہی ہے خاص طور پر خواتین رائٹر کی  
 (معذرت کے ساتھ) کہ وہ مرد کی محبت میں شدت کو  
 سامنے نہیں لائیں اور اگر کبھی ایسا کر بھی دیں تو اتنی اتار پستی  
 اور جنونیت کے ساتھ کہ لڑکی خالم ہو کر بھی مظلوم لگنے  
 لگے۔ انتظار تو مرد بھی کرتے ہیں۔ ہاں یہ الگ بات ہے  
 کہ وہ ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اب  
 اجازت دو تمہاری رائے کا انتظار ہے گا اللہ تمہارا حامی و  
 ناصر ہو۔ والسلام۔  
 نور شفیق..... ہری پور  
 ڈیئر رشانہ اقبال کے نام  
 سلام ونا! آپ کا خط نظروں سے گزرا پڑھ کر بہت  
 دکھ ہوا۔ مجھے نہیں بتا آپ کن حالات و واقعات کی وجہ  
 سے زندگی جیسی نعمت سے بے زار ہو گئی ہیں لیکن میں پھر  
 بھی آپ سے اتنا کہوں گی کہ انسان کو ہر دکھ کا حوصلہ سے  
 مقابلہ کرنا چاہیے۔ مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ وقت اچھا  
 بھی گزر جاتا ہے اور بُرا بھی۔ بس ہمیں تھوڑا صبر سے کام  
 لینا چاہیے۔ ہم سب آچل نمبر زائیک فیملی کی مانتی ہیں ہم  
 سب ایک دوسرے کے دوست ہی ہیں اگر کوئی اور بہن  
 بھی دوستی کرنا چاہتی ہے تو دل کے دروازے کھلے ہیں۔  
 میری اچھی بہن! پریشان نہ ہو زندگی میں اچھا ہوا نہ ہوتا رہتا  
 ہے لیکن ہمیں ہمت سے کام لینا چاہیے، خدا حافظ۔  
 شہناز امین راجپوت..... کوٹ رادھا کشن  
 عزیزین نواز اور بہت ہی ایپول کے نام  
 سویت امیر (امیر کہہ سکتی ہوں نا؟) کیسی ہو؟ جواب  
 دیر سے دیا پر امل وہی ”رڈی کی نو کری“ (اگر اب بھی بچ  
 گیا تو.....؟) دوستی کی آفر ٹھکراتا کفران نعمت ہے بار اور  
 میں ایسی غلطی نہیں کیا کرتی۔ مجھے خوشی ہوگی۔  
 (دیکھو! تو تھ پیٹ کا اشتہار ہی تمہارا دوستی کے لیے بڑھا

ہاتھ تھام رہی ہوں) اور ایسے بھی بے خلوص لوگوں کی تو مجھے ہمیشہ تلاش رہتی ہے۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں نامونی! مارچ میں میری ایک عزیز ترین سستی کی برتھ ڈے سٹی وٹن نہ کر سکی (ناراضگی معاف! دیکھیں آپ کے کان پکڑتی ہوں) (مرضیہ زین! مشعل! ناجی! اسامہ! صوباجی! اور "بلی" تم سب کو بہت یاد کرتی ہوں۔ خدیجہ طاہرہ (فیصلہ میڈیکل کالج! گجرات) لگتا ہے پڑھائی میں "رومان" کو بالکل بھول گئی ہو (ہے نا؟)۔ تمہیں پتا ہے میں پیارے سے بھانجے "یوشع" کی آئی بن گئی ہوں میرا بیٹا پڑھو تو فوراً کنٹیکٹ کرنا (یہ میرا حکم ہے)۔ اسامہ کے بچے میری تصویریں ابھی تک نہیں پیچیں! اقصیٰ ذرا اس لبو کے کان کھینچو نا۔ بہت سی دعاؤں کے ساتھ آپ کی اپنی۔

رومان ملک..... جنگ صدر

آئینہ بزم کے تمام قارئین کے نام  
اسلام علیکم! میں اپنی دوست تحمیدہ کو دعا اور سلام کہنا چاہوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ تم آج کل پڑھ رہی ہو گی اور سناؤ کیا کر رہی ہو؟ ایم اے کا امتحان دے دیا ہے یا بی الحال پونہ کی وقت گزار رہی ہو؟ اور موش تم کیسی ہو؟ اب کہاں ہو؟ پڑھو تو رابطہ ضرور کرنا۔ عطر وہ سکندر تم کیسی ہو؟ اور بے حد شکر یہ تمہارا کہ تم نے میرا نام لیا۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو کامیاب و کامران کرے۔ دعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا نیک خواہشات کے ساتھ اجازت دیں والسلام۔  
سلما کبر شیریازی..... اوج شریف

آج کل اسٹاف اور قارئین کے نام  
اسلام علیکم! آج کل اسٹاف اور پیاری پیاری قارئین! آپ سب کیسی ہیں؟ یقیناً بہار کی طرح تروتازہ اور خوش و خرم ہوں گی۔ اللہ آپ سب کو یوں ہی ہنستا سکراتا رکھے آئین۔ میں نے بہت دنوں کے بعد آج کل سے رابطہ کیا ہے۔ فرحت آئی کی وفات نے ایسا ملول کیا اور دل اتنا دکھی ہوا کہ دوبارہ آج کل میں شرکت کی ہمت ہی نہ ہوگی۔ اس لیے میں آپ سب سے تعزیت بھی نہ کر سکی۔ اس کے لیے معذرت۔ اب میں نے سوچا کہ چلو آپ سب

سے تعزیت کر رہی ہوں! اور بے کفرحت آئی کے جانے سے ہمارا جو نقصان ہوا ہے وہ شاید ہی پورا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرحت آئی کو جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے آمین۔  
مقدس رباب..... چکوال

ایک پیاری سی دوست کے نام  
آپ سب کو میری طرف سے محبتوں بھر اسلام! انا احب! کیسی ہو؟ انا میں آپ سے دوستی کرنا چاہتی ہوں کیا آپ مجھے دوست بنا سکیں گی؟ سہاں گل اور انور خان آپ بھی مجھے دوست بنالیں۔ امید کرتی ہوں آپ تینوں میری دوستی کا پیغام قبول کر سکیں گی۔ میری دوست اُجالا! مجھ سے سات آٹھ سال پہلے پھٹ گئی۔ اُجالا! آپ آج کل پڑھتی ہیں تو مجھ سے آج کل کے ذریعے رابطہ کرنا دعاؤں میں یاد رکھنا۔ فقط آپ سب کی دعاؤں کی منتظر۔ اللہ ہم سب کو خوش رکھے اور نیک کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے خدائے پامان۔

انا انعم..... سلطان کالونی  
میری پیاری سارہ لنگریاں اور سلٹی اسلام کے نام  
اسلام علیکم! کیسی ہو آپ؟ میری تو اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو صحت یاب اور خوش رکھے آمین۔ آپ نے تو میری دوستی قبول کرنے میں اتنی درگدہ کی کہ مجھے لگنے لگا تھا کہ شاید میں آپ کی دوستی کے لائق ہی نہیں ہوں لیکن دیر سے سہی آپ کا جواب پڑھ کر مجھے کتنی خوشی ملی ہے میں شاید اس خط میں بیان نہ کر سکوں۔ میری آج کل میں فرسٹ فرینڈ سارہ آپ ہو اور سلٹی اسلام ہے۔ میری کوشش رہے گی کہ میں ایک مخلص دوست بن کر رہوں اور ہماری دوستی کا رشتہ مضبوط سے مضبوط رہتا جائے آمین۔ میں اور بھی بہت کچھ لکھنا چاہتی ہوں پر مجھے ڈر ہے کہ میرا خط شائع کرنے کی بجائے ڈسٹ بن کے منہ میں ہوگا سو ابھی کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ آپ اپنا بہت بہت زیادہ خیال رکھنا میرے خط کا جواب ضرور دینا انتظار رہے گا مجھے اجازت چاہتی ہوں خدا حافظ۔  
طاہرہ غزل..... جتوئی

میرا شریف طور کے نام

اسلام علیکم! کیا حال ہے آپ کا؟ امید ہے ٹھیک ہوگی! میرے آپ کا تعارف پڑھا بہت اچھا لگا۔ آپ بہت اچھا لکھتی ہیں میرا جی! میں آپ سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے آپ کی بہت دوستیں ہوں گی اور شاید آپ کے پاس نام بھی نہ ہو مجھ سے دوستی کرنے کا۔ میرا جی! میرا آپ سے دوستی کرنے کا ارادہ اب نہیں بنا بلکہ جب آپ کی کہانی "محبت رنگ دھنک اونٹ" کر چل رہی تھی میں اس وقت سے سوچ رہی تھی ہر دفعہ اس وجہ سے دوستی نہیں کرنی! شاید آپ دل تو دیں اور انکار کریں لیکن اس دفعہ سوچا اپنے دل کی بات کہ دوں پلیز مجھے نامید مت کیجیے گا۔ میں اتنی زیادہ بڑی نہیں ہوں! آپ کی دوستی پر پوری اتروں گی۔ آخر میں میرا جی! صرف اتنا کہوں گی میرا دل زرخش سے بھی زیادہ حساس اور نازک ہے۔ میرا جی! میں آپ کو ہر وقت یاد کرتی ہوں ہر صبح ہونے کے بعد میں سوچتی ہوں کہ آج میری آپ سے بات ہوگی۔

کشف زہرہ..... میانوالی تحصیل پیراں  
آج کل بڑے دالوں کے نام  
اسلام علیکم! کیا حال ہے آج کل پڑھنے والیوں کا؟ ٹھیک ہے۔ عطر وہ سکندر طاہرہ ملک ظل ہما سارہ لنگریاں! ہما احمد! اقصیٰ ماہ نور! اماں! شہ! ہما سارہ! نازی! نازی! چند امثال! حور! ارم! نازش! خان! رومان! ملک! زکیہ! سمیعہ! ہران! راجہ عمر حیات! ہران! اور! آمنہ! سدرہ! اقرا! طیبہ! عائشہ! ہران! آپ لوگ سدا خوش رہو! گلگھلانی رہو! اور! الی! جب شانزے! آپ کہاں غائب ہو؟ احمد حسن میرے گول منوں سے بھائی! کیسے ہو؟ پردیس میں رہتے ہو! ہماری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔

(الفت زہرہ)

آج کل کے نام  
اسلام علیکم! زندگی کچھ اس ڈھب سے گزر رہی ہے کہ سر کھانے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ وہی سدرہ! حمر عمران! جس کے مراسلات ہر ماہ آج کل کی زینت بنتے تھے۔

گردش دوراں میں کچھ اس طرح سے کھو گئی کہ اب رسالے بڑھنا بھی خواب و خیال ہوا۔ تب کہا جاتا کہ وہی نہیں سکتا کہ کبھی میگزین پڑھنے کی آگن ختم بھی ہو سکتی ہے اور اب ہنسی آتی ہے اپنی ہی باتوں پر۔ کتنا کچھ بدل گیا ان چند برسوں میں۔ فرحت! آراء! کی! نکلیں! آج کل ہی دھوا لگتا ہے۔ کچھ روز قبل ٹویبہ ہما کا بیج آیا کہ کیا "حور ارم" تمہاری دوست ہے؟ اور ہم سوچ میں غلطاں۔ کون حور ارم؟ جواب آیا کہ اس کا بیج آیا ہے آج کل میں تمہارے نام۔ سوچا، اچھا دیکھیں گے۔ اور پھر وقت کا گرداب۔ آج نیٹ پر سرفنگ کرتے ہوئے آج کل کا خیال آیا تو ویب سائٹ اوپن کی اور مکی کے شمارے میں "ہمارا آج کل" میں حور ارم شاہ کا تعارف پڑھا۔ اچھا لگا۔ ہم آپ کے نام سے انجان ہیں ارم۔ تاہم آپ کی خواہش پر بذریعہ آج کل رابطہ کر رہے ہیں۔ آپ "قیس بک یوزر" ہیں تو ہمیں جوائن کر سکتی ہیں sahr3606 پہ ہمیں میل کر سکتی ہیں۔ خوش رہیں۔

سدرہ حمر عمران..... کراچی  
دوستوں کے نام  
ذیر آل! اسلام علیکم! کیسے ہیں آپ سب؟ ملائیکہ چوہدری اور سدرہ ناز مجھے آپ کی دوستی قبول ہے۔ باقی سب دوست 346 بار سوچ کر 745 بار پھر سوچنا 28 بار پھر سوچنا اور 41 بار فائل کر دینا۔ میرے پاس ہوں گے۔ بشری نوید باجوہ سے جو ربط رکھنا چاہے وہ بھی سوچنے والا طریقہ استعمال کرے۔ حما آئی آپ پلیز بیج شائع کرویں خدا حافظ۔

سارہ لنگریاں..... سرگودھا



(زابدہ ملک کی پسند..... دیہ پاپور سے)

کٹھن ہے زندگی  
سفر و شوار ہے کتنا  
کبھی پاؤں نہیں ملتے  
کبھی رستہ نہیں ملتا  
ہمارا ساتھ دے پائے  
کوئی ایسا نہیں ملتا  
فقط ایسے گزروں تو  
پیر و شب نہیں کتنے  
نہ کتنے تھے بھی پہلے  
مگر اب نہیں کتنے  
مجھے پھر بھی میرے مالک  
کوئی شکوہ نہیں تجھ سے  
میں جاں پر کھیل سکتا ہوں  
میں ہر دکھ کھیل سکتا ہوں  
اگر تو آج ہی کر دے  
محبت ہم سفر میری

(ساجدہ زید کی پسند..... دیہ ووالہ سے)

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا  
وہ تیری یاد تھی اب یاد آیا  
آج مشکل تھا سنبھلنا اے دوست!  
تو مصیبت میں عجب یاد آیا  
دن گزارا تھا بڑی مشکل سے  
پھر تیرا وعدہ شب یاد آیا

تیرا بھولا ہوا پیان وفا  
مر جائیں گے اگر اب یاد آیا  
حال دل ہم بھی سناتے لیکن  
جب وہ رخصت ہوا تب یاد آیا  
بیٹھ کر سایہ گل میں ناصر  
ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا  
(دعا نور کی پسند..... لالہ موسیٰ سے)

بارشوں کے موسم میں  
وقت کے اندھیروں میں  
میں نے اس سے پوچھا تھا  
چھوڑ تو نہ جاؤ گے  
ہاتھ تھام کر اس نے  
کان میں یہ بولا تھا  
کیسے چھوڑ سکتا ہوں  
تم تو جاں ہو میری  
اور ان ایسے ہی  
وقت کی تمازت میں  
وشتوں کے موسم میں  
میں نے اس سے پوچھا ہے  
چھوڑ کر ہی جانا تھا  
آس کیوں دلائی تھی  
پیار کیوں جگائی تھی  
میرے ان سوالوں پر  
چلتے چلتے وہ بولا  
موسموں کی عادت ہے

وقت پر بدل جانا

(سکینی ملک کی پسند..... قادر پورال سے)

کب تلک اپنی پیش میں آپ چلنا ہے تجھے  
دوپہر کی دھوپ تو آخر کو ڈھلنا ہے تجھے  
سائیں چھتی کرچیوں کا بے نہایت راستہ  
اور اس پر زندگی بھر تیز چلنا ہے تجھے

رنگ مہندی کے ہوں یا تلی کے، اوروں کے نصیب  
ہاتھ کی پھکی لکیروں سے بھلنا ہے تجھے  
خیر و شر میں فیصلے کا وقت ہے ترکش سنبھال  
اپنے لشکر سے مثال خر نکھنا ہے تجھے  
ریشمی رشتوں سے محسن اتنا بے پروا نہ ہو  
لغزشوں کی بھید میں آخر سنبھلنا ہے تجھے  
(شگفتہ خان کی پسند..... بھلولال سے)

سنو!  
مجھے اتنا تو بتلا دو  
کہ میرا جرم ہی کیا تھا  
جو تم نے مجھ کو بھلا ڈالا  
وجہ کچھ تو بولی ہوگی  
جودل سے ہر نقش مٹا ڈالا  
مگر میں کیا کروں اپنا  
کہ میرے دل میں تمہاری چاہت کا  
ہر اک نقش گہرا ہے  
آج بھی ہر اک لمحہ زندہ ہے  
بتاؤ! کیا کروں ایسا کہ  
تم کو بھول جاؤں میں  
اور تمہاری طرح میں بھی  
اپنے دل کو پتھر کر ڈالوں  
مگر مجھے اتنا تو بتلا دو  
کہ میرا جرم ہی کیا تھا  
سوائے تم کو چاہئے کے  
(انجم چوہدری کی پسند..... جیوٹی سے)

کوئی کیسے بکھرتا ہے  
اگر یہ جانا چاہو کوئی کیسے بکھرتا ہے  
چمن میں جا کے خزاں میں  
کبھی بچوں کو دیکھو تم  
یا پھر اک آئینہ لالو

اسے پتھر پہ دے مارو  
اگر مشکل ہو کم کو تو  
کسی خوب صورت پھول کو لینا  
اسے ہوا کے دوش پر رکھنا  
تو پھر تم جان جاؤ گے  
کوئی کیسے بکھرتا ہے  
اگر یہ بھی نہ ہو تم سے  
تو میرے پاس آ جانا  
میرا دیدار کر لینا  
خبر یہ ہوئی جائے گی  
کوئی کیسے بکھرتا ہے

(ہما ایوب شیخ کی پسند..... عارف والہ سے)

کہیں تم اپنی قسمت کا لکھا تبدیل کر لیتے  
تو شاید ہم بھی اپنا راستہ تبدیل کر لیتے  
اگر واقعی ہم کم حوصلہ ہوتے محبت میں  
مرض بڑھنے سے پہلے ہی دوا تبدیل کر لیتے  
تمہارے ساتھ چلنے پہ جو دل راضی نہیں ہوتا  
بہت پہلے ہی ہم اپنا فیصلہ تبدیل کر لیتے  
تمہیں ان موسموں کی کیا خبر ملتی اگر ہم بھی  
گھٹن کے خوف سے آب و ہوا تبدیل کر لیتے  
تمہاری طرح جینے کا ہنر آتا تو پھر ہم بھی  
مکان اپنا وہی رکھتے پتا تبدیل کر لیتے  
جدائی بھی نہ ہوتی، زندگی بھی سہل ہو جاتی  
جو ہم اک دوسرے سے مسئلہ تبدیل کر لیتے  
ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ہم بول اٹھے وگرنہ  
گواہی دینے والے واقعہ تبدیل کر لیتے







شاملہ کاشف

پروین افضل شاہین..... بہاولنگر

س: میری سالگرہ کے موقع پر میرے میاں جانی پرنس افضل شاہین ہمیشہ بیمار کیوں ہو جاتے ہیں؟

ج: ظاہر ہے۔ خرچے کے خوف سے.....

س: میں جب بھی سالگرہ کی بات کرتی ہوں تو وہ چھت کو گھورنے لگتے ہیں آخر یہ کیا ماجرا ہے؟

ج: سوچتے ہوں گے چھت کی مرمت کروائیں یا تمہاری سالگرہ منائیں!

س: میرے سر میں درد ہو رہا ہے کیا کروں؟

ج: اپنا سر دیوار میں دے مارو۔ سر کا درد دیوار میں منتقل ہو جائے گا۔

زامرہ خشک..... میانوالی

س: آپ کی کیا زندگی بے وفا ہے یا انسان؟

ج: زندگی بے وفا نہیں۔ زندگی کی میعاد مقدر ہے۔

س: آپ کی شعر کا جواب شعر سے دیں۔

وہ محبتوں کے سودے بھی عجیب کرتا ہے  
بس مسکراتا ہے اور خرید لیتا ہے

ج: ہر ایک کے لیے نہ کھلا رکھ اسے قاتل  
یہ دل ہے ایک گھر اسے بازار مت بنا

صدف سلیمان..... شورکوٹ شہر

س: ہم جن پر سب سے زیادہ بھروسہ کرتے ہیں؟

وہی لوگ دکھ کا سبب کیوں بنتے ہیں؟

ج: دکھ انسان نہیں، انسان سے وابستہ توقعات دیا

کرتی ہیں۔

س: خوشی کی عمر چھوٹی اور غم کی عمر لمبی کیوں ہوتی ہے؟

ج: کسی دانش ور نے کہا ہے کہ خوشی دو بڑے غموں کے درمیان آنے والے وقفے کا نام ہے۔

س: کہتے ہیں کہ دل کی ہزار آنکھیں ہوتی ہیں تو پھر آپے محبوب کے عیب نظر کیوں نہیں آتے؟

ج: محبت اندھی ہوتی ہے۔

سمیرہ اندیم..... اسلام آباد

س: شکیل آپ کی گری کا کیا حال ہے؟

ج: تم کسی اور سارے کی مخلوق ہو کیا؟

س: آپ کی اگر کوئی مسلسل ہمیں قصور وار سمجھے اور صفائی بھی نہ سنے تو ہمارا کیا رد عمل ہونا چاہیے؟

ج: خاموشی اختیار کریں۔ سچائی خود بخود اپنے آپ کو منواتی ہے۔

س: ہم دار فانی سے کوچ کرنے والوں کا غم تو بہت کرتے ہیں مگر جو ہمارے ساتھ رہتے ہیں ان کا خیال کیوں نہیں کرتے؟

ج: یہ بھی ایک اہل حقیقت ہے کہ انسان کی اصل قدر اس کے چھڑ جانے کے بعد ہی ہوا کرتی ہے۔

عشال..... جہلم

س: آپ کی اوہ کیا چیز ہے جو دیکھنے میں حقیقت ہے مگر درحقیقت وہ حقیقت نہیں؟

ج: فلم

س: ایک میں بھی تھا تھے سو میں بھی اکیلے ہیں اس کی پہلی سطر بھلا کیا ہے؟

ج: آئینے کے سوکڑے ہم نے کر کے دیکھے ہیں۔

س: آپ کی آپ بہت حاضر دماغ ہیں آخر اس کا راز کیا ہے؟

ج: یادام کا حلوہ۔

عمرانہ شاہین..... ڈھوک راہم  
س: ابھی مجھے تو ہر وقت انتظار ہوتا ہے بھلا کس کا؟

ج: آنچل کا۔

س: میری تنہائی کا ساتھی میرا غم خواہ کبھی ہنساتا ہے کبھی حوصلہ دیتا ہے۔ سبق آموز باتیں بتاتا ہے؟

بھلا کون؟

ج: آنچل!

طیبہ شیریں..... کوری خدا بخش

س: آپ میری کیا لکتی ہیں؟

ج: جواب میری لکتی ہیں یعنی بہن!

س: اگر صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو.....؟

ج: ظاہری بات ہے کہ اسے بھولا نہیں کہتے۔

س: اسے دیکھا تو خیال آیا.....؟

ج: زندگی دھوپ، وہ، گھنا ساریہ۔

اربیہ کائنات..... جتوئی

س: ایسا! جن لوگوں کی ہمیں قدر ہوتی ہے وہ ہم سے کیوں چھڑ جاتے ہیں؟

ج: پچھڑنا زندگی کی کڑی حقیقتوں میں سے ایک ہے۔ اس سے بھجوتا کرنا چاہیے۔

س: ان کے بغیر ہمارا دل اداس ہے بتائیں کن کے بغیر.....؟

ج: شدید گرمی میں جزیئر کے بغیر۔

زاہدہ ملک..... دیپالپور

س: ناملہ آئی! اگر پوری دنیا چند لمحوں کے لیے ساکن ہو جائے تو وہ کون سی چیز ہوگی جو آپ دنیا سے ختم کرو دینا چاہتی ہیں؟

ج: مہنگائی، رشوت، بدعنوانی، بے روزگاری۔

س: شکیل آپ مجھے دنیا بھر لگتی ہے جب؟

ج: بجلی چلی جاتی ہے نا!

س: شاملہ اپنی! "دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا" بھلا کیا؟

ج: جب رزلٹ کے لیے اخبار دیکھا اور اپنا رول نمبر کہیں نہ ملا.....

یا سمین کنول..... پسرور

س: بجٹ کیا نوید لائے گا؟

ج: مزید مہنگائی کی نوید آتا تو یہی بتاتے ہیں۔

س: جون، جولائی، اگست شدید گرمی، جس اور بارش کے جوالے سے کیوں یاد کیے جاتے ہیں؟

ج: ہم تو شدید گرمی میں ساون کو یاد کرتے ہیں۔

س: محبت اور نفرت میں توازن کیوں ضروری ہے؟

ج: توازن تو ہر جذبے اور ہر رشتے میں ضروری ہے۔

س: صبح کا آغاز کیسے کیا جائے؟

ج: اللہ کے پاک اور بابرکت نام ہے۔

س: بچوں کو چھٹیوں میں غریب لوگ کہاں لے جائیں؟

ج: بچوں کے ابا کے سرال۔

طیبہ ندیر..... شاد پورال گجرات

س: آپ کی آپ کا اشار کیا ہے ضرور بتائیے گا؟

ج: سارے ستارے اپنے سے لگتے ہیں۔

س: آپ کی میری 23 جولائی کو سالگرہ ہے جلدی سے وش کریں نا!

ج: پہلے تم ہمیں وش کرو کیونکہ ہماری سالگرہ بھی جولائی میں ہے۔

س: آپ کی مجھے میٹھی چیزیں بہت پسند ہیں کیا آپ کو بھی؟

ج: ہمیں تم سب کے کٹھے میٹھے سوالات زیادہ پسند ہیں۔

# گامی تیز

حناء احمد

اسلام علیکم و آلہ وسلم قارئین!

”ہارٹ ایک“ دل کا دورہ اس جدید اور پُر آسائش دور کی نہایت مہلک اور جان لیوا بیماری ہے اور بلا مبالغہ ہر تین میں سے دو لوگ اسی کے سبب قلمہ اجل بن رہے ہیں۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں جن میں بے روزگاری حد سے زیادہ اسراف دوسروں کی بے جا تنقید احساس کمتری احساس برتری رسومات کی بھرمار رشتوں کی حرمت کا برقرار نہ رہنا اچانک خوشی اور اچانک کسی بڑے دکھ کی خبر ملنا وغیرہ شامل ہیں۔ در حقیقت اس بیماری کا سبب ہماری زندگیوں سے اعتدال میانہ روی کا ختم ہو جانا ہے۔ ہم ہر معاملے میں یا تو افراط کا شکار ہیں یا تفریط کا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات کوئی خوشی کی خبر بھی انسان کی موت کا سبب بن جاتی ہے۔ لہذا اعتدال ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”وہ شخص بھی تنگ دست (پریشان) نہیں ہوگا جس نے اعتدال (میانہ روی) اختیار کی۔“

خیر بات ہو رہی تھی دل کے دورے کی اگرچہ اس بیماری کو ختم نہیں کیا جاسکتا مگر میانہ روی کے سبب اس میں کمی کی جاسکتی ہے۔ اگر پھر بھی افادہ نہ ہو اور دل کا دورہ پڑ جائے تو اس کے لیے درج ذیل ہدایات پر عمل کریں۔

1۔ اگر دل کا دورہ پڑنا شروع ہو جائے یعنی آپ کے سینے میں درد شروع ہو جائے اور یہ درد آپ کے بازو میں اور اس کے ساتھ ہی جڑ سے میں شروع ہو جائے تو

فورا سمجھ لیں کہ یہ دل کا دورہ ہے۔ تو فوراً لا الہ الا اللہ پڑھ کر گہرا سانس لیں۔ اس کے بعد زور سے کھانسیں جس طرح جما ہوا بلمم باہر نکالنے کے لیے کھانسیں ہیں۔ (اس طرح کھانسا جسم کے مدافعتی نظام کے لیے ضروری ہے)۔

2۔ یہ عمل (گہرا سانس لینا اور زور سے کھانسا) لگاتار کرتے رہیں۔

3۔ اگر آپ کے پاس (Angacid) گولی ہو تو فوراً زبان کے نیچے رکھیے یا دو گولی اسپرین (Asprin) چبا کر کھالیں۔

4۔ ہر کھانسنے سے پہلے گہرا سانس ضرور لیں یعنی ایک دفعہ کھانسیں اور ایک دفعہ گہرا سانس لیں یہ عمل لگاتار کریں تاکہ پورے جسم میں دوران خون صحیح طریقے سے برقرار رہے۔ اس سے دل کو حسب ضرورت آکسیجن ملتی ہے اور دل کی دھڑکن اور سانس کی بے قاعدگی دور ہو جاتی ہے۔ اس طرح آپ بے ہوشی سے قبل اسپتال پہنچنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

بآذن اللہ تعالیٰ۔

مندرجہ بالا طریقوں سے دل کو قوت ملے گی اور یہ ورزش بھی ہے۔ لہذا انہیں عادت بنانے کی ضرورت ہے۔

بحوالہ طب نبوی۔

ہما ایوب شیخ..... عارف والا

اگر نیند نہ آئے تو

1۔ خشخاش کا تیل کپٹی پر لگانے سے جلد نیند آجائے گی۔

2۔ سرخ نمائز کاٹ کر اس پر چینی چھڑک کر کھائیے۔

3۔ سونے سے پہلے پیاز کا استعمال کریں۔

4۔ سونے سے پہلے فروٹ چاٹ کھانے سے نیند

ج: راستے بند ہیں نہیں آسکتے۔

س: جاری ہوں ارے ہمیشہ کے لیے نہیں پھر آؤں گی؟

ج: شکر ہے گئیں۔

ہما احمد..... فیصل آباد

س: ہائے دیدی کسی ہیں آپ؟

ج: اچھی ہیں۔

س: کیا آپ کو میرا دیدی کہنا برا لگا؟

ج: نہیں۔

س: پیاری دیدی ہم اندھا دھند مغرب کی تقلید کیوں کر رہے ہیں کیا ہمارا اپنا کوئی مقصد نہیں ہے؟

ج: نہیں۔

س: دیدی آپ کے خیال میں محبت کیا ہے؟

ج: صرف محبت۔

س: دیدی مرد بے وفا ہوتا ہے یا عورت؟

ج: دونوں بے وفا نہیں ہوتے۔

س: اچھا دیدی اللہ حافظ ہمیں بھی اللہ حافظ کہیں؟

ج: اللہ حافظ۔

داعی..... میر پور آزاد کشمیر

س: سلام آپ کی کیسی ہیں آپ؟

ج: وعلیکم اسلام! اللہ کا شکر خیریت سے ہیں۔

س: آپ کی خوشیاں اتنی جلدی روئے کیوں جاتی ہیں؟

ج: اچھی چیز تھوڑی ہوتی ہے۔

س: آپ کی میری ماما جانی باوجود میری ہر کوشش کے اکثر مجھ سے ناراض رہتی ہیں بتائیے کیا کروں؟

ج: ان کا کہنا مانو۔

س: آپ کی کیا آپ مجھے کسی اچھی سی دعا کے ساتھ رخصت نہیں کریں گے؟

ج: اللہ آپ کو سلامت رکھے آمین۔

مریم منور گل..... مسندری

س: ایسا! جب ہمارے اعتماد کی کرپیاں ہمارے اپنے بھیر دیں تو ان کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیے؟

ج: کم از کم آپ ان کا اعتماد ضرور بحال رکھیں۔

س: زندگی کو گزارنے کا کوئی خاص گر؟

ج: زندگی کو مخلوق خدا کی خدمت کے لیے وقف کر دو۔

زیر اطا ہرزونی..... بہاولنگر

س: پہلی دفعہ شرکت کر رہی ہوں بہت دور سے مجھے بھی اپنے آنچل میں چھپا لیجیے؟

ج: آنچل آپ کا اپنا ہے۔ آپ کو اجازت دینے کی ضرورت نہیں؟

س: آپ کی اگر میں سٹیک اٹار دوں تو کیسی لگوں گی؟

ج: آئینہ دیکھو اور ہمیں بھی بتاؤ کہ کیسی لگتی ہو؟

س: ایسا! گرمیوں کی سب سے اچھی بات کیا ہے؟

ج: گرمیوں کی شامیں بہت خوب صورت ہوتی ہیں۔

س: سخت گرمیوں اور امتحانات میں سے چھوٹی مشکل کون سی ہے؟

ج: جس کی تیاری نہ ہو وہی بڑی مشکل ہے۔

س: انسان کو پرکھنے کا پیمانہ کیا ہے؟

ج: آپ کا سن نظر۔

فریش اور..... عیسیٰ خیل

س: سلام آپ کی کو پتا ہے میں نے اپنا تک فریش کیوں رکھا؟

ج: وعلیکم السلام نہیں۔

س: آپ کی ترک بھیج رہی ہوں ملتے ہی فوراً اس میں بیٹھ کر عیسیٰ خیل آ جانا۔ آپ سے ملنے کو دل کر رہا ہے؟

آ جاتی ہے۔

۵۔ چائے اور کافی کا استعمال کم کریں۔

۶۔ دودھ اور پھل کا استعمال زیادہ کریں۔

۷۔ بعض اوقات سر میں خشکی ہونے کی وجہ سے بھی نیند نہیں آتی ایسے میں سر کی ماسح کرنا نہایت مفید ہے۔

۸۔ سونے سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے پلچل قدی کریں۔

طیہ نذر..... گجرات

سوڈا پانی کا رب (کھانے والا سوڈا)

آگ سے جل جانے پر بیٹھا کھانے والا سوڈا پانی میں ملا کر گاڑھالیپ بنا کر لگا دیں فوراً آرام آ جائے گا۔

جوڑوں کے درد میں بیٹھا سوڈا پانی میں ملا کر دیں۔

نزلہ زکام میں پانی میں سوڈا ملا کر پی لیں آرام آئے گا۔

کھٹی ڈکار تیز آہستہ پیٹ میں درد ہو تو ایک چمچ بیٹھا سوڈا پانی میں ملا کر پی لیں۔

شوگر کی زیادتی یا بے ہوشی میں ایک کپ دودھ میں ایک چمچ بیٹھا سوڈا ملا کر تین بار صبح دوپہر شام پلائیں

ایک ہی دن میں آرام آ جائے گا۔

گندے زخموں پر بیٹھا سوڈا پانی میں ملا کر لپ کریں۔

مسز ارم جاوید احمد..... کراچی

تربوز

تربوز موسم گرما کا ایک عوامی پھل ہے۔ صحت بخش پانی سے لبریز۔ تربوز کے بیج بھی قوت بخش ہوتے ہیں۔ تربوز کا جوس بدن کو مستعد بناتا ہے۔ گرمی کے اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ پیاس کی شدت مٹاتا ہے۔

پانی بلند پریش کو نازل کرتا ہے۔ پیشاب کا اخراج بڑھا کر گردوں کو لائشوں اور فاسد مادوں سے پاک کرتا ہے۔ ریتان کا علاج ہے۔ بڑھی ہوئی تلی کو ٹھیک کرتا

ہے۔ ہاضمہ ٹھیک کر کے بھوک بڑھاتا ہے۔ بدن میں پانی کا توازن برقرار رکھتا ہے۔ جسم کو ٹھنڈا کر کے شدید دھوپ کے موسم میں مٹنی اثرات سے تحفظ دیتا ہے۔

400 ملی لیٹر کے قریب تربوز کا پانی پینا گرمی کی شدت کے خلاف موثر ڈھال بن جاتا ہے۔ موسم گرما کی شدت میں اگر تیز دھوپ کے دوران باہر نکلنا پڑے تو پہلے تربوز کا 400/500 ملی لیٹر جوس پی لیں۔ اگر کسی پر گرمی اور لوکا اثر ہو چکا ہو تو ایسے مریضوں کو بیجوں کا سفوف یا تازہ جوس کے ساتھ کالا نمک ملا کر دیں۔

پیشاب کا اخراج معمول پر آ جائے گا۔ جس میں نمک اور پانی کا توازن درست ہو جائے گا۔

تربوز کے ایک گلاس جوس میں تھوڑا سا کالا نمک اور کالی مرچ ملا کر صبح اور پھر دوپہر کے کھانے کے بعد پینا

نظام ہضم کو تقویت دیتا ہے۔ صبح خالی پیٹ سب سے پہلے تربوز کا جوس ایک گلاس چھینی ملا کر پینے سے بہت

پرانے سردیوں سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ تربوز کا جوس دن میں 3 یا 4 دفعہ (ہر دفعہ 300-350 ملی لیٹر) پینے سے ریتان دور ہو جاتا ہے اس سے بڑھا ہوا جگر بھی

درست ہو جاتا ہے۔ تربوز کے کٹڑے کاٹ کر رکھ دینا خطرناک ہوتا۔ یہ کھلی جگہ پڑے رہیں تو آلودہ اور غیر

صحت مند ہو جاتے ہیں۔ دھوپ مٹی اور کھلی فضا اس میں جراثیم پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ کچھ دیر کے کٹے ہوئے ٹکڑوں کو بھی نہ کھائیں۔ ان سے ہیضہ کا شدید

خطرہ ہوتا ہے۔ فرنیج میں رکھا ہوا یا کھلا پڑا ہوا تربوز کا جوس بھی صحت کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ تربوز کے استعمال میں خصوصی احتیاط برتنا چاہیے کیونکہ یہ

ہیضہ کرتا ہے۔

مسز ارم جاوید احمد..... کراچی



# تندرستی اور عمارت

لیا بہ احمد

## بچوں میں بری عادتیں

بعض بچوں میں کچھ عادتیں عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ کچھ بچے شدید غصہ کرتے ہیں۔ کچھ غلط طرز عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں مثلاً دوسرے بچوں کو مارنا یا ان کے بال کھینچنا وغیرہ۔ یہ عادتیں ان کی شخصیت کی خوشنویس ہوتیں

بلکہ وہ عموماً ایسا اپنے والدین کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ بعض بچے خاص مواقع پر ایسا طرز عمل اختیار کرتے ہیں جس سے تکلیف ہوتی ہے۔ وہ

دوسرے بچوں کو لٹا مارتے ہیں انہیں کاٹ لیتے ہیں یا غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہیں۔ والدین کو چاہیے کہ وہ

بچوں کی خراب عادتوں کو ختم کرنے کی سعی کریں۔ کم و بیش تمام والدین کو ایسے لمحات کا تجربہ ہوگا جب ان کے تین یا چار سال کے بچے دوسروں کو کاٹ لیتے ہیں یا ان کے بال کھینچتے ہیں۔ ایسے مواقع پر والدین بہت پریشان

ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ”ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم سے کہاں غلطی ہوئی ہے۔“

ایک خاتون کہتی ہیں کہ میری تین سالہ بچی میرے ایک دوست کے بیٹے کے ساتھ آرام سے کھیل رہی تھی

ہم لوگ بھی قریب ہی بیٹھے تھے کہ اچانک میری بیٹی نے اس بچے کے بازو میں کاٹ لیا۔ جب وہ رونے لگا تو میری بیٹی نے ہنسنا شروع کر دیا۔ میں اس سے بہت ناراض ہوئی گھر آ کر اسے ڈانٹا مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی

کہ ہم اس بارے میں اتنے فکر مند کیوں ہیں وہ اسکول میں جانے والی ہے مجھے خوف ہے کہیں وہ کلاس میں یا اسکول میں کسی بچے کو نہ کاٹ لے۔“

ہر بچے کی شخصیت مختلف ہوتی ہے اور ہر بچہ اپنے ماحول کے ساتھ مختلف رد عمل کا اظہار کرتا ہے۔ کچھ بچے

بولڈ ہوتے ہیں اور کچھ شرمیلے۔ مثلاً آپ کی بچی کنڈرگارڈن میں بے خوفی سے جاتی ہے مگر آپ کا بچہ جاتے ہوئے روتا ہے۔

بچے کا ہاتھوں سے مارنا اور کاٹنا ان (بچوں) کے جارحانہ جذبات کا اظہار ہے ان ترکوں کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی (بچی) طرف توجہ دی جائے۔ والدین ہر گز یہ نہیں چاہتے کہ ان کا بچہ دوسرے بچے کو دھکا دے کر یا کاٹ کر اس کا کھلونا چھین لے۔ چھوٹے بچے جو کسی کو کاٹ لیتے ہیں وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس بچے کو تکلیف ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے انہیں دوسروں کے رد عمل پر حیرت

ہوتی ہے۔ بچہ اس عمل کو دو تین مرتبہ دہرائے گا پھر اسے معلوم ہو جائے گا کہ اس بات سے اس کی ماں ناراض ہوتی ہے۔

بچوں کی مارنے چھیننے اور دیگر خراب عادتوں پر والدین کا رد عمل مختلف ہوتا ہے۔ کچھ والدین بچوں کے مارنے اور کاٹنے کو نظر انداز کر دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اس طرح کے طرز عمل کو نظر انداز کرنا ہی بہتر ہے لیکن

اس بات پر توجہ دینی چاہیے خاص طور پر اس صورت میں جب بچہ تین سال سے زیادہ عمر کا ہو اور وہ دوسرے بچوں کے بارے میں ہمدردانہ جذبات کا اظہار نہ کرتا ہو وہ یہ بھی نہیں سمجھتا ہو کہ اس نے کوئی غلطی کی ہے۔

بچے کوئی وجہ سے ایسا غلط طرز عمل اختیار کرتے ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ بڑوں کی توجہ حاصل کرنا ہے۔

ایسا خاص طور پر ان خاندانوں میں ہوتا ہے جہاں ماں باپ دونوں ملازمت کرتے ہیں اور بچہ انہیں اپنے سونے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے دیکھتا ہے۔ ایک خاتون تسلیم

کرتی ہیں کہ وہ ہمیشہ اپنی بیٹی سے کہتی ہیں کہ ”میں مصروف ہوں تم یہاں سے جاؤ اور کھلو۔“ اس نے یہ تسلیم

کیا کہ جب میں ٹیلی فون کرتی ہوں تو میرے قریب کھڑی ہو مجھے تنگ کرنے میں ٹیلی فون پر بیچ طرح بات نہ کر سکوں تو وہ اسے (بیٹی) زور سے دھکا دے دیتی ہے۔

وہ مزید کہتی ہے کہ میں اپنی بیٹی پر سختی سے توجہ نہیں

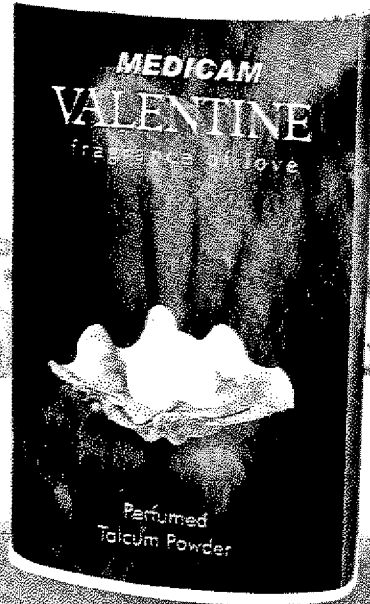


# MEDICAM VALENTINE

Perfumed Talcum Powder

فریج خوشبو جودل میں بس جائے

میڈی کیم  
ویلنٹائن  
پرفیوم ٹیلکم پاؤڈر



French Fragrance  
پاکستان میں پہلی بار

دیتی تھی اسی وجہ سے اس نے دوسرے بچوں کے کاٹنا شروع کر دیا اس طرح اس نے (بچی) اپنی ماں کی توجہ حاصل کر لی اب بچی کے کاٹنے کی عادت بھی ختم ہو گئی۔ وہ صرف یہ ہی چاہتی تھی کہ اسے پیار کیا جائے اور جب وہ اچھا کھیلے تو والدین اس کی تعریف کریں۔ اس طرح اس کا یہ جارحانہ طرز عمل بھی ختم ہو سکتا ہے۔

## بچے کو کاٹنے سے کیسے روکیں

اگر بچہ ہاتھ سے مارتا ہے لاتیں مارتا ہے یا کاٹتا ہے تو اسے سزا دیں بلکہ اسے سمجھائیں کہ یہ غلط ہے اس سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے۔

ایک بچہ کسی دوسرے بچے کو تنگ کرتا ہے تو کچھ دن اس پر کھیلنے کو نہ دینے کی پابندیاں عائد کر دیں۔ یہ (پابندیاں) بچوں کی زندگی میں نہایت اہم ہوتی ہیں۔ بچے کو معلوم ہوتا ہے اس سے کس طرح کے طرز عمل کی توقع کی جا رہی ہے۔

بچے مخصوص کر لیتے ہیں کہ ان کے والدین دباؤ کا شکار ہیں۔ کبھی کبھی ان کا غصہ بچوں پر اتر سکتا ہے۔ اگر آپ گھر میں چیختے چلاتے یا مار پیٹتے کرتے ہیں تو بچوں کو یہ بتانا بے کار ہے کہ وہ ایسی حرکتیں نہ کریں کیوں کہ وہ خود دیکھتے ہیں کہ امی اب تو پس میں جھکڑتے رہتے ہیں۔

ان عادات کے علاوہ بھی بچوں میں کچھ بڑی عادتیں ہوتی ہیں جیسے انگوٹھا چوسنا ناخن چباننا انگلیاں بٹھکانا۔ ایسی عادتوں سے والدین کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

(جاری ہے)

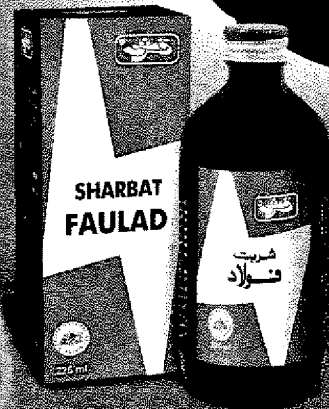


کبھی کبھی بچہ اپنے غصے اور مایوسی کے اظہار کے لیے بھی دوسرے بچے کو کاٹ لیتا ہے۔ جو بچہ بولنے اور زبان کے معاملے میں پیچھے رہ جاتا ہے وہ اپنے ساتھیوں اور اساتذہ سے رابطہ کرنے میں مشکل محسوس کرتا ہے۔ اگر وہ کسی ایسی صورت حال سے دوچار ہو جائے جس کا وہ اپنی زبان سے اظہار نہ کر سکے تو ہو سکتا ہے کہ وہ کاٹنے لگے۔ مختلف مواقع پر بچے اپنا طرز عمل تبدیل کر لیتے ہیں مثلاً پارک میں ایک بچہ اپنے والد کی موجودگی میں جھولا جھول رہا ہے لیکن جیسے ہی اس کی ماں وہاں آتی ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اسے تھو لا جھلائے۔ والدین کے مقابلے میں اساتذہ کے ساتھ بچوں کا طرز عمل مختلف ہوتا ہے۔ بعض بچے بھی دوسرے بچوں کے ساتھ برسرِ ملوک کرتے ہیں، کبھی اپنے کھلونوں پر غصہ اتارتے ہیں اور کبھی اپنے والدین کو تنگ کرتے ہیں۔

ایک بچے کے والد نے بتایا کہ جب وہ اپنے بچے کو اسکول لینے جاتے ہیں تو وہ (بچہ) انہیں دیکھتے ہی غلط حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ اگر اس کے قریب کوئی بچہ کھڑا ہوتا ہے تو وہ اسے دھکا دے دیتا ہے اپنا بیگ پھینک دیتا ہے یا بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں اسے صحیح کر گاڑی میں بٹھاتا ہوں۔ وہاں موجود دیگر لوگ شاید یہ سمجھتے ہوں گے کہ میں اسے اغواء کر کے لے جا رہا ہوں۔ بچے کی ناراضگی کا یہ اظہار کئی وجوہ کا نتیجہ ہو سکتا ہے اس کے والد نے بتایا کہ وہ بچے کو اسکول سے لے جا کر ایک آیا کے سپرد کر دیتے ہیں کیوں کہ ہم (میاں بیوی) دونوں ہی کام کرتے ہیں۔ اس لیے بچہ اپنے والد کی اسکول میں آمد کو آیا کے پاس چھوڑے جانے سے تعبیر کرتا ہے۔ بچہ دن

قشقی

# شربت فولاد



جسم میں لائے  
آئرن کی طاقت

ہمے ہوں بارے، آج کی مصروف زندگی آپ کو تھکا رہی ہے جس کی وجہ سے آئرن کی کمی ہے۔  
آئرن کی طاقت فولاد آئرن کی کمی کو دور کرے گا۔ آئرن سے جسم میں آئرن کی کمی کا دور دورہ  
ہو گا۔

اب بھٹک گیا؟